سرورق پہلے والا ہے، بیک ٹائٹل پر دیا گیا میٹر ۲۰۱۴ء کا ہے

حیدر قریشی کی اب تک کی کتابیں

(یہ کتابیں مختلف شعری، نثری اور نثری و شعری مشترکہ کلیات کے کتابی اور انٹرنیٹ ایڈیشنز میں شائع ہو چکی ہیں)

تخلیقی ادب

سلگتے خواب (غزلیں) — عمرِ گریزاں (غزلیں، نظمیں اور ماہیے)

محبت کے پھول (ماہیے) — دعائے دل (غزلیں، نظمیں)

درد سمندر (غزلیں، نظمیں، ماہیے) — زندگی (غزلیں، نظمیں، ماہیے)

روشنی کی بشارت (افسانے) — قصے کہانیاں (افسانے)

میری محبتیں (خاکے) — کھٹی میٹھی یادیں

فاصلے قربتیں (انشائیے) — سوئے حجاز (عمرہ و حج کا سفرنامہ)

....

تنقید و تبصرے

حاصلِ مطالعہ — تاثرات — مضامین اور تبصرے

ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ما بعد جدیدیت

ستیہ پال آنند کی "......بودنی نابودنی"

....

اردو ماہیا تحقیق و تنقید

اردو میں ماہیا نگاری......اردو ماہیے کی تحریک......

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما

اردو ماہیا...........اردو ماہیے کے مباحث

....

حالاتِ حاضرہ (انٹرنیٹ کالموں کے مجموعے)

منظر اور پس منظر — خبر نامہ

ادھر اُدھر سے — چھوٹی سی دنیا (صرف ای بک)

سروَر ادبی اکادمی جرمنی کے زیرِ اہتمام
بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ

جدید ادب

www.jadeedadab.com
شمارہ:2 (جنوری تا جون2004ء)

ایڈیٹر
حیدر قریشی

رابطہ کرنے کے لئے اور **تخلیقات** بھیجنے کے لئے ایڈریسز:

Haider Qureshi *Rossertstr.6 Okriftal*
*65795-Hattersheim, (***GERMANY***)*

Prof. Nazar Khaleeq *Commercial Area, Near Masjid Alrehman,*
Satelite Town Khanpur,
*Distt. Rahim yar khan (***PAKISTAN***)*

Umar Keranvi *L-21/B, AbulFazal Enclave, Okhla,*
*Delhi-25 (***INDIA***)*

جن احباب کے پاس ای میل کی سہولت ہے وہ ان پیج فائل میں اپنا میٹر ان ای میل ایڈریسز پر بھجوائیں۔شکریہ!
hqg7860000@aol.com اور **khaleeqkhanpur@yahoo.com**

فہرست

افسانے

نظمیں

خصوصی مطالعہ

ماہیے

کتاب گھر

تفصیلی مطالعہ

گفتگو! جدید ادب کا بنیادی مزاج تو اس کے مستقل اور سینیئر لکھنے والوں سے ہی متعین ہوتا ہے تاہم نئے لکھنے والوں کو بھی اس میں ایک حد تک جگہ دی جاتی رہے گی، بس اتنا ہے کہ وہ بھلے قدرے کمزور لکھنے والے ہوں لیکن جو کچھ ہمیں بھیجیں وہ ان کی اپنی اوریجنل تخلیق ہو۔

اس بار ادب میں ادبی شعور کی کمی کے مسئلہ پر کچھ لکھنا چاہتا تھا۔اس کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ جب مابعد جدیدیت نے فن پارے کی تفہیم کا سارا کام قاری کو ہی تفویض کر کے رکھ دیا ہے تو یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ اردو ادب کا جو قاری ہے اس کا ادبی شعور اور ذہنی استعداد کس حد تک قابلِ اعتماد ہے۔ میں نے جو لکھنا چاہا تھا ،وہ مجھے اپنے چار سال پرانے ایک مضمون میں مل گیا ہے۔لہٰذا ان باتوں کو نئے سرے سے دہرانے کی بجائے اس مضمون کا اقتباس پیش کر رہا ہوں: ’’ادب کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہونے کی بجائے کمی آ رہی ہے۔ مادہ پرستی کے غلبہ سے لے کر ٹی وی چینلز تک اس کے بہت سے اسباب ہیں۔لیکن ایک بڑا سبب خود ادیبوں کی ادب سے بے توجہی ہے جو ادبی شعور کی کمی یا ادبی شعور نہ ہونے کے باعث ہے۔اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ عموماً شاعروں کو شاعری کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف سے مطالعہ کی حد تک بھی کوئی رغبت نہیں رہی اور ایسی ہی صورتحال دوسری اصناف کے لکھنے والوں کے ہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ مستثنیات کو چھوڑ کر ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی ادب سے وابستگی کی یہی نوعیت ہے۔اور تو اور شاعری میں بھی یہ حال ہے کہ اپنی ناک سے آگے کسی کو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ یہ سارے رویّے خود ادیبوں کی ادب سے بے رغبتی کو ظاہر کرتے ہیں۔ایسی صورتحال میں قاری کی کمی کا رونا بے معنی ہو جاتا ہے۔سو میرے خیال میں عوام میں یا اردو کے قارئین میں ادب کا ذوق پیدا کرنے سے پہلے خود ادیبوں اور شاعروں میں ادب کا ذوق پیدا ہونا ضروری ہے۔اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر ادب کے سنجیدہ قاری بنیں۔ان کے اندر Sense of Literature پیدا ہو اور اس کی جھلک دکھائی بھی دے۔مغربی ممالک میں مقیم اردو کے شاعروں اور ادیبوں میں اس کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے۔ میں یہ بات کسی پر طنز کے طور پر نہیں کہہ رہا بلکہ حقیقتاً یہ ہمارے ادب کا سنگین مسئلہ ہوتا جا رہا ہے۔اس کے نتیجہ میں جعلی شاعروں اور ادیبوں کی ایک کھیپ تیار ہو چکی ہے۔یوں اصل اور نقل میں فرق کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ مارکیٹنگ سسٹم کی طرح ادب میں بھی نمبر دو مال کو اوریجنل ادب کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔اس کے لئے سنجیدگی سے اور بہادری کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ایسے معاملات میں ذاتی دوستیوں اور تعلقات کے مقابلہ میں ادب کو اوّلیت اور اہمیت دینا بے حد ضروری ہے۔‘‘

(’’اکیسویں صدی۔۔۔اردو زبان و ادب کے چند مسائل‘‘ مطبوعہ **مجلہ** ملینیئم اردو کانفرنس ۲۰۰۰ء)

امید ہے ادب سے سنجیدہ تعلق رکھنے والے حضرات اس مسئلہ کے جملہ پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔

حیدر قریشی

رہے نام اللہ کا

صبا اکبر آبادی (مرحوم)

اے ربِ کائنات میں عصیاں شعار ہوں
ظاہر میں پُر سکوں ہوں مگر بیقرار ہوں
دولت سکونِ قلب کی سب ہو چکی تباہ
اُٹھتی ہے بس ترے ہی کرم کی طرف نگاہ
واپس چمن میں بھیج دے گزری بہار کو
دولت ملے سکوں کی دلِ بے قرار کو

معلوم ہے مجھے کہ یہ دنیا ہے بے ثبات
اک وقفہء قلیل ہے کہئے جسے حیات
پوری ہوں جتنی اُتنی ابھرتی ہیں خواہشات
بس ایک تیرا نام ہے سرمایہء نجات
تسکیں کی آرزو ہو کہ آرام چاہئے
ہر حال میں زباں پہ ترا نام چاہئے

پیدا ہوئے تو جانِ سماعت ہے تیرا نام
آیا جو ہوش وردِ تلاوت ہے تیرا نام
جب آ گیا شباب تو قوت ہے تیرا نام
ہنگامِ مرگ، زیست کی لذت ہے تیرا نام
کیفیتیں عجیب اِسی نام سے ملیں
جو نعمتیں ملیں وہ ترے نام سے ملیں

غیر مطبوعہ

نعتیہ رباعیات

صبا اکبرآبادی (مرحوم)

اللہ کا عرفان نہیں ہوسکتا   حاصل کوئی فیضان نہیں ہوسکتا
دل میں نہ محبت ہو محمدؐ کی اگر   انساں کبھی انسان نہیں ہوسکتا

اللہ کا پیغام سنانے والے   دنیا کو راہِ راست بتانے والے
احساں ہے ترا عالمِ انسانی پر   انسان کو پستی سے اٹھانے والے

ایک ایک نفس تھا حمدِ بے حد ہوکر   مصروفِ ثنائے ربِ امجد ہوکر
کثرت سے ہوا حمد کی حاصل یہ مقام   محمودِ خدا ہوئے محمدؐ ہوکر

اے رحمتِ باری کے خزانے والے   اسلام پہ ہنستے ہیں زمانے والے
ہے آج مسلماں کا مسلماں دشمن   اے دشمنوں کو دوست بنانے والے

آساں نہیں ہے ذکرِ احمدؐ لکھنا   انعامِ خدا ہے حمدِ بے حد لکھنا
میں اپنا قلم ہاتھ سے رکھوں نہ کبھی   آجائے اگر صرف محمدؐ لکھنا

غیر مطبوعہ

نعتیہ رباعیات

صفدر ہمدانی (لندن)

دل کو محبتوں کا مدینہ بنا لیا   اب یہ ہی زندگی کا قرینہ بنالیا
دل میں بسا کے اسمِ محمدؐ کے نور کو   بے نور آنکھ تھی جسے بینا بنا لیا

☆

پئے تسلیم ملک شام و سحر آتے ہیں   مانگنے بھیک یہاں شمس و قمر آتے ہیں
لکھنے جب بیٹھتا ہوں نعت تو یوں لگتا ہے   جیسے جبریل مرے دل میں اُتر آتے ہیں

☆

شبِ معراج فرشتوں کا عقیدہ سنتے   نور کے لہجے میں اوصافِ حمیدہ سنتے
اے خوشا ہوتے جو نعلین سے مَس ذرہ اگر   ہم بھی جبریل سے آقا کا قصیدہ سنتے

☆

شافعِ محشرؐ کہیں یا ہادئ اعظمؐ کہیں   عرش کا نیر کہیں یا عظمتِ آدمؑ کہیں
جب نہیں ہے کوئی بھی اُس شان کے شایاں لقب   پھر خُدا کی طرح اُنکو رحمتِ عالمؐ کہیں

☆

تھی جبیں تر وہ ندامت کا پسینہ نکلا   ہم جسے موت سمجھتے تھے وہ جینا نکلا
در پہ آقاؐ کے جو پہنچے تو یہ محسوس ہوا   دیکھو جنت سے حسیں شہرِ مدینہ نکلا

☆

حق نے قرآن میں الفت میں محمدؐ لکھا   میں نے ہر جلوت و خلوت میں محمدؐ لکھا
خالقِ لوح و قلم کو بھی اسی نام سے پیار   خود خُدا نے بھی محبت میں محمدؐ لکھا

ڈاکٹر جمیل جالبی (کراچی)

اچھا ادب کیا ہے؟

میں اس تفصیل میں تو اس وقت جانا نہیں چاہتا کہ ''اچھا ادب کیا ہے؟'' لیکن اچھے ادب کے بارے میں ایک بات میں ضرور جانتا ہوں کہ اسے پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے۔ اور وہ اسے ایسے لفظوں میں حسن ترتیب، فنی شعور، تخلیقی سلیقے اور طرز ادا کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ وہ تحریر اپنے پڑھنے والوں سے کلام کرنے لگتی ہے۔ کلام کرتے ہوئے اس کا لہجہ اور انداز ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ یہ بات اس طور پر اور اس انداز سے اس سے پہلے نہیں کہی گئی۔ یہ بات بھی کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ لکھنے والا شعور کی اس منزل تک جہاں خداداد تخلیقی و فکری صلاحیتوں سے پہنچتا ہے وہاں وسیع مطالعہ اور فنی ریاض اس کے وہ آلے ہیں جن کی مدد سے وہ اپنی تحریر کو ایسی صورت دینے میں کامیاب ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کے لیے یہ بات اہمیت نہیں رکھتی کہ لکھنے والے نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک ہی مسودہ تیار کیا تھا یا اسے بار بار لکھا تھا۔ ٹالسٹائی نے اپنا ناول ''وار اینڈ پیس'' کئی بار لکھا اور اس عمل سے گزار کر اسے وہ صورت دی جس صورت میں وہ آج ساری دنیا میں مشہور ہے۔ کاری گر اور تخلیقی فن کار میں یہی فرق ہے کہ کاری گر ایک سی چیزیں یکساں مہارت کے ساتھ بناتا رہتا ہے لیکن فنکار ہر بار نئی چیز بناتا ہے اور اسے اس طور پر بناتا ہے کہ وہ پہلی تخلیق سے مختلف اور پہلے سے زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ اسی لیے ''یکسانیت اور تکرار'' ادب پارے کا وہ عیب ہے جو اسے اچھے ادب کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے۔

اس زاویے سے اپنے معاصر ادب کو دیکھیے تو اس کا بڑا حصہ اس بنیادی خوبی سے عاری نظر آتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا جلدی میں ہے اور اسے لکھنے سے زیادہ کچھ اور ضروری کام ہیں۔ پڑھنے والا ادب اور ادیب سے یقیناً یہ چاہتا ہے کہ وہ اسے دھڑکتی، پھیلتی اور بدلتی زندگی کے وہ پہلو دکھائے جس سے اس کی بصیرت میں اضافہ اور اس میں وہ شعور پیدا ہو جو اس کے لیے مثالی زندگی کا خواب بن جائے۔ اسی

شعور سے فرد میں عمل کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس سطح پر ادب نہ صرف اپنے پڑھنے والے کے ذہن کو متاثر کر کے اسے بدلتا ہے بلکہ خواب دکھا کر عمل کی طرف بھی راغب کرتا ہے۔ یہ وہ ادب ہے جس کا تعلق براہ راست زندگی سے ہوتا ہے۔ وہ زندگی جو لکھنے والے کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے ۔ وہ زندگی جو ماضی میں بھی تھی اور وہ زندگی جو آج بھی ہے اور جو لکھنے والے کا بنیادی حوالہ ہے۔ وہ زندگی جس کے خواب اس نے اپنی تحریروں میں دیکھے اور اپنے پڑھنے والوں کو دکھائے اور جو مستقبل کی زندگی ہے۔ اچھا ادب یہی کام کرتا ہے اور ہمیشہ سے یہی کرتا آیا ہے۔ ہمارے معاصر ادب کی بیشتر تحریریں چونکہ اس بنیادی خصوصیت سے عاری ہیں اس لیے ایک طرف ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے دوسری طرف قاری سے اس کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے اور تیسرے ادب ایک بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے۔ جب تک ہمارا لکھنے والا ان رشتوں کو دوبارہ بحال نہیں کرے گا، ہمارا ادب اسی طرح بے اثر پامال اور غیر اہم رہے گا۔ سائمن دی بووار نے ژاں پال سارتر سے پوچھا کہ عملاً اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ (سارتر) فلسفہ لکھ رہا ہے یا ادب تحریر کر رہا ہے؟ سارتر نے جواب دیا کہ جب وہ ''فلسفہ'' لکھتا ہے تو اس کے کئی مسودے تیار نہیں کرتا لیکن جب وہ ''ادب'' لکھتا ہے تو عام طور پر سات آٹھ مسودے تیار کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ دراصل بات یہ ہے کہ فلسفہ ان الفاظ کا نام ہے جن کی مدد سے وہ کسی سے مخاطب ہوتا ہے۔ یہ ناول کی طرح نہیں ہے کہ جس میں آپ یقیناً کسی سے مخاطب ضرور ہوتے ہیں لیکن دوسرے انداز سے مخاطب ہوتے ہیں۔ فلسفے میں وہ اپنی بات کو دوسروں کے سامنے واضح کرتا ہے۔ یہ وضاحت وہ لکھ کر تو ضرور کرتا ہے لیکن یہ وضاحت وہ زبانی بھی کر سکتا ہے۔ فلسفے میں وہ اپنے ان خیالات کی وضاحت کرتا ہے جو ''آج'' اس کے ذہن میں موجود ہیں۔ فلسفہ کو وہ ٹیپ پر ریکارڈ کرا سکتا ہے لیکن ادب کو وہ ٹیپ پر ریکارڈ نہیں کرا سکتا۔ سارتر نے یہ بھی بتایا کہ فلسفہ لکھتے وقت وہ کوری درین (Corydrane) کھا کر اس کے اثر میں رہتا تھا لیکن ادب اس نے کبھی کوری درین کھانے سے نہیں لکھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کوری درین کھانے سے ایک خاص قسم کی ذہنی و اعصابی سہولت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ سہولت ادبی تحریر کے ساتھ نہیں چل سکتی۔

میں یہاں ادب و فلسفہ کی بحث میں پڑے بغیر، سارتر کے حوالے سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ادب ایک ایسے سلیقے اور ایک ایسے شعور کا طالب ہے، جس سے لکھنے والا اپنے پورے وجود اور توجہ کے ساتھ ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ لکھنے والے نے جو کچھ کہا ہے یا جو زاویہ نظر اس نے پیش کیا ہے اگر وقت کے ساتھ وہ از کار رفتہ ہو جائے تو بھی وہ تحریر دلچسپی سے پڑھی جا سکے یا پھر اس میں اتنی تہیں ہوں کہ آنے والے زمانے میں معنی و مفہوم کی اس سے نئی روشنی پھوٹ سکے۔ میر امن نے ''باغ و بہار'' لکھی تو اس کا سماجی پس منظر اس کا اپنا دور تھا لیکن اسے آج بھی پڑھیے تو وہ لطف دیتی ہے۔ پچھلے دنوں جب اسے ٹیلی وژن پر پڑھ کر سنایا گیا تو اس نے آج

بھی سننے والوں کو شدت سے متاثر کیا۔ اس لیے ''باغ و بہار'' آج بھی ادب ہے۔

برخلاف اس کے آج کی تخلیقی تحریریں پڑھیے تو ان میں سے اکثر و بیشتر میں جلدی جلدی کاتنے اور لے دوڑنے کا عمل نظر آئے گا۔ ان تحریروں میں پھوہڑ پن کا احساس ہوگا۔ یوں محسوس ہوگا کہ لکھنے والا نہ صرف زبان و بیان اور الفاظ کے رموز سے ناواقف ہے بلکہ وہ اپنے قدیم اور جدید ادب سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہے۔ وہ تخلیقی سطح پر زبان سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہے اور انگریزی مرکبات اور جملوں کے بھونڈے ترجموں سے عبارت کو خراب کر رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ پوری طرح اس کی گرفت میں نہیں ہیں اور لسانی تشکیلات کے حوالے سے وہ جو کچھ کر رہا ہے اس عمل میں وہ اس زبان سے تخلیقی سطح پر ناواقف ہے، جس میں وہ لکھ رہا ہے۔ معاصر ادب کی تحریریں پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغرب کے رجحانات اور اس کے ادب کی پیروی کر کے وہاں کے ادبی فیشن کو پاکستان میں درآمد کر رہا ہے۔ وہ اپنے معاشرے اور اس کے مسائل و رجحانات سے کٹا ہوا ہے اور صرف بدیسی اثرات اور فیشن کی سوداگری کر رہا ہے۔

اب ایک سوال یہاں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا کوئی ادیب اس معاشرے سے کٹ کر جس کے لیے وہ لکھ رہا ہے، تخلیقی سطح پر وہ کام کر سکتا ہے جو اسے کرنا چاہیے؟ کیا اس صورت میں وہ اپنے معاشرے کی جدید حسیت کو اس کے اصل رنگ روپ میں پیش کر سکتا ہے؟ علامتی کہانی کے ساتھ بھی اس وقت یہی صورت ہے۔ لاطینی امریکہ کے فکشن کا اثر ہمارے ادب پر ترجموں کے ذریعے پڑ رہا ہے۔ یقیناً یہ کوئی بری بات نہیں ہے لیکن صرف بیرونی فیشن کی پیروی سے آپ اچھا ادب تخلیق نہیں کر سکتے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس حسیت کا ہمارے اپنے معاشرے کی حسیت سے کیا تعلق ہے؟ لاطینی امریکہ میں آمر آج بھی موجود ہیں۔ وہاں روز حکومتیں بدلتی ہیں۔ ہر طرف انارکی ہے۔ فرانکو کے مرنے سے پہلے اسپین بھی مسلسل آمریت کا شکار رہا ہے۔ لاطینی امریکہ اور اسپین کے ادیبوں نے وہاں کے حالات و مسائل کو سامنے رکھ کر اچھا ادب تحریر کیا لیکن اس ادب میں لاطینی امریکہ کے مختلف معاشروں کی حسیت اور وہاں کے مسائل اس طور پر پیش ہوئے ہیں کہ وہاں کے ادیبوں کی تحریریں اپنے معاشرے سے پوری طرح پیوستہ ہیں۔ کیا ہمارے بیشتر ادیب اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟

ہمارے معاشرے کے بہت سے مسائل یقیناً تیسری دنیا کے مسائل جیسے ہیں لیکن ان مسائل اور ہماری سماجی حسیت کی نوعیت یقیناً ان سے مختلف ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں خواص کا محدود طبقہ، پیروں فقیروں، زمینداروں، وڈیروں کی صورت میں جونک کی طرح، عوام اور سارے معاشرے کا مسلسل خون چوس رہا ہے۔ یہ طبقہ ہمارے سارے قانون ساز اور پالیسی ساز اداروں پر قابض ہے اور اپنے مفادات کا تحفظ کر رہا ہے۔ سارا اقتدار اور کم و بیش سارے وسائل اس کے قبضے میں ہیں۔ زندگی لہولہان ہے۔ مسائل و مصائب کا ایک سیلاب

ہے جو مثبت قدروں کو بہائے لیے جا رہا ہے۔ انسانیت گلی کوچوں اور اسپتالوں میں دم توڑ رہی ہے، معالج مریض کا، خواص عوام کا، صنعت کار و تاجر مزدور و صارف کا، استاد شاگرد کا، افسر ماتحت کا، زمیندار کسان کا خون چوس رہا ہے۔ اخبارات میں شائع ہونے والی خبریں آندھی کی طرح ہر چیز کو اڑائے لیے جا رہی ہیں۔ نفرتوں کے عفریت منہ پھاڑے ہر اچھی قدر کو ہڑپ کر رہے ہیں۔ ہر قسم کا انصاف عنقا ہو گیا ہے۔ استحصال ہمارا اجتماعی رویہ بن گیا ہے۔ ناانصافیاں ہمارے معاشرے میں ہر سطح پر پھیل کر ہمارا مزاج بن گئی ہیں۔

غیر معمولی باتیں معمول بن کر سارے معاشرے کی فضا میں خون کی پچکاریاں چھوڑ رہی ہیں۔ بڑوں کی حماقتیں ملک کے استحکام کو داؤ پر لگا رہی ہیں۔ ہمارے فکشن نگار ان مسائل سے آنکھیں بند کیے علامتی کہانیوں کی دیگ چڑھانے اور مغرب سے نئے نئے ادبی فیشن درآمد کر کے اپنی قابلیت و علمیت کی دھاک بٹھانے میں مصروف ہیں۔

میں اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا یہ دور بڑے فکشن کے لیے یقیناً ایک بڑا دور ہے بشرطیکہ آپ اپنے دور کی حسیت کے ساتھ سانس لیں اور تیزی سے بدلتے ہوئے اپنے معاشرے کے مسائل اور آنے والی تبدیلیوں کو پورے شعور و بصیرت کے ساتھ اپنی تحریروں میں پیش کریں۔ یہ ایک ایسا دور ہے جو کوئی استاں دال کو وجود بخش سکتا ہے۔ وہ استاں دال جس کے ایک ناول کا ترجمہ آج سے پچاس سال پہلے محمد حسن عسکری مرحوم نے ''سرخ و سیاہ'' کے نام سے کیا تھا اور وہ استاں دال جو نہ صرف ژاں پال سارتر کا محبوب مصنف تھا بلکہ خود سارتر بھی اس جیسا بننا چاہتا تھا۔ ہمارے لکھنے والوں کے لیے اس بات کا ادراک ضروری ہے کہ اگر وہ مغرب یا لاطینی امریکہ سے مشینوں، کاروں اور کھانے پینے کے ڈبوں کی طرح خیالات، رجحانات اور ادبی فیشن اسی طرح درآمد کرتے رہے تو اس کا نتیجہ وہی نکلے گا جو اب تک نکلتا آیا ہے یعنی ڈھاک کے تین پات۔ ہم مغرب سے تکنیک ضرور سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن مسائل، حسیت، احساس و شعور ہمارے اپنے ہونے چاہئیں۔ اسی صورت میں ہمارے ادب کا رشتہ قاری سے دوبارہ قائم ہو سکے گا اور ہمارا لکھنے والا اپنے معاشرے کے لیے اجنبی نہیں رہے گا۔ حال ہی میں میں نے مینڈوزا کا ایک جملہ کہیں پڑھا تھا جو اس نے جنرل فرانکو کے بعد کے اسپینی ادب کے بارے میں کہا تھا کہ سماجی تبدیلیوں کے حوالے سے ملک ایک بحران میں مبتلا ہے اور یہ وقت ایک مصنف کے لیے بہترین تخلیقی لمحہ ہے۔ آج کا چیلنج یہ ہے کہ ہمارا ادب اس صورت حال سے کس طرح نبرد آزما ہوتا ہے؟ یہی چیلنج آج ہمارے لکھنے والوں کے سامنے ہے۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

انتظار حسین (لاہور)

شامِ انتظار حسین میں
انتظار صاحب کا خطاب

(اکتوبر 2000ء میں رائٹرز فورم کینیڈا نے ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔تب انتظار حسین نے اس تقریب میں جو خطبہ د یا تھا وہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ممکن ہے یہ خطاب کہیں اور بھی چھپ چکا ہو۔تاہم فورم کے سیکریٹری کو حال ہی میں اپنے ریکارڈ میں سے یہ خطاب ملا ہے جو انہوں نے اپنے فورم کے ممبرز کو جاری کیا ہے۔بہت سے قارئین کے لئے یہ خطاب نیا ہوگا۔اس لئے یاہو رائٹرز فورم کے شکریہ کے ساتھ یہ خطاب یہاں دیا جا رہا ہے.....حیدر قریشی۔)

سب سے پہلے تو مجھے رائٹرز فورم کے منتظمین کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے مجھ ایسے گرے پڑے لکھنے والے کو یاد کیا اور اس دیارِ غیر میں بلا کر مجھے عزت بخشی کہ میں آپ سے ہم کلام ہوں۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ یعنی مجھے خوب پتہ ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔

آپ سے کیا چھپاؤں، سچی بات یہ ہے کہ میں بس ایک کہانیاں لکھنے والا ہوں۔ اس سے زیادہ اور اس کے سوا کچھ نہیں ہوں۔ یوں سمجھیے کہ میرے حساب میں نہ تو قوم و ملک یا عوام کی کا خدمت کا کوئی کارنامہ ہے نہ اسلامی جذبے کا کوئی قابلِ ذکر مظاہرہ مجھ سے منسوب ہے، نہ مجھے اردو زبان و ادب کی خدمت کا دعویٰ ہے۔ میرے نامۂ اعمال میں بس یکمشت اچھی بری کہانیاں ہیں۔ یہی کہانیاں مجھے بخشوائیں تو بخشوائیں، باقی تو میرے پاس بخشش کا کوئی سامان نہیں ہے۔

مگر میں آپ کے سامنے یہ وضاحت کیوں کر رہا ہوں۔ اگر میں میر و غالب کے زمانے میں پیدا ہوا ہوتا تو مجھے اس معذرت کی ضرورت مطلق پیش نہ آتی۔ میر اور غالب صرف اور محض شاعر تھے۔ اپنی اسی حیثیت پر انہیں غرّہ تھا۔ ان کے پڑھنے اور سننے والوں کا بھی ان سے بس شاعری ہی کی حد تک تقاضا تھا۔مگر ہمارے زمانے کے آتے

آتے لکھنے والے سے یار و اغیار کے تقاضے بہت بڑھ گئے ہیں۔ صرف اور محض شعر یا افسانہ لکھنے کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔ ان کے تقاضوں کے پیشِ نظر لکھنے والوں کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنے ادب کے ذریعہ کون کونسی قومی، سماجی، اور عوامی خدمات انجام دی ہیں۔

بلکہ ابھی پچھلے دنوں یہ ہوا کہ میرے ایک ہمعصر افسانہ نگار نے جو کل تک ایک انقلابی کی حیثیت سے جانا جاتا تھا اور مجھے رجعت پسندی کے طعنے دیا کرتا تھا اچانک نظامِ محمدی کا نعرہ بلند کیا اور پاکستان کی فلاح کا یہ نسخہ تجویز کرتے کرتے ایک مذہبی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ اور یہ واقعہ ایسے وقت میں ہوا جب مجھے اس کی مارکسیت، طالبان کے اسلام کے مقابلہ میں غنیمت نظر آتی تھی۔ اب میں سخت سٹ پٹایا ہوا ہوں کہ ؎ 'میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا'۔

مگر ایک بات سے انکار ممکن نہیں ہے۔ وہ یہ کہ اس زمانے میں ادیبوں کی قدر بہت ہوئی ہے۔ ادیبوں کے ساتھ شامیں منائی جاتی ہیں۔ ان کے اعزاز میں تقریبات ہوتی ہیں، جشن منانے کے اہتمام ہوتے ہیں، سات سمندر پار سے بلاوے آتے ہیں۔ تمغے اور انعامات ملتے ہیں۔ اخباروں میں ان کے بیانات اور تصویریں شایع ہوتی ہیں۔ ٹی وی پر انٹرویو ہوتے ہیں۔ اور ماس میڈیا نے تو پاکستان میں فروغ پانے کے ساتھ ساتھ ادیبوں کو اتنی اہمیت دی ہے کہ وہ شو بزنس کا حصہ بن چکے ہیں۔ اوروں کی نہیں، آپ بیتی سناتا ہوں۔ ایک بہت اسمارٹ سرو قد لڑکی مجھ سے آ کر ملی۔ کراچی کے ایک فیشن میگزین کا حوالہ دیا اور کہا کہ میں اس کے لیے آپ کا انٹرویو لینے آئی ہوں۔ میں نے اسے سر سے پیر تک دیکھا، اس کے لب و لہجہ پر غور کیا اور پھر ایک شک کے ساتھ پوچھا، 'آپ نے اردو میں کن کن لکھنے والوں کو زیادہ شوق سے پڑھا ہے'۔ بے تکلف بولی 'میں تو اردو لٹریچر سے زیادہ واقف نہیں ہوں'۔ 'تو پھر آپ نے میری کہانیاں بھی نہیں پڑھیں ہوں گی۔ پھر آپ میرا انٹرویو کیسے کریں گی'۔

کہنے لگی، 'میں تو کراچی سے آ رہی ہوں۔ میری باس نے مجھے انسٹرکٹ کیا ہے کہ انتظار حسین کا انٹرویو لے کر آؤ۔ تو آپ ہی مجھے گائڈ کریں'۔ کوئی نوجوان ہوتا تو میرا رویہ شاید مختلف ہوتا۔ بس اسے میری کمزوری سمجھیے کہ میں نے اسے سچ مچ گائڈ کیا۔ بس یوں سمجھو کہ اس نے انٹرویو کم لیا، میں نے انٹرویو زیادہ دیا۔

وہ میگزین بہت اہتمام سے مجھے بھیجا گیا۔ چکنے کاغذ پر چھپا تھا۔ مختلف زاویوں سے میری رنگین تصویریں انٹرویو کی زینت تھیں۔ میں نے وہ انٹرویو پڑھنا شروع کیا جہاں میں نے کرشن چندر کا حوالہ دیا تھا وہاں کرشن لال لکھا ہوا تھا۔ پھر اس سے آگے مجھے پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ابھی پچھلے دنوں ایک اخبار کی طرف سے میرا انٹرویو لیا جا رہا تھا۔ فوٹو گرافر کھٹا کھٹ میری تصویریں بنا تا رہا۔ میں نے انٹرویو لینے والے دوست سے کہا، 'آپ کو ایک تصویر شایع کرنی ہے۔ اتنی تصویریں کیوں بنا رہے ہیں'۔ بولا 'نہیں جی، یہ سب تصویریں شایع ہونی ہیں'۔ میں نے حیرت سے کہا 'اچھا میری اتنی تصویریں شایع ہوں گی۔ مگر میرا

افسانہ؟‘اس پر وہ چپ ہوگیا۔اسے چپ ہونا ہی چاہیے تھا۔

ادیب کی شخصیت تو ماس میڈیا کے کام آسکتی ہے۔ادب ماس میڈیا کے کام کی چیز نہیں ہے۔اور کم بخت افسانہ تو ایسی صنف ہے کہ اس کا ماس میڈیا کے ساتھ سمجھوتا ہو ہی نہیں سکتا۔ویسے شاعری کا بھی کسی حد تک سمجھوتا ہوسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ مشاعرے والی غزل یا مہدی حسن اور اقبال بانو کی گائی ہوئی فیض کی نظموں کی حد تک سمجھوتا ہوسکتا ہے۔راشد اور میرا جی والی شاعری کی ماس میڈیا میں کہاں کھپت ہوسکتی ہے۔

ادب اپنی قدر دانی کے لیے جس رویہ کا تقاضا کرتا ہے اس سے تو پورا پاکستانی معاشرہ محروم ہے۔باقی ماس میڈیا کی تو اپنی ہی مجبوریاں ہیں۔ پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ادیب تو شو بزنس کا حصہ بن سکتا ہے،ادب نہیں بن سکتا۔ بس یہی کچھ دیکھ کر مجھے گمان ہونے لگا ہے کہ ہمارا زمانہ ادیب کو پروجیکٹ کر رہا ہے،اور ادب کو پیچھے دھکیل رہا ہے۔بس یہ سمجھ لو کہ ہمارے زمانے میں ادیبوں کی قدر تو بہت ہو رہی ہے،مگر ادب کی قدر جاتی رہی۔

میں نے لکھنے والے کی حیثیت سے ایسے زمانے میں ہوش سنبھالا جب ادیب کی قدر دانی واجبی واجبی تھی۔اخبار نکلتے تھے،مگر ان میں نہ ادیبوں کے انٹرویو شایع ہوتے تھے،نہ ان کی تصویریں۔بس وقتاً فوقتاً کسی شعر کسی افسانے کے مجموعہ پر تبصرہ شایع ہو جاتا تھا۔یا ہفتہ وار ایڈیشن میں کوئی غزل کوئی نظم شایع ہو جاتی تھی۔یہ ایسا زمانہ تھا جب پرائڈ آف پرفارمنس نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔یہ کہ ادیب کو کوئی ایوارڈ یا تمغہ ملنا چاہیے،اس حسرت سے ادیب ابھی ناآشنا تھے۔کتابوں کی افتتاحی تقریبیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔جب منٹو صاحب کا مجموعہ ’سیاہ حاشیے‘،شایع ہوا تو اس نے بہت ہنگامہ پیدا کیا۔اس کے خلاف اور حق میں بہت کچھ کہا گیا۔مگر اس کی کوئی افتتاحی تقریب نہیں ہوئی۔اور چونکہ کتابوں کی افتتاحی تقریبیں نہیں ہوتی تھیں اس لیے کسی وزیر کسی امیر کو مہمان خصوصی بن کر ادیبوں کے درمیان آنے کا موقع میسّر نہیں آتا تھا۔نہ یہ بتانے کا موقع ملتا تھا کہ ادیبوں کو کیسا ادب پیدا کرنا چاہیے۔اس موضوع پر ادیب آپس ہی میں بحثیں اور سر پھٹول کرتے رہتے تھے۔ترقی پسند تحریک ایک طرف، جدیدیت والے دوسری طرف۔ پھر ایک مورچہ روایت پسندوں کا۔ان کے بیچ کیسی کیسی بحثیں گرم ہوئیں۔ پاکستان بننے کے بعد عسکری صاحب نے پاکستانی ادب کا سوال کھڑا کر دیا۔ لیجیے ایک نئی نظریاتی بحث شروع ہو گئی۔

یہ بحثیں ٹھنڈی ہوئیں تو ادیبوں کو ایک نئے مسئلہ نے آلیا۔پاکستان کی تاریخ کہاں سے شروع ہوتی ہے،موہنجو ڈارو اور ہڑپّا سے یا محمد بن قاسم کی آمد سے۔اس بحث کا زور ٹوٹا تو علامتی اور تجریدی افسانے پر بحثیں شروع ہو گئیں۔ابھی اس بحث سے ہم فارغ نہ ہوئے تھے کہ یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ نثری نظم شاعری بھی ہے یا نہیں۔ لیجیے ایک نئی لڑائی شروع ہوگئی۔

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو۔ادبی تنازعوں کی اس ساری تاریخ کو اب میں ایک نوسٹلجیائی احساس کے

ساتھ یاد کرتا ہوں۔ان کو بھی یاد کرتا ہوں جو مجھے رجعت پسند ٹھہرا کر مجھ پر یلغار کرتے تھے۔اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سے لڑوں۔جن سے لڑائی ٹھنی رہتی تھی ان میں سے کچھ اللہ کو پیارے ہوگئے، کچھ مارکسیت سے تائب ہوکر مشرف بہ اسلام ہوگئے اور محبّ وطن بن گئے۔

ادب میں لڑائیاں تو بہر حال ہوتی رہنی چاہئیں۔امن وآشتی ہر معاشرے کی ضرورت ہوتی ہے،اور پاکستانی معاشرہ کا تو اس وقت بحران ہی یہ ہے کہ اس سے یہ نعمت چھن گئی ہے۔مگر ادب کے لیے امن وآشتی کوئی نیک فال نہیں ہے۔ادب تو بحثوں اور تنازعوں کے بیچ ہی پنپتا اور پروان چڑھتا ہے۔مگر اب تو یہ لگتا ہے کہ جیسے ادیبوں نے سارے نظریاتی جھگڑوں اور ادبی تنازعات کو کوئی جامع حل تلاش کر لیا ہے۔اگر کوئی وجہ نزاع باقی رہ گئی ہے تو یہ کہ کس ادیب کو انعام ملنا چاہیے تھا اور کس کو نہیں ملنا چاہیے تھا۔آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت پاکستان میں سو سے زیادہ سیاسی پارٹیاں ہیں۔مگر کوئی سیاسی پارٹی اب کسی نظریہ یا منشور کے حوالے سے نہیں پہچانی جاتی۔اور مجھے اس خیال سے خوف آتا ہے کہ کہیں پاکستان میں دنیائے ادب کی بھی تو یہی شکل نہیں نکل آئے گی۔

لیجیے کیا بات یاد آئی۔میر کو رکتے رکتے جنوں ہوگیا۔اور پھر یہ صورت پیدا ہوئی کہ ؎

نظر آئی شکل ایک مہتاب میں کمی آئی جس سے خور وخواب میں

اور ایک شاعر کو تو میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا کہ رات رات بھر لاہور کی گلیوں میں گھومتا پھرتا تھا۔چاند کی بہت باتیں کرتا تھا۔اسے بھی مہتاب میں کوئی شکل نظر آئی تھی۔یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔مگر ایسے شعر اس کے مہتابی اضطراب کی ضرور غمازی کرتے ہیں ؎

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر چاند کس شہر میں اترا ہوگا

پتہ نہیں یہ کس قسم کا اضطراب تھا۔شاید اس قسم کا جسے انگریزی شعریات میں Divine Discontent سے تعبیر کیا گیا ہے۔ہمارے یہاں میر سے میرا جی تک اور میرا جی سے ناصر کاظمی تک کی روایت میں جا بجا الوہی اضطراب ہی کی لہر نظر آتی ہے۔اب یہ لہر کہاں گم ہوگئی۔یہی تو ادب میں جوت جگاتی ہے۔ ورنہ آپ دفتر لکھ ڈالیے،شاعری میں قافیہ پیمائی کرتے رہیے،یا نئی شاعری کے نام پر قافیہ شکنی پر اتر آئیے،کیا فرق پڑتا ہے۔ساری مایا تو اسی الوہی اضطراب کی ہے ؎ گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں۔

شوق جو سود یا زیاں کے تھے سلسلے وہم اور گماں کے تھے
داستاں گو کی ذات سے ابھرے جتنے کردار داستاں کے تھے
(حیدر قریشی)

خلیق الرحمٰن

اکبر حمیدی کا فن

اکبر حمیدی کا شمار ایسے فنکاروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی فکریات کو کئی شیڈز اور سمتیں دی ہیں۔ وہ عصر حاضر کے ایک اہم باشعور شاعر، متحرک ذہن انشائیہ نگار اور صاحب اسلوب خاکہ نگار ہیں۔ ان کے فنی رموز کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے ابھی تک جو کاوشیں ہوئی ہیں، انھیں کتابی صورت میں یکجا کرنے کا سہرا رفیق سندیلوی کے سر ہے۔ یہ مضامین جو بعنوان 'اکبر حمیدی کا فن' کی صورت میں مرتب ہو کر سامنے آئے ہیں، اکبر حمیدی کی شخصیت اور فن کو پرکھنے کا ایک متین اور سنجیدہ موقع فراہم کرتے کہیں۔ (۳۹) مضامین پر مشتمل یہ کتاب اکبر حمیدی کی شاعری اور نثری اصناف کے حوالے سے ترتیب دی گئی ہے، جن میں ہمارے عہد کے معزز اور ممتاز ترین ناقد اور فنکار شامل ہیں۔ اہم نوعیت کے نکات اور ادبی و علمی بحثوں کے متعلقات پر بھی آراء سامنے آئی ہیں۔ ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے یہ کتاب ایک اہم تنقیدی اضافہ قرار دی جا سکتی ہے۔

اکبر حمیدی کی زندگی مسلسل محنت، ریاضت اور جستجو سے عبارت ہے، انھوں نے ایک متوسط درجے کے گھرانے میں آنکھ کھولی، لیکن زندگی کے سفر میں انھوں نے ہمیشہ اگلی منزلوں اور کامیابیوں پر نگاہ رکھی، قدم قدم چلتے رہے اور بالآخر اس مقام تک پہنچے، جہاں ان کی ہمتوں اور تخلیقی کاوشوں کی تشفی بھی ممکن ہوئی اور فنکارانہ انا کی تسکین بھی۔ زندگی کے مادی مسائل میں عام آدمی کی طرح جائز طریقوں اور راستوں کا انتخاب کیا اور اپنی طے شدہ منزلوں کے ہدف تک پہنچے۔ ہر چند زندگی کے ان راستوں میں محنت، لگن اور جستجو انھیں مزید کامرانیوں اور آسودگیوں سے ہمکنار بھی کر سکتی تھی، مگر وہ اپنے (نظریہ اکتفا) کے تحت خود ہی معاشی، تعلیمی اور سماجی زندگی کی حدوں میں رہے اور دوسروں کی نظر میں رہے جو ابھی کم تھا، اسے بہت جانا۔ انسانی خواہشات اور مادی وسائل میں کم اور زیادہ کی توجیہہ یوں بھی آج تک ممکن نہیں ہو سکی۔

اکبر حمیدی کی زندگی مسلسل تگ و دو سے عبارت ہے، انھوں نے اپنے خاندانی معاملات اور مشکلات کے حوالے سے درحقیقت اہم کامیابیاں حاصل کیں اور اپنے بے حد محدود وسائل میں رہتے ہوئے کامیابی سے زندگی کا سفر طے کیا، گاؤں سے گوجرانوالہ شہر اور گوجرانوالہ سے اسلام آباد تک کا سفر ان کی زندگی

میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گیا، جہاں انھوں نے نہ صرف اپنی کاوشوں سے اہل خانہ کی زندگیوں میں اہم اور مثبت تبدیلی پیدا کی، بلکہ اپنے لیے بھی پر وقار اور قابل احترام مقام پیدا کیا۔ ادبی اور فنی سطح پر انھوں نے خلوص، نیک نیتی، دل جمعی اور مستقل مزاجی کو اپنائے رکھا۔

اکبر حمیدی کے فنی سفر پر نگاہ ڈالیں تو ان کا فن ارتقائی منازل طے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ نظم سے نثر کی طرف آتے ہوئے انھوں نے اپنے بہت سے ہمعصروں کے مقابل زیادہ جرات اور بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے اور ہمہ جہت اصناف کو اپنا کر اپنی تخلیقی جہتوں اور وسعتوں کے جہاں تلاش کیے اور آباد کیے ہیں۔ بعض نے اپنے مزاج کی احتیاط پسندی یا پھر ناکامی کے امکان کے خوف سے خود کو محض ایک آدھ صنف سخن تک محدود رکھا لیکن اکبر حمیدی نے اردو اور پنجابی شاعری کے علاوہ انشائیہ نگاری، خاکہ نگاری، نظم، ہائیکو اور سوانح عمری تک ادبی اصناف میں خود کو پھیلایا ہے۔ اس بے باک رویے میں انھیں زیادہ کامیابی ہی حاصل ہوئی ہے۔ اور شاعری کی صنف میں اپنے عصر کے جدید غزل گو شعراء میں اکبر حمیدی کی آواز بھی سرخرو ہوئی ہے۔ انشائیے اور خاکہ نگاری میں انھوں نے ایک الگ اسلوب اور مزاج تشکیل دیا ہے۔ اور اپنے انداز کے طرز احساس کی پہچان بنائی ہے۔

اکبر حمیدی کا کہنا ہے کہ میں یک صنفی فنکار نہیں ہوں بلکہ اس معاملے میں میں غالب کا طرفدار ہوں۔ میں نے اپنے تخلیقی امکانات میں نئی جہات اور مقام تلاش کئے ہیں۔ یہ شعر شاید ان کے اسی احساس کا آئینہ دار ہے۔

نہ چلے گی ہواؤں کی سازش
چار جانب سے آ رہا ہوں میں

اکبر حمیدی کے تمام ناقدین نے انھیں ایک روشن خیال، انسان دوست اور وطن پرست فنکار قرار دیا ہے، ایک ایسا فنکار جو نامساعد اور ناموافق حالات میں بھی عزم و ہمت سے آگے بڑھنے اور مشکلات کے سامنے ڈٹ جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ان کے اس عزم اور سوچ کا اظہار ان کی سرگزشت (جست بھر زندگی) میں بار بار ہوا ہے۔ یعنی (ٹوٹنے میں جلدی نہ کریں) یہ انداز فکر ہمیں اکبر حمیدی کی شاعری سے لیکر ان کی ہر صنف سخن میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ جب ہماری زندگیوں میں کوئی افتاد نازل ہو جائے، یا ہم کسی سانحہ سے دوچار ہو جائیں، تو دکھ کے اس بارگراں میں ہمیں اپنی ذات کی اوٹ میں ہو جانا چاہئے، یہ اوٹ ہمیں حقیقتوں کو قبول کرنے اور ان کا سامنا کرنے کی ہمت دیتی ہے اور ہمیں زندگی کی بے رحمی اور سفاکی کے سپرد ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔

اکبر حمیدی کے چھ شعری مجموعوں کی شاعری نے انسانی زندگی اور اس سے وابستہ مسائل سے براہ

راست مکالمہ کیا ہے، انھوں نے اپنے عہد کے انسان کے باطن میں چھپی تنہائیوں، کجیوں اور اداسیوں کو بھی پیش کیا ہے اور خارج سے جڑی محرومیوں، ناانصافیوں، منافقتوں اور خوابوں کو بھی اپنی فکر کا موضوع بنایا ہے۔ اپنے سماج کے انسان کے خوف، بے یقینی، عدم تحفظ اور طبقاتی جبر کے خلاف انھوں نے ایسا لہجہ اختیار کیا ہے، جس میں احتجاج اور بغاوت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اکبر حمیدی کی شاعری میں خارج کے عناصر، اقتصادی بدحالی، زوال پذیر سیاسی نظام اور خرابیوں کی طرف صراحت سے اشارے ہوئے ہیں۔ دو شعر دیکھیئے،

خامشی جرم ہے جب منہ میں زباں ہو اکبر
کچھ نہ کہنا بھی ہے ظالم کی حمایت کرنا

ہماری جنگ اندھیروں سے ہے ہوا سے نہیں
دیا جلا کے نہ یوں سامنے ہوا کے رکھ

لیکن باوجود اس مایوس کن صورت حال کے، اکبر حمیدی کی رجائیت متوازی دھارے کی طرح ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ ایسے بہت سے شعر ان کی غزلوں میں کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔

ایک سی صورت حالات نہیں رہ سکتی
دن بھی نکلے گا سدا رات نہیں رہ سکتی

ہم تو خوشبو ہیں ہمارا راستہ روکے گا کون
کس بلندی تک وہ دیواریں اٹھالے جائے گا

کہیں بھی رہ در و دیوار جگمگا کے رکھ
اگر چراغ ہے چھوٹا تو لو بڑھا کے رکھ

ان موضوعات کے علاوہ اکبر حمیدی کے ہاں غزل کی کوملتا، لطافت، نزاکت، رومانی اور جمالیاتی لب و لہجے کی بھی کمی نہیں۔ ایسے اشعار انھوں نے سرشاری اور وارفتگی سے کہے ہیں، کہ پڑھنے والا بے ساختہ داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا، چند ایک اشعار ملاحظہ ہوں۔

ایسے میں تو خود سے بھی بچھڑ جاؤ گے اکبر
تم خود سے خفا رہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

ہر اک طرف سے ہے منظر بہشت کا اکبر
وہ انجمن میں کئی زاویوں سے بیٹھے ہیں

کس آسمان سے گزرا ہے درد کا دریا
ستارے ٹوٹ کے آب رواں میں آنے لگے

اک نظر ہی وہ مسکرائے تھے
آج تک جگمگا رہا ہوں میں

زیست ہمیشہ مجھ سے تھوڑی دور رہی
جیسے نار کوئی بیگانی ساتھ چلے

ان کی پنجابی شاعری 'بکی غزل پنجاب' کی چھوٹی بحریں برجستگی، بے ساختگی اور سہل ممتنع کی چاشنی سے لبریز ہیں۔ وہ پنجابی کا سچا اور ٹھیٹ لہجہ اختیار کرتے ہوئے ایک نویکلا اور منفرد اسلوب اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ غزلیں زیادہ تر ردیف کے بغیر ہیں، لیکن قافیہ، ردیف کی غنائیت کو کسی طرح بھی مجروح نہیں ہونے دیتا، اور شعر کی نزاکت و لطافت اپنے اصلی مزاج کے ساتھ قائم رہتی ہے۔ چند غزلوں کے اشعار دیکھیں۔

جیڈی تیز ہوا   اوڈا وڈا مچ
اوہدی وات نہ آئی   خبراں دا گھڑمچ
ساڈی بازی جان دی   ویکھ نہ ماریں کھچ

ایویں نہ پیا اٹھن پو   بکل مار کے بیٹھا رہو
کیہا بھلیکھا لگ گیا   بیجی کنک تے اگے جو
چنگا کاروبار اے ساڈا   لینا اک تے دینے سو

نہ کوئی عزت، نہ کوئی پت   ڈاہڈی ہوئی پھتیا پھت
باہر کوئی حال نہ پچھے   اندر جاواں چُکی اَت

بندا ویکھ نہ سکدے   ڈاہی پھرن مصلے
وڈیاں بوٹاں دے   سبھے آ گئے تھلے
میں ہاں پاکستانی   مارو مینوں کھلے

جہاں تک اصناف نثر کا تعلق ہے، اکبر حمیدی نے اس طرف قدرے تاخیر سے رجوع کیا، مگر دیر آید، درست آید، کے مصداق وہ ناہموار، راستے پہ بھی کامیابی سے چلتے رہے، انکا تخلیقی دریا کناروں کے بند توڑ کر نئی زمینوں کی طرف چلا، تو کھلے میدان میں آ کر کہیں پرسکون اور دھیما بھی ہوا، اور کہیں نشیب کی طرف گرتے ہوئے مزید تندی و تیزی بھی دکھاتا رہا۔ چنانچہ نثر و نظم میں ان کی آمد و آورد کے دورانیے بھی آتے رہے،

اور بے ساختگی اور شعوری عمل کی کارفرمائی بھی کہیں نہ کہیں موجود رہی۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار غزلوں، نظموں، انشائیوں، خاکوں، مضامین، ہائیکو، اور یادداشتوں میں ان کی تخلیقی تھکاوٹ کا کبھی کبھی شائبہ بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ مگر یہ عارضی لمحات ان تخلیقی گھٹاؤں کی اوٹ ہو جاتے ہیں جن سے موسلا دھار بارش برستی اور زمین سیراب ہوتی ہے۔

رفیق سندیلوی کی نئی مرتب شدہ کتاب، اکبر حمیدی کا فن، ایک ایسی اہم اور یادگار دستاویز ہے جس میں اکبر حمیدی کا فن بہت حد تک اپنے امکانات کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ اس کتاب میں اکبر حمیدی کو ان کے ہمعصر فنکاروں اور ناقدوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے دیکھا، جانچا اور پرکھا ہے، اس قدر ہمہ جہت پہلوؤں سے جائزہ لینے اور پرکھنے کے باوجود ابھی بھی اکبر حمیدی کے ہاں ایسے امکانات اور پرتیں دریافت کی جاسکتی ہیں، جن میں ان کے فن کی مزید تشریح اور توجیہہ ہو سکے۔ تاہم عمومی طور پر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اکبر حمیدی کے فن پر اس کتاب میں اہم اشارے موجود ہیں۔ رفیق سندیلوی نے اپنی تنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہوئے مضامین کے انبار سے چند اہم نوعیت کے مضامین کا چناؤ کر کے اسے بے جا طوالت اور ضخامت سے محفوظ رکھا ہے۔

اکبر حمیدی کے انشائیوں کے ضمن میں ناقدین نے ان کے فن انشائیہ کو بحیثیت مجموعی سراہا ہے، ان کی انشائیوں کی پہلی کتاب، جزیرے کا سفر، کا پیش لفظ لکھتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ، اکبر حمیدی ایک ایسے انشائیہ نگار ہیں جن کے انشائیے مزاح یا طنز سے آشنا ہوئے بغیر بھی حد درجہ تازہ اور قابل مطالعہ ہیں، جبکہ پروفیسر نظیر صدیقی نے دوسری کتاب، تتلی کے تعاقب میں، کے پیش لفظ میں لکھا ہے، کہ اکبر حمیدی انشائیے کے ابتدا، اور انجام کے فن سے آگاہ ہیں اور اچھا جملہ لکھنا جانتے ہیں۔ منشا یاد نے بھی اپنے مضمون میں اکبر حمیدی کو لفظ آشنا اور خوبصورت تخلیقی جملہ لکھنے پر قادر انشائیہ نگار قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق اکبر حمیدی اپنے انشائیوں میں ضرورت کے مطابق بیانیہ، علامتی، یا استعاراتی، تمثیلی لہجہ اور اسلوب اختیار کر لیتے ہیں۔ رفیق سندیلوی کا اپنے مضمون میں کہنا ہے کہ، اکبر حمیدی کی انشائیے کی قلمرو میں آمد رائیگاں نہیں گئی۔ اکبر حمیدی اپنے ذہن کو آزاد رکھ کر جمالیاتی آہنگ کے ساتھ نتائج کو برقی لہروں کی طرح انشائیے کی بین السطور میں ادھر ادھر بکھیر دیتا ہے۔ اس کے انشائیے ذات وکائنات کا سیر نامہ ہیں۔

خاکہ نگاری میں اکبر حمیدی نے اپنے سوانحی واقعات اور خاندانی و ذاتی تعلقات کے حوالے سے ایک انشائی اور افسانوی لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔ یوں یہ خاکے، انتہائی ذاتی ہوتے ہوئے بھی بہترین ادب پارے قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ خاص طور پر میاں جی، اباجی، بے بے جی اور عظیم یعنی خورشید بیگم کے خاکے جیتے جاگتے انسانوں کی سچی، انمول اور دلکش تصویریں ہیں، اور انہیں پڑھتے ہوئے قاری خاکوں اور کرداروں کی فضا

میں داخل ہو جاتا ہے۔ جبکہ اکبر حمیدی کے بہت سے ناقدین نے اہل قلم پر لکھے گئے خاکوں میں اس شدت احساس اور فنی رچاؤ کا شکوہ کیا ہے، دراصل خاکہ لکھتے ہوئے اکبر حمیدی جس جذباتی لگاوٹ کا اظہار خاندانی افراد کے حوالے سے روا رکھتے ہیں، وہ شاید اہل قلم کے معاملے میں انہیں میسر نہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ خاکے احساس اور کیفیت کی سطح پر اتر کر قاری کو گرفت میں نہیں لیتے۔ پھر بھی ان کی انشائیوں کی دونوں کتابوں، قد آدم، اور، چھوٹی دنیا بڑے لوگ، میں موجود چند ایک خاکے تو ایسے ہیں جو انھیں خاکے جیسی اہم صنف سخن میں ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

اکبر حمیدی کی خودنوشت، جست بھر زندگی، ایک محتاط شخص کے سچ کی روداد ہے۔ جس نے قدم قدم، طویل اور ناہموار، رستے عزم و ہمت سے طے کئے ہیں۔ یہ متوسط طبقے کے ایک باشعور شخص کی داستان ہے، جسے دعویٰ ہے کہ، عام آدمی، کی روداد بیان کر رہا ہے۔ اکبر حمیدی کی یہ آپ بیتی، ہمیں سماجی روابط، رشتوں ناتوں، سماجی اور معاشی رکاوٹوں اور کامیابیوں کی چلتی پھرتی تصویریں دکھاتی چلی جاتی ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے اپنی ذاتی نفسی کمزوریوں کو بھی نشان زد کیا ہے اور اپنے بارے میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا۔ اس آپ بیتی میں انھوں نے لایعنی واقعات اور معاملات سے بھی اجتناب کیا ہے۔

یوں انھوں نے تمام عمر ادب کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا کر، اسے نہایت سنجیدگی اور ذمہ داری سے نبھایا ہے۔ انھوں نے اپنی پوری توانائی سے ان تخلیقی جہات میں لگن، خلوص نیت اور محنت سے کام کیا ہے اور اپنے خواب، نظریات اور آدرش کی افشاں سے اسے جگمگایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر لکھتے ہوئے مجھے انہی کے ایک مصرعے کے مصداق کہنا پڑتا ہے کہ اکبر حمیدی ادب کی اس انجمن میں ہمارے سامنے کئی زاویوں سے بیٹھے ہیں۔ ان کا شعر ہے۔

ہر اک طرف سے ہے منظر بہشت کا اکبر
وہ انجمن میں کئی زاویوں سے بیٹھے ہیں

تجھ کو پیش آئے گا ہم پر جو کرم فرمائے گا
سوچ لے آخر ہمارا بھی زمانہ آئے گا
ہم تو خوشبو ہیں ہمارا راستہ روکے گا کون
کس بلندی تک وہ دیواریں اٹھا لے جائے گا
(اکبر حمیدی)

ناصر عباس نیر (جھنگ)

نئے موسموں کی بشارت پر ایک نظر

صابر آفاقی کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔اس لیے بغیر کسی تعارف وتمہید کے چند باتیں ان کے شعری مجموعے نئے موسموں کی بشارت (مطبوعہ ۲۰۰۰) پر۔اس مجموعے میں حسب رواج غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔اور یہاں صرف ان کی غزل کو موضوع گفتگو بنایا جا رہا ہے۔

صابر آفاقی کی غزلوں کا سب سے نمایاں وصف ان کا آفاقی وژن ہے۔آفاقی وژن صابر آفاقی کے ہاں ایک ایسا طرز ادراک نہیں جو کائنات گیر ہوتا ہے۔جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے غیر ارضی اور اپنی افتاد کے لحاظ سے سرّی ہوتا ہے۔ان کے ہاں جو آفاقی زاویہ نظر ظاہر ہوا ہے اس کی نوعیت سماجی ہے۔جہاں کہیں اس زاویہ نظر کا کوئی تار مابعد الطبیعات سے ملا بھی ہے تو وہ کسی نہ کسی سماجی سروکار کو روشن کر گیا ہے۔صابر آفاقی ایک ایسے انسانی سماج کے تصور کو اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں جو تمام ایسے امتیازات سے ماورا ہو جو سماج کو گروہوں یا فرقوں میں بانٹتے ہیں، ان کے درمیان نفرتیں پھیلاتے اور انسانی امن و مسرت کی راہ مسدود کرتے ہیں۔انسان دوستی کا یہ تصور ۱۸ویں صدی میں خاصا مقبول ہوا تھا اور اسے ان حالات میں تقویت ملتی رہی ہے جو مذہبی عدم رواداری سے عبارت ہوتے ہیں۔ظاہر ہے یہ نقطہ نظر کسی حسی تجربے سے نہیں پھوٹا بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے اخلاقی ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ از خود پیدا نہیں ہوتا اسے حقیقی عملی ضرورتوں کے تحت اختیار کیا جاتا ہے۔ اس لیے صابر آفاقی کے ہاں کہیں کہیں اصلاحی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔اس بات سے مقصود انسان دوستی کے تصور کی اہمیت کو گھٹانا نہیں بلکہ شاعری میں اس کی پیشکش کے اسلوب پر روشنی ڈالنا ہے۔

انسان دوستی صابر آفاقی کے ہاں شرف انسانی کے تلازمے کو بھی تحریک دیتی ہے۔ان کے ہاں ایسے اشعار کثیر تعداد میں ہیں جن میں انسانی عظمت و شرف کا احساس کرنے اور اس کی محافظت پر زور دیا گیا ہے۔جدید معاشرے میں شرف انسانی کو باور کرانے کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب اسے منصوبہ بند مخفی طریقوں سے مسخ کرنے کی روش عام ہو سیاسی اور معاشرتی ادارے اس امر کے مرتکب ہوتے ہیں۔صابر آفاقی کی غزل میں در پردہ ان سیاسی حکمت عملیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو انسانی عظمت کو تاراج کرتی ہیں۔ان کے ہاں عظمت انساں کا پیچیدہ فلسفیانہ تصور نہیں ہے بلکہ وہ سادہ اور حقیقی تصور ہے جو روزمرہ کے تجربے سے پھوٹتا ہے۔

پیڑ سے جیسے گرا دیتی ہے آندھی پھل کو
اس طرح ڈھیر ہوئیں شہر میں جانیں اب کے

اسلحے کی دوڑ میں انسان دیوانہ ہوا
رقص میں ہے موت دنیا بھر میں رونق کچھ نہیں

لبوں کے قفل گر کھل جائیں بھی جبر و تشدد سے
تو وہ بازار جمہوری سے تالے ڈھونڈ لاتا ہے

جو گورا ہے اسے تو ظلم کرنا ہے بہر صورت
جہاں سے بھی ملیں دو چار کالے ڈھونڈ لاتا ہے

اس طرح صابر آفاقی کی غزل کا ایک سیاسی تناظر ہے اور یہ تناظر مقامی بھی ہے اور عالمی بھی کہ وہ انسانیت کا ایک غیر جغرافیائی تصور رکھتے ہیں۔انسانی سماج کے بنیادی مسائل پر لکھنے والوں نے بالعموم حاکم اور بالا دست طبقے کو ان مسائل کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔بالخصوص ترقی پسندوں کی نظر میں سیاسی طاقت ہی تمام عوامی مسائل کا باعث ہے لہٰذا اگر سیاسی تبدیلی آجائے (بلکہ لائی جائے) تو عوامی کلفتوں کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔چنانچہ وہ بالا دست طبقے کو طنز و ملامت کا نشانہ بناتے اور اس کے خلاف رائے عامہ ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ پرولتاری کلاس سے ہمدردی کا اظہار کرتے اور انھیں جرات مندانہ اقدام کا حوصلہ دینے کی سعی کرتے ہیں مگر صابر آفاقی کی شاعری کا مطالعہ کریں تو یہ طرز فکر سادہ لوحی پر مبنی دکھائی دیتا ہے۔صابر آفاقی انسانی سماج کے بڑے مسائل کی ذمہ داری بیک وقت حاکم طبقے اور عوام پر ڈالتے ہیں۔ان کا سیاسی شعور انھیں باور کراتا ہے کہ ہر قسم کی بالا دستی اس وقت تک اور اس حد تک ہے جب تک اور جس حد تک اسے قبول کیا جاتا ہے گویا وسیع عوامی شرکت کے بغیر کسی ناانصافی اور ظلم کا وجود نہیں۔ہر ظالم اور طاقت ور کی معاونت وہ خاموش اکثریت بھی کرتی ہے جو احتجاج اور مزاحمت کی بجائے خوئے تسلیمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔صابر آفاقی کا تخاطب بالا دست اور زیر دست دونوں طبقوں سے ہے۔

یہی کہنا ہے مجھ کو خود سروں سے
کہ رشتہ جوڑ لیں پیغمبروں سے

رگوں میں زہر رواں ہے بجائے خون حیات
وہ چل بسے جنھیں آتا تھا کار تریاقی

ہم اس دم ہاتھ پاؤں مارتے ہیں
گزر جاتا ہے جب پانی سروں سے

نہ ہو دل میں اگر پرواز پیدا
پرندہ اڑ نہیں سکتا پروں سے

سورج تو چمکتا ہے سوا نیزے پہ آ کر
ہمت ہے کہ ہم خود کو پگھلنے نہیں دیتے

میری صورت دیکھیں لیکن بات سنیں کب صابر وہ
کیسی ساعت تھی جب بہری ملت کے گھر اترا ہوں

اس صورت حال میں جب وہ اہل سیاست سے بھی مایوس ہوتے ہیں اور ملت کے بہرے پن پر بھی دل گرفتہ ہوتے ہیں تو خود کو آگے لاتے ہیں۔تاکہ صورت حال کو بدلا جا سکے

صلح بشر اور امن جہاں کا پرچم لے کر اترا ہوں
اس میدان میں دنیا کے میں دیکھ کے تیور اترا ہوں

خود بنیادی طور پر ایک تصور ہے جسے آدمی دو سطحوں پر قائم کرتا ہے۔انفرادی اور نوعی سطحوں پر۔آدمی

جب اپنی ذات کی خلوت میں اتر کر اپنی انفرادی ہستی کا شعور حاصل کرتا ہے۔ اور جب وہ اپنی نوع کے ساتھ اپنے رشتوں پر غور کر کے اپنا تصورِ ذات قائم کرتا ہے۔ صابر آفاقی انسانی صورتِ حال کو بدلنے کے لیے اپنے جس تصور خود کو آگے لاتے ہیں وہ انفرادی بھی ہے اور نوعی بھی۔ نوعی تصور اصلاً سماجی ہے جبکہ انفرادی تصورِ ذات زیادہ گہرا ہے۔ یہ انسانی ہستی کے بنیادی جوہر کو منکشف کرتا ہے وہ جوہر جس کی بنیاد پر وہ دوسری انواع سے ممتاز اور جس کی بنا پر وہ ہر نوع کی صورتِ حال کو بدل سکنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ یہ اقبال کے تصورِ خودی کی طرف ذہن کو مبذول کرتا ہے۔ (صابر آفاقی کے ہاں اقبال کے اثرات بھی جھلکتے ہیں۔)

میں نہ آیا تھا تو بحر و بر میں سناٹا سا تھا	میں چلا جاؤں تو بحر و بر میں رونق کچھ نہیں
یہ اپنے آپ نکالے گا راستہ کوئی	جو سنگ پارہ ہے اس دل کو اضطراب تو دے
بچ نکلا اگر حملۂ خورشید سے اب کے	دریا کی طرح شعر کے قلزم میں بہوں گا
یہ کسی میں نظر آئی نہ کرامت مجھ کو	ورنہ کیوں سونپتے دنیا کی امامت مجھ کو
خورشید جو بجھتا ہے جلا لیتے ہیں ہم چاند	اپنی یہ نہیں خو کہ اندھیروں سے نباہیں

چنانچہ یہ جوہرِ ذات ہی زندگی کا اصل راز اور انسان کی سب سے بڑی کرشماتی قوت ہے مگر یہ مخفی ہے، اسے دریافت کرنا پڑتا ہے، دل کو اضطراب دے کر، دریا کی طرح شعر کے قلزم میں بہہ کر یعنی اس کے لیے کوشش شرط ہے۔ صابر آفاقی کے اشعار میں اس امر پر اصرار موجود ہے کہ اس جوہرِ ذات سے شناسائی اور ہم بستگی کے بغیر انسانی صورتِ حال کو بدلنا ممکن نہیں۔ اپنے لمحہ انکشاف میں یہ جوہر شخصی اور نجی ہے مگر اپنے پھیلاؤ اور عمل میں یہ غیر شخصی اور اجتماعی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تبدیلی کا مرکز اندر اور محیط باہر ہے۔ ظاہر ہے یہ اس زاویہ نظر سے بالکل مختلف بات ہے جو محض سیاسی تبدیلی سے پوری انسانی صورتِ حال کے بدل جانے کا خواب دیکھتا ہے۔

”بھیڑ چال کا عمل ارتقا کی نفی ہے۔ ترقی پذیر ذہن تو ہمیشہ پگڈنڈی اختیار کرنے پر مائل ہوتا ہے اور پھر یہی پگڈنڈی کسی روز ایک کشادہ شاہراہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک حریتِ ذہن و قلم سے مراد یہ ہے کہ قلم کار اپنے اوپر وارد ہونے والے آزادی کے لمحات میں اپنے قلم کو جنبش دے۔ وہ کسی سسٹم کا تتمہ اور کسی متشدد نظریے کا تابع مہمل بننے کے بجائے اس روشنی میں آگے بڑھے جو اس کے اندر سے پھوٹ رہی ہو۔“ **ڈاکٹر وزیر آغا**

(بحوالہ کتاب ”ساختیات اور سائنس“، صفحہ نمبر ۱۶۶)

شگفتہ الطاف (بہاول پور)

افتخار عارف ... ایک شاعر

اردو ادب کے آغاز ہی سے تبصرہ نگار فن اور فنی تقاضوں پر انفرادی نظریات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ مغربی دانشوروں نے بھی فن اور نظریۂ فن پر مفصل اظہارِ رائے کا حق محفوظ رکھا۔ کسی نے فطری رجحانات کی تربیت کے بعد تخلیق ہنر کو فن کہا تو کسی کے نزدیک تخیل اور ادراک انسانی کا فنونِ لطیفہ کی جہت میں تخلیقی اظہار یہ ہی فن پارے کی تمثیل کے مصداق ٹھہرا۔ لانجاسن کہتا ہے۔

”فن کا کمال یہ ہے کہ وہ فطرت معلوم ہو اور فطرت کی کامیابی اس میں ہے کہ اس میں فن چھپا ہوا ہو۔“ [۱]

یعنی فطرت اور تخلیق کار دونوں لازم و ملزوم ہوئے۔ فطرت تخلیق کار کی پاسدار اور تخلیق کار فطرت کا امانت دار۔ گویا فطرت اور آدمیت کا باہمی ربط ہی بقائے کائنات ہے۔ یوں بھی فطرت محض کائنات کی دکھائی دینے والی بنت تک ہی محدود نہیں بلکہ فطرت کے پس منظر میں وہ طاقتور احساسات بھی مزین ہیں جو کسی شاعر کے ہاں اسکی شاعری کے فطری تیور دریافت کرتے ہیں۔ دراصل کسی شاعر کا شخصی کھوج لگانا ہو تو اس کے شعری اسلوب کی پرتیں تلاش کر لیجئے شاعر کی مکمل شخصیت دریافت کی جا سکتی ہے البتہ یہ الگ بات ہے کہ شاعر کا تخلیقی عمل اور صلاحیت قدرتِ بیان کے مختلف درجات شعر کہنے والوں کا مقام و مرتبہ متعین کرنے میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اس لیے فیض احمد فیضؔ اچھے شعر اور فنی معیار کا منفرد نظریہ قائم کرتے ہیں۔ بقول ابو اللیث صدیقی

”فیضؔ نے کسی جگہ اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ شعر کی مجموعی قدریں جمالیاتی خوبی اور سماجی افادیت دونوں شامل ہیں۔ اس لیے مکمل طور پر اچھا شعر وہ ہے جو فن کے معیار پر نہیں زندگی کے معیار پر پورا اترے۔“ [۲]

اور زندگی کے معیار پر پورا اترنے والے اشعار کی دریافت میں ’مہر دو نیم‘ اور ’حرف باریاب‘ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ افتخار عارفؔ نے اس بھید کو پا لیا ہے جس کا کنارہ فیض احمد فیضؔ نے منکشف کیا تھا۔ ۱۹۴۴ء کی ہتھیلی پر روشن ہونے والے افتخار عارفؔ کی شاعری کی آواز اپنے ہمعصروں کی دیگر آوازوں سے کہیں منفرد معلوم ہوتی ہے۔ اس کی شعری اثر آفرینی اور تخلیقی ہنر

مندی سراسر ودیعت خداوندی ہے لیکن اس سرمایہءخداداد پر انفرادی مزاج کا رنگ اس کا اپنا انفرادی مزاج کا رنگ اس کا اپنا ہے وہ کلاسیکل شاعری اور جدید شاعری کے تیسرے سنگم کا پاسدار ثابت ہوا ہے جو کسی کی آواز کی پیروی کیے بغیر نئے لفظ و معانی کے جہان آباد کر رہا ہے۔

افتخار عارف کا Diction قطعی جدا، آواز الگ اور مفہوم ترو تازہ ہے مگر اس سارے سفر میں اسکی شاعری کو ایک ہی سانس میں دہرا لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مضطرب شاعر کی شاعری ہے جس کے سخن میں مزاحمت اور سودائے جنوں بھی ہے مگر اسکی تخلیقی تربیت نے اس کے باطنی انقلاب کو بھی سدھار لیا ہے ورنہ تو یہ شاعر ایک ایسا جہان اضطراب ہے کہ جس کے بارے میں ممتاز مفتی نے کہا تھا۔

''صاحبو! افتخار عارف کو دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھو جب وہ اکیلا بیٹھا ہو۔ جب اسے یقین ہو کہ گرد و پیش میں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ اس وقت اس کا سینہ شق ہو جاتا ہے۔ اس میں سے ایک ٹوٹ نکلتی ہے۔ ایک ویرانی ایک خلاء۔ افتخار عارف کو جان لینا چاہیے کہ ایک چیز ہے جو اسے خلاء کی دست برد سے بچا سکتی ہے۔ تخلیق! تخلیق! تخلیق!'' [۳]

اسی مرحلہ تخلیق پر افتخار عارفؔ دریافتوں کے مصرعے تحریر کرتا ہے۔ وہ کائنات کی وسعتوں کے تسلسل نظم و ضبط اور ہم آہنگی کے خالق کو تلاش کرتا ہے اور پھر اپنے لفظ و بیان کے اضطراب کو خدائے برتر کے ظہور کی آرزو کرتا دکھائی دیتا ہے۔

''تو کون ہے وہ جو لوحِ آبِ رواں پہ سورج کو ثبت کرتا ہے اور بادل اچھالتا ہے
جو بادلوں کو سمندروں پر کشید کرتا ہے اور بطنِ صدف میں خورشید ڈھالتا ہے
وہ سنگ میں آگ، آگ میں رنگ، رنگ میں روشنی کے امکان رکھنے والا
وہ خاک میں صوت، صوت میں حرف، حرف میں زندگی کے سامان رکھنے والا
نہیں کوئی ہے۔
کہیں کوئی ہے
کوئی تو ہوگا'' [۴]

ظہور و انکشاف کے قریب قریب افتخار عارف کے سلگتے ہوئے کرب کی آنچ اس کی ذات کی ٹوٹ پھوٹ اور شکستگی و ریختگی لمحہ بھر میں سخن ہو جاتی ہے۔ افتخار عارف کی غزلیں اور نظمیں یونہی پُر اثر نہیں ہیں ان کی تخلیق میں احساس ذات کا ایسا نا قابل تردید تجربہ موجود ہے جس کا ہر عکس اس کی خواہشات کے خلا پر منضبط ہو رہا ہے۔ شاعر کی زندگی اور معاشرہ سراسر امتحان کی صورت طلوع ہو یہیں

قدرتی طور پر مصائب و مشکلات کا سامنا۔ ملک بدری اور بے گھری ایسے آسیبوں کی یکجائی میں افتخار عارف کی ذات کی بحالی کسی معجزے سے کم نہیں لیکن اس سارے تجربے میں اسکا رشتہ محسوسات اور قریہ غم سے بہم استوار ہو گیا ہے جس کے طفیل اس کے کلام میں شکستگی کی لفظی تصویر عکس پذیر اور زمانے کے انبوہ میں با آسانی اپنے اثاثے کو پکارنے لگا ہے۔

بستی بھی سمندر بھی بیاباں بھی مرا ہے
آنکھیں بھی مری خواب پریشاں بھی مرا ہے

وارفتگی صبح بشارت کو خبر کیا
اندیشہءصد شام غریباں بھی مرا ہے

جو ہاتھ اٹھے تھے وہ سبھی ہاتھ تھے میرے
جو چاک ہوا ہے وہ گریباں بھی مرا ہے

تمام شہر مکرم بس ایک مجرم میں
سو مرے بعد مرا خوں بہانہ مانگے کوئی

وہ جس کے چاک گریباں پہ تہمتیں ہیں بہت
اسی کے ہاتھ میں شاید ہنر رفو کا بھی ہو

میں جس کو اپنی گواہی میں لے کے آیا ہوں
عجب نہیں کہ وہی آدمی عدو کا بھی ہو

کاروبار میں اب کہ خسارا اور طرح کا ہے
کام نہیں بڑھتا مزدوری بڑتی جاتی ہے

کسی پندار شکستہ کا بھرم رہ تو گیا
اب یہ بات اور کہ خود قیمت پندار گری

افتخار عارف کی شعری شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کا حصار بہت اونچا اور بہت مضبوط ہے ایک ایسے صحرا کی طرح جس کی وسعتیں ہی وسعتیں ہیں مگر پھیلاؤ کا سدباب نہیں لیکن ابھی صحرا کے آسیب میں افتخار عارف کی شاعری میں جبر کا استعارہ پوری قوت اور تمام تر جبری استبداد سمیت روبرو ہوتا ہے۔

جبر۔۔۔حق کی ضد ہے اور جبر سچائی کا اختلاف۔ ایک ایسا اضطراب جو رد عمل کو للکارتا ہے۔ افتخار عارف کے ہاں جبر کی صورت بڑی انہونی اور بہت مختلف ہے۔ وہ زمانے بھر میں ہونے والی ہر ناانصافی کو جبر تصور کرتا ہے۔ یہ وہ جبر ہے جو صداقتوں کو قطع کرتے ہوئے شخصی آزادی سے انکار کرتا ہے۔ یہی جبر بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا باعث ہے اور ''فریاد'' ''قیمت خلعت'' اور ''دستار کی توقیر'' نہیں کرتا جو ''عدل کے ہاتھ پر تلوار'' اور بصیر ذہنوں کو سرعام سزا دینے کا جواز ٹھہرتا ہے۔ افتخار عارف ایسا حساس شاعر ایسے جبر کو برداشت نہیں کر پاتا اور وہ چیخ اٹھتا ہے۔

ویرانہ مقتل پہ حجاب آیا تو اس بار
خود چیخ اٹھا میں کہ یہ عنواں بھی مرا ہے [۱۰]

کسی کے جور و ستم یاد بھی نہیں کرتا
عجیب شہر ہے فریاد بھی نہیں کرتا

نہ جانے کیسی قیامت گزر گئی اب کے
غریب شکوہٴ بیداد بھی نہیں کرتا [۱۱]

سخن حق کو فضیلت نہیں ملنے والی — صبر پہ داد شجاعت نہیں ملنے والی
زندگی بھر کی کمائی یہی مصرعے دو چار — اس کمائی پہ تو عزت نہیں ملنے والی ۱۲

قیمت خلعت از برسر بازار گری — جس کے ہر پیچ میں نخوت تھی وہ دستار گری
وقت کی تیغ جگر دار پہ ہے عدل کا ہاتھ — آنکھ جھپکی تھی کہ چلتی ہوئی تلوار گری ۱۳

ہم اہل جبر کے نام ونسب سے واقف ہیں — سروں کی فصل جب اتری تھی تب سے واقف ہیں
کبھی بجھے ہوئے خنجر کبھی کچھی ہوئی تیغ — سپاہ ظلم کے ایک ایک ڈھب سے واقف ہیں ۱۴

جبر میں اختیار کی خواہش ضرور ہوتی ہے لیکن اگر طاقت اختیار، دائرہ اختیار میں نہ ہو تو جبر کے خلاف آواز اٹھانا بالکل ایسے ہی ضروری ہے جیسے کسی عذاب میں فطری کتھارسس کے لیے گریہء بے تاب۔ اسی طرح ردعمل کا اظہار بھی گویا جبر کو سہارنے کا ایک عمل ہے جس کے بغیر بلا جواز جبر کا عذاب برداشت کرنا ناممکنات کے مصداق ہے۔ افتخار عارف جس جبر سے گزرتا ہے اسے تسلیم کرنے کا روادار نہیں۔ لہٰذا وہ اس جبر کا ردعمل پیش کرتا ہے۔ ردعمل کی یہ تحریک احتجاج بھی ہے اور بغاوت بھی۔ اس احتجاج میں اگر کوئی ہنر منفرد ہے تو وہ یہ کہ افتخار عارف اس احتجاج میں بھی خون خرابے اور تشدد کا روادار نہیں بلکہ اس کا اسلوب صرف جبر کو رد کرتا ہے اور پھر اس تردید کا انداز بھی بہت سلجھا ہوا اور محبت والا ہے۔

لوگ پہچان نہیں پائیں گے چہرہ اپنا — اب نہ بدلے تو بدل جائے گا نقشہ اپنا
بول اے بے سروسامانیٔ گلشن کچھ بول! — خلقت شہر طلب کرتی ہے حصہ اپنا ۱۵
پھر اس کے بعد جو ہونا ہے ہو رہے سر دست — بساط عافیت جاں الٹ کے دیکھتے ہیں ۱۶
یہ بار بار کنارے پہ کس کو دیکھتا ہے — بھنور کے بیچ کوئی حوصلہ اچھال کے دیکھ ۱۷
گلی کوچوں میں ہنگامہ بپا کرنا پڑے گا — جو دل میں ہے اب اس کا تذکرہ کرنا پڑے گا
نتیجہ کربلا سے مختلف ہو یا وہی ہو — مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑے گا ۸۱

افتخار عارف کے ہاں جبر کے خلاف ردعمل کا استعارہ ہی آخری استعارہ نہیں ہے۔ ابھی تو اسے خارجی عوامل کے بعد داخلی عوامل کا سامنا ہے۔ یہاں ایک دوسری دنیا آباد ہے۔ یہاں دکھوں کے عنوان بدل گئے ہیں۔ جبر کے خلاف اپنے فرمان جاری کرنے والا شاعر یہاں ایک گھر کی تلاش میں بھٹکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں اس کے بے تعبیر خواب ہیں جن کا کوئی دیس نہیں ہے۔ افتخار عارف کی پرورش و تربیت چونکہ ایک بزرگ نے کی جو رشتے کے اعتبار سے ان کے نانا تھے۔

افتخار عارف نے بھلے ان کی شفقت کی چھاؤں میں سکون محسوس کیا لیکن داخلی احساسات کے طفیل اس کی ذات میں حقیقی گھر کا استعارہ ہمیشہ زور پکڑتا رہا اور یہ وہ استعارہ ہے جس سے افتخار عارف نے کبھی انکار نہیں کیا۔ غالباً یہ وہی گھر ہے جو تاثیر میں ماں کی گود جیسا ہے جو اینٹ پتھر کی تعمیر نہیں بلکہ امن و محبت کا گہوارہ ہے۔ افتخار عارف نے اسی گھر کو بارہا تلاش کیا وہ جبر و استبداد کے ماحول سے نکل کر کسی پارک میں جانے کی آرزو نہیں کرتا بلکہ گھر تلاش کرتا ہے اسے معلوم ہے خانہ بدوشی دیر تک ساتھ نہیں دیتی اور خانہ بدوش بھی تو آخر اپنے گھر ہی لوٹ جاتے ہیں۔

تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات — سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کے دیکھتے ہیں ۱۹
عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا — تمام عمر چلے اور گھر نہیں آیا ۲۰
ہر اک سے پوچھتے پھرتے ہیں تیرے خانہ بدوش — عذاب دربدری کس کے گھر میں رکھا جائے ۲۱
گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں مگر جانے کیوں — شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے ۲۲
مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے — میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے ۲۳
یہ اب کھلا کہ کوئی بھی منظر مرا نہ تھا — میں جس میں رہ رہا تھا وہی گھر مرا نہ تھا ۲۴
سچے سائیں ہمارے حضرت مہر علی شاہؒ — بابا! ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے ۲۵

وحشت گھر سے فرار کے باوجود بھی گھر کی تلاش اور تلاش معاش کا پہلو افتخار عارف کے ہاں صاف دکھائی دیتا ہے اسے رزق کی ضرورت اور اسکی حقیقی قیمت کا پورا پورا احساس ہے۔ اسے خبر ہے کہ شکم کی آگ آدمی کو قریہ بہ قریہ اور شہر در شہر لیے پھرتی ہے اسے معلوم ہے کہ ایک لقمہء تر آدمی سے اسکا دبنگ لہجہ چھین لیتا ہے لیکن اس کے باوجود حقیقی منظر نامے میں افتخار عارف اپنے سخن کو قصیدہء بے جا سے مملو نہیں کرتا اور اس کی غیرت اور سخن سے محبت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ — رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے ۲۶
ہوس لقمہء تر کھا گئی لہجے کا جلال — اب کسی حرف کو حرمت نہیں ملنے والی ۲۷
شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر — سگ زمانہ ہیں ہم کیا، ہماری ہجرت کیا ۸۲
مالک یہ آب و خرمایہ نان و نمک نہ دے — تیری رضا نہ ہو تو مجھے خاک تک نہ دے ۲۹
کوئی جنوں کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے — بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے ۳۰

تاریخ سخن دیکھیے تو ایک افتخار عارف ہی نہیں بلکہ اکثر شعراء کو رزق اور تلاش معاش کے مسائل و مصائب کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ میر تقی میرؔ، آتشؔ لکھنوی، اور مرزا غالبؔ ایسے نامور شعراء اور اسی طور پر دیگر بے شمار شعراء کو اپنی زندگی میں عذاب معاش سے گزرنا پڑا اور اس کرب کا

اظہار بھی انکے کلام میں ہوا۔ یہی احوال افتخار عارف کا بھی ہے لیکن ان تمام حالات پر ڈیلٹا کا گراف بنانے والی ایک چیز اور ہے اور وہ ہے شاعر کے وجود میں اترا ہوا خوف جو اس کا تعاقب کرتا ہے اور اسے نامکمل رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

کسی خوف زدہ آدمی کی نسبت نڈر انسان معاملات زندگی کا سامنا آسانی سے کر سکتا ہے لیکن افتخار عارف کے ہاں عجیب تضاد ہے وہ بیک وقت بہادر بھی ہے اور مبتلائے خوف و ہراس بھی۔ وہ اکیلا ہی اپنی ذات کے سبھی دکھ سمیٹ بھی رہا ہے اور خوف سے لرز بھی رہا ہے۔ وہ آنسوؤں کو ماں کا درجہ دینے والا۔ وہ مٹی ماں اور مالک کے نافرمان کو باغی کہنے والا، کسی کمسن بچے کی طرح ہے جو بھیڑ میں اپنی ماں سے کھو گیا ہے اور اب شام ڈھلے اس کی آنکھیں خوف سے بھر گئی ہیں۔

سمندر اس قدر شوریدہ سر کیوں لگ رہا ہے   کنارے پر بھی ہم کو اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے
در و دیوار اتنے اجنبی کیوں لگ رہے ہیں   خود اپنے گھر میں آخر اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے ۳۱
وقت نے ایسے گھمائے افق آفاق کہ بس   محور گردش سفاک سے خوف آتا ہے
شکل بننے نہیں پاتی کہ بگڑ جاتی ہے   نئی مٹی کو نئے چاک سے خوف آتا ہے ۳۲
ہجر کی دھوپ میں چھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں   آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں ۳۳
مالک سے اور مٹی سے اور ماں سے باغی شخص   درد کے ہر میثاق سے روگردانی کرتا ہے ۳۴

خوف کی اس لہر میں افتخار عارف کا اعتبار بھی رخصت ہوا۔ اپنے اردگرد رہنے والوں پر اعتبار کی ساکھ قائم ہونا بہت ضروری ہے لیکن افتخار عارف کی شاعری میں شاعر کا اعتبار کسی پر نہیں رہا وہ ہر اس شخص کو اپنا نہیں جانتا جو اس سے مل کر بچھڑ جائے اور اگر اعتبار کا سلوک اس کے وجود میں شامل ہو بھی تو افتخار عارف اسے آسیب اعتبار کے نام سے تحریر کرتا ہے۔

فریب کھا کے بھی اک منزل قرار میں ہیں   وہ اہل ہجر کہ آسیب اعتبار میں ہیں ۳۵
میں وہ ہوں کہ میرے چہار سمت غنیم اور   مجھے اعتبار یسار کا نہ یمین کا ۳۶
ہم تو دیوانے ہیں رمزیں نہ کنایہ جانیں   جز غم عشق ہر اک زخم کو مایا جانیں
آج کے بعد تو ہم پر بھی یہ لازم ہے کہ ہم   اپنی بوئی ہوئی فصلوں کو پرایا جانیں ۳۷
سمجھ رہے ہیں مگر بولنے کا یارا نہیں   جو ہم سے مل کے بچھڑ جائے وہ ہمارا نہیں ۳۸

بے اعتباری کے عذاب میں افتخار عارف کے ہاں دو طرح کے موضوعات تخلیق ہوئے ایک شکایت زمانہ اور دوسرا حب وطن۔ ہر دو موضوعات میں سے اول الذکر کا احوال ایک افتخار عارف ہی کا حوالہ نہیں بلکہ دور قدیم اور دور جدید۔ ہر دو ادوار میں اکثر شعراء کے ہاں یہ موضوع

شامل سخن رہا ہے فرق صرف انفرادی نقطہ نظر اور تجربہ ء ذات پر منحصر ہے۔ اسی تجربہ ذات کے اختیار میں افتخار عارف کی چشم بینا پر بھی بے شمار انکشافات وارد ہوئے ہیں۔ بالخصوص ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے دور میں وطن سے دوری کا تجربہ افتخار عارف کے لیے تکلیف دہ واقع ہوا تھا۔ وہ اپنی زمین اور اپنی مٹی کی محبت سے رچا بسا ہوا شاعر وطن سے دور رہ کر اور بھی نمایاں ہو گیا ہے۔ جبھی تو پروین شاکر نے لکھا ہے۔

''مٹی کی محبت افتخار کے گرد پورے چاند کے مہربان ہالے کی طرح ہمہ وقت رقصاں ہے؟'' ۳۹

افتخار عارف خود بھی اسی مہربان ہالے کو اپنا آخری حوالہ سمجھتا ہے اور اسی حوالے کی تقدیس کے لیے کبھی کبھی تو اس نے وہ قرض بھی چکائے ہیں جن کا وہ مقروض نہیں تھا۔ وہ اسی بے نام قرض کا جواز ڈھونڈتا ہے اور وطن سے اپنی انمول محبت کا جواب چاہتا ہے۔

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے   وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے ۴۰

کبھی مرے نام سے بھی کوئی سند وفا   کبھی مرے حق میں بھی فیصلہ ہو زمین کا
کبھی کھل کے لکھ کے جو گزر رہا ہے زمین پر   کبھی قرض بھی تو اتار اپنی زمین کا ۴۱
میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا   اجاڑ دے میری مٹی کو در بدر کر دے
مری زمین مرا آخری حوالہ ہے   سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بار ور کر دے ۴۲

مٹی سے محبت کا تحفہ بھی خداوندی ہے جو کسی شعوری کوشش کا محتاج نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے افتخار عارف سخن کے ہر محاذ پر سچائی کا سبز پرچم اٹھائے ہوئے ہے جو اس کی سرخروئی کا باعث ہے اور اس کی صداقتوں کا آئینہ دار۔ افتخار عارف کی سچائیوں میں ایک عظیم ترین سچائی واقعہ کربلا کی بھی ہے۔ واقعہ کربلا جو انسانی تاریخ کا دلخراش المیہ ہے اور جو شاعر کی پلکوں آنسوؤں کی طرح ہے۔ اہل بیت کے لیے پانی کی بندش کا کفرنامہ ہر صاحب دل کی طرح افتخار عارف کے لیے بھی باعث اذیت ہے وہ امام عالی مقامؓ کے تاریخی خطبے کی گونج سن سکتا ہے کہ جس میں اصحاب بیت کو کھلا اختیار دیا گیا کہ اگر وہ واپس جانا چاہیں تو شب کی تاریکی میں لوٹ جائیں۔ افتخار عارف کے بہت سارے معروف اشعار میں منفرد اشعار وہی ہیں جو واقعہ کربلا سے منسوب ہیں۔

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے   مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن   راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے
دریا پر قبضہ تھا جس کا اس کی پیاس عذاب   جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے ۴۳

افتخار عارف کی عمومی شعری شخصیت میں ایک انفرادی پہلو اس مخصوص لہجے کا ہے جسے ہم دور جدید کا جدید لہجہ کہہ سکتے ہیں۔ اس لہجے کے سارے تیور، سارے بھاؤ اور سب اظہاریے اس کے اپنے ہیں۔ افتخار عارف کی جدید شاعری کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ جدید موضوعات۔ ۲۔ منفرد لب ولہجہ

اول الذکر کے ذیل میں افتخار عارف کے ہاں تخیل کی پرواز نہایت طاقتور ہے جس کی بنا پر بیشتر نئے اور تازہ موضوعات دکھائی دیتے ہیں یہاں تک کہ روایتی مضامین کو بھی جدید اسلوب اور جدید آہنگ میں ڈھال کر بالکل نیا کر دیا گیا ہے۔ افتخار عارف کے جدید موضوعات ہی سے اس کی شاعری کو ایسا منفرد لب ولہجہ ملا ہے کہ قاری اکثر اشعار پڑھ کر ایک دم چونک جاتا ہے۔

یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا — یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں ۴۴
یہ جو پتھروں میں چھپی ہوئی ہے شبیہہ یہ بھی کمال ہے — وہ جو آئینے میں مہک رہا ہے وہ معجزہ بھی تو دیکھتے ۴۵
نجانے خلق خدا کون سے عذاب میں ہے — ہوائیں چیخ پڑیں التجا کے لہجے میں ۴۶
کس قیامت خیز چپ کا زہر سناٹے میں ہے — میں جو چیخا ہوں تو سارا شہر سناٹے میں ہے ۴۷
ایک ذرا سی جوت کے بل پر اندھیاروں سے بیر — پاگل دیئے ہواؤں جیسی باتیں کرتے ہیں ۴۸
محرابوں سے محل سرا تک ڈھیروں ڈھیر چراغ — جلتے جاتے ہیں بے نوری بڑھتی جاتی ہے ۴۹

دیئے کی مناسبت سے ہوا، چراغ اور بے نوری، چپ اور چیخ ایسے بے شمار متضاد عناصر، افتخار عارف کے شعری موضوعات کی تاثیر میں شدت پیدا کرتے ہیں اور اس کے لہجے کو توانا بناتے ہیں۔ محض اسی پر ہی اکتفا نہیں افتخار عارف کے ہاں موضوعات کا تنوع اس کی فکری بصیرت اور اس کے دور رس تخیل کو آشکار کرتا ہے اکثر اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی ایک شاعر کے ہاں چند موضوعات ایسے بھی موجود ہوتے ہیں جن سے وہ Inspire ہوتا ہے اور بعض اوقات تو وہی مضامین ہی بار بار اس کے کلام کا حصہ بنتے رہتے ہیں لیکن افتخار عارف کے ہاں ایسے اتفاقات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

موضوعات سخن بے شمار سہی مگر رنگ سخن اس وقت تک تکمیل پذیر نہیں ہوتا جب تک اس میں رجائیت اور رومانویت موجود نہ ہو۔ افتخار عارف کی شعری شخصیت کی قوس قزح بھی رومانویت اور رجائیت کے امتزاج سے نکھار پاتی ہے۔ 'مہر دونیم' اور 'حرف باریاب' کی شعری فضا میں ارتقائی مراحل کا اثر واضح دکھائی دیتا ہے البتہ رومانوی شاعری 'حرف باریاب' کی نسبت 'مہر دونیم'

میں کہیں زیادہ موجود ہے جو افتخار عارف کی سرسبز سوچ کو منعکس کرتی ہے۔

نرم نرم شاخوں پر ننھے ننھے پھول — کیسے تم کو دیکھ رہے ہیں دیکھو تو
دھنک کنج سے آنے والے رنگ سفیر — ڈالی ڈالی جھول رہے ہیں دیکھو تو
میں نے تمہاری قربت کی سرشاری میں — کیسے اچھے شعر لکھے ہیں دیکھو تو ۵۰
پھول مہکیں مرے آنگن میں صبا بھی آئے — تو جو آئے تو مرے گھر میں خدا بھی آئے ۵۱
وہ میرے نام کی نسبت سے معتبر ٹھہرے — گلی گلی مری رسوائیوں کا ساتھی ہو
وہ خواب دیکھے تو دیکھے مرے حوالے سے — مرے خیال کے سب منظروں کا ساتھی ہو ۵۲

افتخار عارف کا تعارف ایک فقرے میں کرانا ہو تو ہم اسے مضبوط و توانا لہجے کا جدید شاعر کہہ سکتے ہیں۔ پختہ اسلوب کی اس مسند پر اس کی غزل تو تخت نشیں ہے ہی، اس کی نظم کا معیار بھی کم نہیں گویا غزل اور نظم دونوں ہی افتخار عارف کی فنی پختگی اور اثر آفرینی کی مثالیں ہیں۔ غزل کا رچاؤ اور نظم کا سبھاؤ موضوعات میں مختلف سہی لیکن آواز ایک ہی رکھتے ہیں۔

''مالک! میری گڑیا کے سب رنگ سلامت رکھنا۔ مجھ کو ڈر لگتا ہے
کچے رنگ تو بارش کی ہلکی سی پھوار میں بہہ جاتے ہیں
ایک ذرا سی دھوپ پڑے تو اڑ جاتے ہیں
مالک میری گڑیا کے سب رنگ سلامت رکھنا۔ مجھ کو ڈر لگتا ہے۔'' ۳۵

نظم کی خوبصورتی اس کی تاثیر میں ہے اور افتخار عارف کی نظم کو یہ کمال بدرجہ اتم نصیب ہو گیا ہے اس کی نظموں میں بچپن کے رنگ، بسنت، کرکٹ اور کرکٹ سے ہونے والی شیشوں کی توڑ پھوڑ، پتنگوں کی اصطلاحیں۔ گناہ وثواب، خوف کی وارداتیں، نفسیاتی عوامل، اجداد کا احترام، کائنات کا عمومی مشاہدہ اور تنبیہی انداز موجود ہے۔ ''ایک تھا راجہ چھوٹا سا'' ''انتباہ'' ''پتہ نہیں کیوں'' ''ٹیمز کے ساحل پر'' اور ''بن باسی'' ایسی بہت سی نظموں کے ساتھ ساتھ افتخار عارف کی نظم ''بارھواں کھلاڑی'' زندگی میں انسان کے ضروری ہونے اور نہ ہونے کا خوبصورت اظہار ہے۔ اسی طرح بعض نظموں کے عنوانات مذہبی حوالہ جات کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ ''فتکلمو تعرفو'' ''ان وعد اللہ الحق'' ''ھل من ناصر ینصرنا'' ''العلم حجاب الاکبر'' وغیرہ اور کچھ عنوانات مذہبی شخصیات سے وابستگی کی بنا پر انہی کے ناموں سے وابستہ کر دیے گئے ہیں جیسے ''بحضور سید الشہداء'' ''اسامہ بن زیاد کے نام ایک نظم'' ''ابوطالب کے بیٹے'' اور ''ابوذر غفاری کے لیے ایک نظم'' وغیرہ اسی طرح حبیب جالب اور فیض کے احترام میں بھی نظمیں کہی گئی ہیں۔ افتخار عارف، میر، غالب، اقبال اور فیض سے عقیدت

ضرور رکھتے ہیں لیکن پیروی انہیں میرؔ کی بھی گوارا نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

اور کا ذکر تو کیا میرؔ کا بھی سایہ نہ ہو   وہ سخن کر جو کسی اور نے فرمایا نہ ہو ۵۴؎

غزل بعد از یگانہ سرخرو ہم سے رہے گی   مخاطب کوئی بھی ہو گفتگو ہم سے رہے گی

انیسؔ آتشؔ یگانہؔ محرمان عالم حرف   اور اب اس سلسلے کی آبرو ہم سے رہے گی ۵۵؎

افتخار عارف کی شعری بصیرت پر اللہ رب العزت کا اتنا کرم تو ہوا کہ اس کے کلام پر میرؔ کا سایہ معلوم نہیں ہوتا اگرچہ اسے اس بات کا احساس بھی ہے کہ اس کے ہمعصروں میں شعر کہنے والوں کے ہاں لہجے تر و تازہ نہیں ہیں اور اگر وہ بھی عام لوگوں کی طرز اختیار کرتا تو کلام لکھ لکھ کر انبار لگا سکتا تھا۔

سبک ظرفوں کے قابو میں نہیں لفظ   مگر شوق گل افشانی بہت ہے

شگفتہ لفظ لکھے جا رہے ہیں   مگر لہجوں میں ویرانی بہت ہے ۵۶؎

جیسے سب لکھتے رہتے ہیں غزلیں نظمیں گیت   ویسے لکھ لکھ کر انبار لگا سکتا تھا میں

کہیں کہیں سے کچھ مصرعے ایک آدھ غزل کچھ شعر   اس پونجی پر کتنا شور مچا سکتا تھا میں ۵۷؎

افتخار عارف ، میثاق تیرگی، کتاب مساوات، کاسۂ شام، اجرت عشق، اہل تذبذب، جبس شب، وارث گل، وارفتگی صبح بشارت، فروغ خورشید، قہرماں بستی، سبک ظرف، ہجر انگیز، خیمۂ صبر اور میثاق ہجر جیسی بے شما جدید اور تازہ تراکیب بنانے والا شاعر حضرت علیؑ کے اس قول پر ایمان رکھتا ہے کہ "**فتکلموفتعرفو**" کلام کرو تا کہ پہچانے جاؤ۔

افتخار عارف کو یقین ہے کہ کلام ہی آدمی کی پہچان ہے۔ وہ اسی قول کو 'مہر دو نیم' کی ابتداء اور اپنی ایک نظم کا عنوان بناتا ہے۔ اس کا کلام عصر حاضر کی شاعری میں سے با آسانی الگ کیا جا سکتا ہے۔ وہ یقیناً دور جدید کے جدید شعراء میں سے نہایت خوبصورت شعر کہنے والا شاعر ہے جس کے کلام کی تاثیر دیر تک زندہ رہے گی اور اس پر بھی وہ تو ہمہ وقت اپنے رب دو جہاں سے دعا کرتا دکھائی دیتا ہے۔

مرے خدا مرے لفظ و بیاں میں ظاہر ہو   اسی شکستہ و بستہ زباں میں ظاہر ہو

زمانہ دیکھے مرے حرف بار یاب کے رنگ   گل مراد ہنر دشت جاں میں ظاہر ہو

میں سرخرو نظر آؤں کلام ہو کہ سکوت   تری عطا مرے نام و نشاں میں ظاہر ہو ۵۸؎

ٹھہراؤ انسان کے ذہنی سفر کو ختم کر دیتا ہے۔ سخن میں اسرار و رموز کا ہمہ وقت ظہور ہی شعری شخصیت کی بقا اور ارتقاء کا ضامن ہے۔ زندہ شاعری، زندہ جذبات اور زندہ دعاؤں کی مرہون ہے اور افتخار عارف کے دل و دماغ شہر سخن میں زندگی سے لبریز ہیں۔

حوالہ جات

۱: سجاد باقر رضوی۔ 'مغرب کے تنقیدی اصول' کتابیات۔ لاہور۔ طبع اول ۱۹۶۶ء ص۔۱۱۷

۲: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ 'آج کا اردو ادب' فیروز سنز لمٹڈ۔ لاہور۔ بار اول ۱۹۷۰ء ص۔۱۹۰

۳: ممتاز مفتی۔ 'تخلیق کار' شمارہ چہارسو۔ جولائی اگست ۱۹۹۵ء ص۔۳۸

۴: افتخار عارف۔ 'مہر دو نیم' مکتبہ دانیال۔ وکٹوریہ چیمبرز۔ عبداللہ ہارون روڈ۔ صدر۔ کراچی

تیرھویں بار۔ (پاکستان) ۱۹۹۹ء ص۔۳۶

۵: افتخار عارف۔ 'مہر دو نیم' ایضاً ص۔۶۲،۶۳

۶: 〃 〃 〃 ص۔۷۶

۷: 〃 〃 〃 ص۔۶۴

۸: 〃 〃 〃 ص۔۱۴۸

۹: افتخار عارف۔ 'حرف باریاب' مکتبہ دانیال۔۲ وکٹوریہ چیمبرز عبداللہ بارون روڈ۔ کراچی چھٹی بار ۲۰۰۰ء ص۔۱۰۴

۱۰: 〃 مہر دو نیم ۔ ۔ ص۔۶۳

۱۱: 〃 حرف باریاب۔ ۔ ۔ ص۔۱۰۲

۱۲: 〃 حرف باریاب۔ ۔ ۔ ص۔۱۰،۹

۱۳: 〃 ۔ ۔ ۔ ص۔۱۰۴

۱۴: 〃 ۔ ۔ ۔ ص۔۱۰۰

۱۵: 〃 مہر دو نیم ۔ ۔ ۔ ص۔۱۲۷

۱۶: 〃 حرف باریاب ۔ ۔ ص۔۱۱

۱۷: 〃 ۔ ۔ ص۔۳۵

۱۸: 〃 ۔ ۔ ۔ ص۔۴۷

۱۹: 〃 ۔ ۔ ۔ ص۔۱۱

۲۰ 〃 مہر دو نیم ۔ ۔ ۔ ص۔۸۷

۲۱: ″ ۔ ۔ ۔ ص۔۴۰

۲۲: ″ ۔ ۔ ۔ ص۔۱۴۴

۲۳: ″ ۔ ۔ ص۔۵۷

۲۴: ″ ۔ ۔ ص۔۱۷۰

۲۵: ″ ۔ ۔ ص۔۶۱

۲۶: ″ ۔ ۔ ص۔۴۷

۲۷: افتخار عارف۔ حرف باریاب۔ ایضاً ص۱۰

۲۸: ″ مہر دو نیم ۔ ۔ ص۴۶

۲۹: حرف باریاب ۔ ۔ ص۴۹

۳۰: مہر دو نیم ۔ ۔ ص۳۹

۳۱: ۔ ۔ ۔ ص۲۷

۳۲: حرف باریاب ۔ ۔ ص۳۳

۳۳: مہر دو نیم ″ ۔ ۔ ص۳۷

۳۴: ″ حرف باریاب ۔ ۔ ص۲۱

۳۵: ″ ۔ ۔ ص۴۵

۳۶: ″ ۔ ۔ ص۱۱۳

۳۷: ″ ۔ ۔ ص۱۱۲

۳۸: ″ ۔ ۔ ص۹۵

۳۹: پروین شاکر۔ ’چپ دریا‘۔ ’شمارہ چہارسو‘ جولائی اگست ۱۹۹۵ء ص۵۲

۴۰: افتخار عارف۔ ’مہر دو نیم‘ ۔ ص۵۶

۴۱: ۔ ۔ ص۱۱۴

۴۲: ۔ ۔ ص۵۸

۴۳: ۔ ص۴۳

۴۴: ۔ ص۱۱۲

۴۵: حرف باریاب۔ ص۷

۴۶: ″ مہر دو نیم ص۱۱۲

۴۷: ″ ″ ص۱۷۵

۴۸: ″ ۔ ص۳۷

۴۹: ″ ص۱۴۸

۵۰: ″ ″ ص۱۰۹،۱۱۰

۵۱: ″ ″ ص۱۱۶

۵۲: ″ ″ ص۵۸،۸۶

۵۳: ″ ″ ص۱۰۵

۵۴: ″ حرف باریاب ص۹۶

۵۵: ″ ″ ص۹۸،۹۹

۵۶: ″ مہر دو نیم ص۹۶

۵۷: ″ حرف باریاب ص۱۳،۱۴

۵۸: ″ ″ ص۱۹

کرشن مہیشوری (راجکوٹ)

ایک صوتی البم کی چوری

'بدنام ہونگے پر نام تو ہوگا ' اس جملے سے شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو واقف نہ ہو۔مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایسا کام کر جاتے ہیں کہ وہ نام ودام تو خوب کما لیتے ہیں مگر بدنامی سے نہیں بچ پاتے ہیں۔میری آج کی گفتگو ادب وثقافت میں ہورہی جعلسازی سے متعلق ہے۔جعلسازی کا صد فیصد سچا واقعہ آپکی خدمت پیش کر رہا ہوں۔

مشہور قوال الطاف راجہ کا ایک صوتی البم ' دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے ' ۲۰۰۱ء میں ریلیز کیا گیا تھا،اس البم کے سائیڈ اے کا پہلا گیت ' پہلے تو کبھی کبھی غم تھا ' بہت مشہور بھی ہوا تھا۔یہ گیت دراصل دو سال قبل یعنی ۱۹۹۹ء میں کراچی سے ریلیز صوتی البم ' غم ' کے ہی پہلے گیت 'غم' (مصرعہ : پہلے تو کبھی کبھی غم تھا) کا چربہ ہے۔ان دونوں گیتوں میں آواز کے سوا ساری چیزیں چوری کا کرشمہ ہیں،یعنی چوری کی گئی دھن کے ساتھ گیت کی شاعری میں کس حد تک یکسانیت ہے یا الطاف راجہ پہلے گیت سے کتنا Inspire ہوئے ہیں یہ آپ خود درج ذیل دونوں گیتوں کو پڑھکر اندازہ لگا سکتے ہیں۔

گلوکار : رحیم شاہ	گلوکار : الطاف راجہ
گیت کار : انور رضوی	گیت کار : ارون بھیرو
میوزک : رحیم شاہ اور سلمان علوی	میوزک : الطاف راجہ اور ویشنودیو
پہلے تو کبھی کبھی غم تھا مگر اب ہر دم تیری یاد ستاتی ہے	پہلے تو کبھی کبھی غم تھا اب تو ہر پل ہی تیری یاد ستاتی ہے
پہلے تو کبھی کبھی غم تھا مگر اب ہر دم تیری یاد ہی آتی ہے	پہلے تو کبھی کبھی غم تھا اب تو ہر پل ہی تیری یاد رُلاتی ہے
پہلے تو کبھی کبھی غم تھا مگر یہ دردِ جدائی ہے ہر گھڑی اب	پہلے تو کبھی کبھی غم تھا مگر یہ دردِ جدائی ہے ہر گھڑی اب
پہلے تو کبھی کبھی غم تھا مگر یہ داغِ جدائی ہے ہر گھڑی اب	پہلے تو کبھی کبھی غم تھا مگر یہ داغِ جدائی ہے ہر گھڑی اب
میں تجھ سے کیسے کہوں یہ بتا	میں تجھ سے کیسے کہوں یہ بتا
کہ میرے دل میں تو بسا ہے ہر گھڑی اب	کہ تیری یاد کے سہارے جی رہا ہوں
میں تجھ سے کیسے کہوں یہ بتا	میں تجھ سے کیسے کہوں یہ بتا
کہ تیری یاد نے یہ آگ لگا دی اب	کہ غم کے آنسوؤں کو خود ہی پی رہا ہوں

میں تجھ سے کیسے کہوں یہ بتا	میں تجھ سے کیسے کہوں یہ بتا
نہ مار ڈالے تیری بے وفائی مجھکو	نہ مار ڈالے تیری بے وفائی مجھکو
میں تجھ سے کیسے کہوں یہ بتا	میں تجھ سے کیسے کہوں یہ بتا
نہ مار ڈالے کہیں یہ جدائی مجھکو	نہ مار ڈالے کہیں یہ جدائی مجھکو
بتادے مجھ کو بے وفا یہ	بتادے مجھ کو بے وفا یہ
میں تیری راہ میں کب تک کھڑا رہونگا	میں تیری راہ میں کب تک کھڑا رہونگا
بتادے مجھ کو بے وفا یہ	بتادے مجھ کو بے وفا یہ
میں تیرے در پہ یوں کب تک پڑا رہونگا	میں تیرے در پر یوں کب تک پڑا رہونگا
بتادے مجھ کو بے وفا یہ	بتادے مجھ کو بے وفا یہ
تو مجھ کو کب تلک ایسے ہی رُلائیگا	تو مجھ کو کب تلک ایسے ہی رُلائیگا
بتادے مجھ کو بے وفا یہ تو مجھ کو کب تلک اپنا نہ بنائیگا	بتادے مجھ کو بے وفا یہ۔تو مجھ کو کب تلک اپنا نہ بنائیگا
اے پگلی تو کیوں رو رہی ہے	اے پگلی تو کیوں رو رہی ہے
کہ غم تو مجھکو یہ لگا ہے جدائی کا	کہ غم تو مجھکو اٹھانا ہے جدائی کا
اے پگلی تو کیوں رو رہی ہے	اے پگلی تو کیوں رو رہی ہے
تیرے لئے تو سماں ہے یہ شہنائی کا	تیرے لئے تو سماں ہے یہ شہنائی کا
اے پگلی تو کیوں رو رہی ہے	اے پگلی تو کیوں رو رہی ہے
کہ گاؤں چھوڑنا ہے میرے مقدر میں	کہ گاؤں چھوڑنا ہے میرے مقدر میں
اے پگلی تو کیوں رو رہی ہے	اے پگلی تو کیوں رو رہی ہے
کہ عمر گزرے گی اب میری یہ سفر میں	کہ عمر گزرے گی اب میری یہ سفر میں

کسقدر دکھ کی بات ہے کہ رحیم شاہ کے گانے کو الطاف راجہ نے اپنی آواز میں نہ صرف چوری کی گئی دھن میں پیش کیا بلکہ اس گانے کی شاعری کو (جو انور رضوی نامی پاکستانی شاعر کی تخلیق ہے) کے دو مصرعوں اور چند الفاظ کی ردوبدل کے ساتھ ارون بھیرو نام کے جعلی شاعر کے نام کر دیا۔اس گیت نے الطاف راجہ کو کافی شہرت بخشی۔ادب وثقافت میں اسقدر جعلسازی موجود ہے کہ اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے،جعلسازی کی یہ ایک ادنیٰ سی مثال ہے جو ادب کو جعلسازی کا گودام بنانے والوں کے خلاف ایک چھوٹا سا قدم ہے۔میں پہلے بھی کئی بار یہ بات دہرا چکا ہوں کہ میرا مقصد کسی کی حوصلہ شکنی کرنا نہیں ہے بلکہ ادب وثقافت کی خدمت اور ایسے جعلی ادیبوں اور شاعروں کو ادب سے خارج کر کے ادب کو جعلسازی سے پاک وصاف کرنا ہے۔

نذر خلیق (خانپور)

اردو کی اہم ادبی ویب سائٹس

کاغذ کی کتاب کی اپنی ایک اہمیت ہے۔اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے دور میں انٹرنیٹ پر ویب سائٹس کے قیام کے بعد اور الیکٹرونک بکس (سی ڈی) کے اجراء کے بعد انٹرنیٹ پر ویب سائٹس کے قارئین کا ایک بہت بڑا حلقہ پیدا ہو چکا ہے۔کمپیوٹر سے منسلک افراد کا رجحان سی ڈی بکس کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔آئزک عظیموف جیسے افسانہ نگار نے اپنی 1957ء کے زمانے کی ایک اہم کہانی The Fun They Had میں ،یعنی کمپیوٹر کے ابتدائی ایام ہی میں نہ صرف اس کی افادیت کا احساس دلایا تھا بلکہ آنے والے وقت میں کتاب کو کمپیوٹر سے پیش آنے والے مسائل کی نشاندہی بھی کی تھی۔

بہر حال اس وقت اس بحث سے غرض نہیں کہ کتاب اور انٹرنیٹ میں سے کس کی اہمیت زیادہ ہے۔دونوں ہی علم کے حصول کے اچھے ذرائع ہیں۔کتاب سے ہماری صدیوں کی رفاقت ہے اور کمپیوٹر سے ابھی نئی دوستی ہے۔اردو دنیا عام صورت حال کے مطابق جیسے دیگر جدید علوم میں مغربی دنیا سے کافی پیچھے ہے ویسے انٹرنیٹ کے معاملے میں اتنی پیچھے نہیں ہے۔مختصر سے وقت میں اردو سے دلچسپی اور محبت رکھنے والے افراد کی ایک بڑی تعداد نے اردو ویب سائٹس کو قائم کر کے اردو کی ایک نئی دنیا بسا دی ہے۔چونکہ ہمارے ہاں ابھی تک اردو رسائل و کتب کے قارئین اور انٹرنیٹ کے قارئین کے درمیان مربوط رابطہ کی کوئی صورت نہیں بن سکی،اس لئے میں ادبی دنیا کے تمام قارئین اور لکھنے والوں کو نہ صرف اردو کی اہم ویب سائٹس سے متعارف کرانا چاہتا ہوں بلکہ انہیں ان کی تخلیقات کے ساتھ ویب سائٹس تک پہنچانے میں بھی موثر کام کرنا چاہتا ہوں۔اس لئے چند اہم ویب سائٹس کا تعارف کرا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

www.urdudost.com ہندوستان کے صوبہ مغربی بنگال کے شہر ۲۴ پرگنہ میں یہ ویب سائٹ قائم ہے۔اس میں عام قارئین کے تفریح کے لئے عوامی دلچسپی کے کئی سلسلے بھی ہیں۔لیکن اس کی ادبی طور پر سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ ویب سائٹ ایک وقت میں چار ادبی رسائل با قاعدگی کے ساتھ پیش کر رہی ہے۔اس کا سب سے پہلا اور اہم ادبی رسالہ ''کائنات'' ہے جو گزشتہ تین برسوں سے با قاعدگی سے بطور ماہنامہ جاری ہے۔اس ادبی ماہنامہ کو پہلے ہر مہینے کے بعد تبدیل کر دیا جاتا تھا۔اس طرح پرانے شمارے انٹرنیٹ پر نہیں مل سکتے تھے۔لیکن اب حال ہی میں انہوں نے آئندہ ہر سابقہ شمارے کو مستقل طور پر انٹرنیٹ پر رکھنے کا اعلان کیا ہے اور اگست 2003ء

سے سابقہ شمارے سب وہاں کی فائل میں موجود ہیں اور انہوں نے سابقہ تمام شماروں کو بھی پھر سے آن لائن کرنے کا اعلان کیا ہے۔اس کے دوش بدوش اس ویب سائٹ کی جانب سے یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ اکتوبر سے دسمبر تک کے تین شمارے یکجا کر کے کتابی صورت میں لائے جا رہے ہیں اور آئندہ بھی ہر تین شماروں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کیا جاتا رہے گا۔اس عمل سے لازمی طور پر کتاب اور انٹرنیٹ کا باہمی تعلق بہتر اور مضبوط ہوگا۔اردو دوست ڈاٹ کام کی جانب سے مزید ''اردو ورلڈ''ادبی خبر نامہ اور''ادبی البم''ادیبوں کی تصاویر پر مشتمل تصویری ماہنامہ دو رسالے با قاعدگی سے چھپ رہے ہیں۔اسی ویب سائٹ کا چوتھا ادبی رسالہ سہ ماہی''اردو ماہیا''ہے جو صرف ماہیے کی صنف پر مشتمل رسالہ ہے اور گزشتہ دو سال سے با قاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔پہلا سوا سال مکمل ہونے پر اس کے پانچ شمارے کتابی صورت میں شائع کئے گئے تھے اور ان پانچ شماروں کی سی ڈی بھی ریلیز کی گئی تھی۔ان سارے امور کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اردو دوست ڈاٹ کام کے پاس دنیا بھر میں پھیلے ہوئے دوستوں کی ٹیم ہے (میں خود اس ٹیم میں شامل ہوں اسی لئے مجھے علم ہے) لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس سارے اہم کام کا سارا بوجھ بنیادی طور پر خورشید اقبال نے اٹھایا ہوا ہے۔ان کی محنت اور لگن کے باعث ایسا ممکن ہو سکا کہ 24۔پرگنہ شمالی میں بیٹھ کر وہ اتنے عرصہ سے اتنا اہم کام نہایت خاموشی کے ساتھ اور اردو کی خدمت کے جذبے کے ساتھ کئے چلے جا رہے ہیں۔

www.urdustan.com اس ویب سائٹ کو امریکہ سے ایک اردو دوست کاشف الہدیٰ نے قائم کیا ہے۔اس سائٹ کا زیادہ تر کام موثر صحافتی سطح پر ہو رہا ہے یا پھر اردو بولنے والوں کے لئے محفل سجائی جاتی ہے۔لیکن اس ویب سائٹ کا یہ کمال ہے کہ اس وقت انٹرنیٹ پر جتنی چھوٹی بڑی ویب سائٹس قائم ہیں ان میں سے اسے سب سے پہلی ویب سائٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ایسے وقت میں جب انٹرنیٹ پر رومن اردو کو رائج کیا جا رہا تھا،اردو رسم الخط میں اردو کی ویب سائٹ قائم کر دینا اردو کی بہت بڑی خدمت ہے۔اردوستان سے پہلے ایک اور صاحب☆ نے اردو رسم الخط کی ویب سائٹ بنائی تھی۔ان کے ساتھ ہی ایک ماہ کے وقفہ سے اردوستان قائم ہوئی۔وہ سائٹ چند ماہ کے بعد بند ہو گئی اور اب تاریخی اعتبار سے اردوستان ڈاٹ کام اردو کی موجودہ ویب سائٹس میں سے سب سے پہلی ویب سائٹ ہے۔ادبی طور پر اس سائٹ پر ہر ماہ ایک اہم نظم کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔اردو ماہیا کا ایک سیکشن بھی سائٹ پر قائم ہے۔تاہم اس ویب سائٹ کا بنیادی مقصد ادب سے زیادہ اردو زبان کے ساتھ قارئین کو جوڑے رکھنا ہے۔اسی حوالے سے اس ویب سائٹ نے اپنے محدود وسائل میں پندرہ روزہ ریڈیو کا اجراء بھی کیا ہے جسے اسی سائٹ پر سنا جا سکتا ہے۔اردوستان پر دینی مضامین اور سماجی حوالے سے اہم میٹر بھی موجود ہے۔ اس کے ڈسکشن فورم میں اردو سے منسلک اردوستانیوں کی محفلیں دیکھی جا سکتی ہیں۔تاہم ادبی طور پر ان کا معیار بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔اس کے باوجود یہ بڑی بات ہے کہ کاشف الہدیٰ نے امریکہ میں رہ کر

جدید ادب

اپنے مخصوص قارئین کے ساتھ اردو کی ایک دنیا آباد رکھی ہوئی ہے۔

www.alqamaronline.com اسلام آباد پاکستان میں قائم کی گئی اس جنرل ویب سائٹ میں بھی زیادہ زور صحافتی پیش کش پر ہے۔تاہم اس ویب سائٹ پر اردو ادب کا خاطر خواہ اور معیاری مواد بھی مل جاتا ہے۔اس کے سیکشن شعروادب میں شاعری،افسانوں،خاکوں،تحقیقی مضامین،ادبی انٹرویوز وغیرہ کا بہت سا معیاری میٹر موجود ہے۔اس سیکشن میں ابھی بہت سے اضافوں کی ضرورت ہے۔اس ویب سائٹ کو اسلام آباد کے نوجوان جرنلسٹ ہارون عباس نے قائم کیا ہے اور انہیں کی ہمت سے یہ سائٹ عمدگی سے اپنا کام کر رہی ہے۔

www.urduclassic.com کراچی سے محمد حسین کی قائم کردہ ایک جنرل ویب سائٹ ہے۔اس میں ایک سوشل میگزین کی طرح کا مواد شامل کیا گیا ہے۔جس سے اردو کے عام قاری کی سائٹ سے دلچسپی قائم ہوتی ہے۔اردو کلاسیک پر ایک مختصر سا سیکشن ''اردو ادب'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔مختصر ہونے کے باوجود یہ سیکشن اپنے انتخاب کے لحاظ سے بہت معیاری ہے۔(یہ سیکشن میرے سپرد ہے نا۔اسی لئے)۔اردو کے اہم شعراء توجہ فرمائیں تو اس انتخاب کو مزید وسیع کیا جا سکتا ہے۔اس سلسلے میں مجھ سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

http://urdu_adab.tripod.com/urduadab/ اردو ادب ویب سائٹ کینیڈا سے فیصل فارانی کی قائم کردہ ایک مختصر لیکن خالص ادبی ویب سائٹ ہے۔اس میں اہم شعراء اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا ایک اہم انتخاب دیا گیا ہے۔فیصل فارانی کی ذاتی دلچسپی اور ادبی ذوق کے باعث یہ سائٹ معروف نہ ہونے کے باوجود ایک اہم ادبی ویب سائٹ ہے۔

http://www.urduword.com/Home/index.cgi اردو ورڈ ڈاٹ کام اس لحاظ سے بہت کلیدی اور اہم ویب سائٹ ہے کہ اس میں انگلش سے اردو لغت پیش کی گئی ہے۔آپ انگلش کا کوئی لفظ لکھ کر اس کا اردو ترجمہ مانگیں اسی وقت آپ کو اردو نسخ رسم الخط میں اور رومن اردو میں اس کا ترجمہ مل جائے گا۔مصطفیٰ علی نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ یہ بہت اہم اور مفید عام لغت تیار کی ہے۔اگرچہ اردو سے انگلش اور اردو سے اردو لغت کا اسی معیار کا کام ہونا ابھی باقی ہے تاہم انگلش اردو ڈکشنری کی حد تک یہ بہت اہم ویب سائٹ ہے۔دوسری مطلوبہ لغات کی ویب سائٹس تیار کرنے کے لئے اس کے ماڈل سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔(جاری)

☆ کاشف الہدیٰ کے بقول یہ صاحب عمیر خان تھے۔انہوں نے اردو ویب ڈاٹ کام کے نام سے اردو فونٹ کے ساتھ پہلی ویب سائٹ ۱۹۹۷ء میں بنائی تھی،جو جلد ہی بند ہو گئی تھی۔اسی دورانیے میں کاشف الہدیٰ بھی اپنی سائٹ شروع کر چکے تھے۔نسیم امجد نے بھی ۱۹۹۸ء میں الکتاب 1 فونٹ شروع کی تھی لیکن جلد بند کر دی۔تاہم یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ویب سائٹس پر اردو رسم الخط لانے کی ابتدائی جدوجہد کی۔(**حیدر قریشی**)

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

نام لے لے کے رقیبوں کا سیاپا کرنا
اکبر اچھا نہیں ہر روز تماشا کرنا

جب یہ معلوم ہے ملنا نہیں اس کو منظور
کیا ضروری ہے پھر ایسوں کی تمنا کرنا

خواب کیوں دیکھتے جن کی کوئی تعبیر نہیں
جو نہ ہو پائے اسے کس لیے سوچا کرنا

وہ مراسم میں نہیں اس سے تو کس خواہش پر
اس گلی کے درودیوار کو دیکھا کرنا

عشق ہے یا ہیں یہ آغاز جنوں کے آثار
سب کے منہ لگنا ہر اک بات پہ الجھا کرنا

تم نے مانی ہے کبھی بات کسی کی پہلے
اب کے بھی ٹھان کے بیٹھے ہو جو کرنا ۔ کرنا

جیسے مقروض ہو سب عہد تمہارا اکبر
یوں زمانے سے سر عام تقاضا کرنا

اکبر حمیدی

ہم شہر میں یوں رہتے ہیں جیسے نہیں رہتے
جس طرح کسی جیل میں بچے نہیں رہتے؟

ظالم یہی قانون مکافات عمل ہے
ہم سے تو رہا کرتے ہیں تم سے نہیں رہتے

ہم روک نہیں سکتے مگر اتنا بتا دیں
بڑھ جائے جہاں ظلم وہ خطے نہیں رہتے

مغرور نہ ہو زور ستم پر کہ ہمیشہ
اک طرح کے حالات کسی کے نہیں رہتے

ہر روز نیا دن، نیا سورج، نئے منظر
ہم ایک ہی دریا میں اترتے نہیں رہتے

آ پھر انہیں بھولے ہوئے رستوں پہ قدم رکھ
اگ آئے اگر گھاس تو رستے نہیں رہتے

پاؤں میں سدا سائے تھرکتے نہیں اکبر
ماتھے میں سدا چاند چمکتے نہیں رہتے

اکبر حمیدی

کئی برسوں کی خشک سالی ہے
اب مری پیاس بے مثالی ہے

فصل گل سے ہوئی ہے شادی مری
رت خزاں کی شریر سالی ہے

دیکھتے دیکھتے قیامت کی
قامت اس شوخ نے نکالی ہے

پھول پتے بھی کانٹے بھی اس میں
وقت کے ہاتھ میں وہ ڈالی ہے

دیکھنا کیا کہ سب کے ہاتھوں میں
کوئی تصویر بے خیالی ہے

سوچتا ہوں یہ کس کے نام کروں
میرے ہونٹوں میں ایک گالی ہے

رات تو چودھویں کی ہے اکبر
بادلوں کے سبب سے کالی ہے

اکبر حمیدی

زندگی کی اریڑ میں آئے
سانس کیسے تریڑ میں آئے

کیسے کیسے شجر تناور تھے
آندھیوں کی اکھیڑ میں آئے

دیدنی ہے وہ پہلا موسم گل
رنگ بھرنے جو پیڑ میں آئے

وہی تو وقت ہوتا ہے موزوں
جب حسیں کوئی چھیڑ میں آئے

سوچتا ہوں کہ وہ وچھیری بھی
ایک دن میری ایڑ میں آئے

جیسا اس کو کسی نے سوچا ہو
جو کسی کے گویڑ میں آئے

ہم ہیں موقع کے منتظر اکبر
دیکھئے کب وہ گیڑ میں آئے

اکبر حمیدی

زندگی کوئی حسب حال نہیں
ایسی اس دلربا کی چال نہیں

عشق وابستہ رہنے کا ہے نام
ٹوٹ جانا کوئی کمال نہیں

کتنا سنسان ہوتا جاتا ہے
راستہ ہے، ترا خیال نہیں

تو حقیقت ہے میں صداقت ہوں
کوئی دنیائے امتثال نہیں

خوشیاں ہر سطح پر میسر ہیں
کم نصیبی کا روگ پال نہیں

اک ترا حسن لازوال ہوا
ورنہ کس چیز کو زوال نہیں

وقت تبدیل ہوتا ہے اکبر
اپنا بھی پہلے جیسا حال نہیں

اکبر حمیدی

غم سے اسی لیے تو رہائی نہ ہو سکی
دشمن تھا اس سے صلح صفائی نہ ہو سکی

ہر جانے والی چیز نشاں چھوڑ جاتی ہے
جو آ ملا پھر اس سے جدائی نہ ہو سکی

سب چہروں میں تھے کچھ نہ کچھ آثار دوستی
اغیار کی بھی ہم سے برائی نہ ہو سکی

اس کو نصیب دوستاں ہم کہہ کے چھوڑ آئے
جس شاخ گل تک اپنی رسائی نہ ہو سکی

کچھ رہنما عجیب تھے کچھ راہرو عجیب
دونوں سے راستوں کی بھلائی نہ ہو سکی

ان موسموں میں لکھتے رہے خط کسی کے نام
جن موسموں میں نغمہ سرائی نہ ہو سکی

اب کے برس بھی مندا رہا کاروبار شوق
اب کے برس بھی کوئی کمائی نہ ہو سکی

اکبر اگرچہ بدلے نہ حالات دشت کے
ہم سے تو ترک آبلہ پائی نہ ہو سکی

اکبر حمیدی

دیکھنے کو کوئی تیار نہیں ہے بھائی
دشت بھی بے درودیوار نہیں ہے بھائی

ایسا بھی صدق و صفا کا نہیں دعویٰ ہم کو
زندگی شیخ کی دستار نہیں ہے بھائی

پاکبازوں کی یہ بستی ہے فرشتوں کا نگر
کوئی اس شہر میں میخوار نہیں ہے بھائی

جان پیاری ہے تو بس چلتے چلے جاؤ میاں
کیوں کھڑے ہو یہ در یار نہیں ہے بھائی

جس قدر تھے وہ ہوئے اللہ کو پیارے کل شب
کوئی اب عشق کا بیمار نہیں ہے بھائی

عشق کرنا ہے تو چھٹی نہیں کرنی کوئی
عشق میں ایک بھی اتوار نہیں ہے بھائی

آپ نے بھی تو کیا ہو گا کچھ اکبر ورنہ
ایسی اس شوخ کی گفتار نہیں ہے بھائی

اکبر حمیدی

مولا پانی دے
برکھا پانی دے
سوکھے ہونٹوں کو
سونا پانی دے
سونی نہروں کو
دریا پانی دے
اجڑے کھیتوں کو
دانہ پانی دے
جلتے جسموں کو
ٹھنڈا پانی دے
اس کی قربت کا
میٹھا پانی دے
میں اور وہ نہلائیں
ایسا پانی دے
کالے پانی کو
کالا پانی دے

صفدر ہمدانی (لندن)

حقیقتوں کے مماثل مجاز کرتا نہیں
میں بے جواز کبھی اعتراض کرتا نہیں

مجھے خبر ہے مقدر کے استعارے کی
میں اپنے دستِ طلب کو دراز کرتا نہیں

ہر ایک غیر سے کہتا ہے وصف سارے مرے
مگر وہ شخص کہ خود مجھ پہ ناز کرتا نہیں

کچھ ایسے لفظ ہیں جو لوحِ دل پہ لکھتا ہوں
ہر ایک شعر سپردِ بیاض کرتا نہیں

اِک آئینہ سا مرے رو برو جو رہتا ہے
میں راز دار سے راز و نیاز کرتا نہیں

جو دل نہ چاہے تو جھکتی نہیں جبیں میری
گناہ گار ہوں رشکِ نماز کرتا نہیں

شبِ سیاہ کو صفدؔر شبِ سیاہ کہا
میں بے لحاظ خود اپنا لحاظ کرتا نہیں

صفدر ہمدانی (لندن)

گلستاں در گلستاں اب باغباں کوئی نہیں
پھول سب تنہا کھڑے ہیں تتلیاں کوئی نہیں
دھوپ اچھی لگ رہی ہے آج کتنے دن کے بعد
بادلوں کا دور تک نام و نشاں کوئی نہیں
خشک لکڑی کی طرح سے جل گئے سارے مکاں
یہ عجب کہ ساری بستی میں دھواں کوئی نہیں
نام کیا دے گا کوئی ان بے سبب حالات کو
مہرباں سارے ہیں لیکن مہرباں کوئی نہیں
اپنے گھر سے دور رہ کر ہر قدم ہے امتحاں
کون کہتا ہے یہاں پر امتحاں کوئی نہیں
اُس نے اپنے شوق سے دستِ دعا کٹوا دیئے
اُس کے چہرے پر لکھی اب داستاں کوئی نہیں
رات کی جھیلوں میں اُترے گی کہاں سے چاندنی
ہم سیاہ بختوں کو بھی ایسا گماں کوئی نہیں
کیا خبر کیا ہو گیا ہے اُس معمر شخص کو
دن ڈھلے جنگل سے چُنتا لکڑیاں کوئی نہیں
اک عجب سا حادثہ دیکھا ہے صفدؔر شہر میں
خشک ہیں سب آشیاں اور بجلیاں کوئی نہیں

صفدر ہمدانی (لندن)

تبدیلیاں ہیں عمر کے جانے کے ساتھ ساتھ
ناراضگی بڑھی ہے منانے کے ساتھ ساتھ

نفرت منافقت سے رہی مجھکو عمر بھر
میں چل سکا نہیں ہوں زمانے کے ساتھ ساتھ

میری مصیبتیں بھی گوارا نہیں اسے
مجھکو رلا رہا ہے ہنسانے کے ساتھ ساتھ

دل میں سلگ رہی ہیں دعاؤں کی مشعلیں
لب ہل رہے ہیں ہاتھ اٹھانے کے ساتھ ساتھ

اس کی ہر ایک بات تو یکسر نہیں غلط
ہیں کچھ حقیقتیں بھی بہانے کے ساتھ ساتھ

میں آشنا ہوں اس کے مزاج و خیال سے
یاد آؤں گا اسے میں بھلانے کے ساتھ ساتھ

صفدؔر عجیب لگتی ہے بستی بسی ہوئی
آتش فشاں کے سرخ دہانے کے ساتھ ساتھ

صفدر ہمدانی

جدھر بھی دیکھیں وہی رویے منافقوں کے
سمجھ میں دکھ ہم کو آ رہے ہیں پیمبروں کے

کھلی ہوئی ہیں جو کھڑکیاں وہ بھی ادھ کھلی ہیں
نہ جانے کب سے ہیں در مقفل یہاں گھروں کے

انا مری ہے ابھی بھی ہر مصلحت پہ حاوی
لہو میں اترے ہیں تجربے سب مسافتوں کے

نا آشنا ہے ہر ایک شاخِ شجر ثمر سے
درخت سارے ڈسے ہوئے ہیں یاں بارشوں کے

عجب تغیر پسند اسکی ہوئی ہے عادت
بدلتے رہتے ہیں روز معیار چاہتوں کے

یہاں بھی شاید کبھی کوئی شہر آشنا تھا
نشاں ملے ہیں ہماری بستی میں مقبروں کے

اُگی ہے فصلِ نجات جیسے خزاں میں صفدؔر
یوں سر بریدہ بدن پڑے ہیں مسافروں کے

صفدر ہمدانی

نہاں ہو کے بھی میں ظاہر رہوں گا
تری ہر سوچ کا محور رہوں گا

میں اب محصور کر ڈالوں گا خود کو
مثالِ خانہء بے در رہوں گا

تمہارے ساتھ اب رہنا ہے مشکل
میں اپنی ذات کے اندر رہوں گا

بچھڑ کے بھی رہیں گے ساتھ دونوں
تو میرا میں ترا پیکر رہوں گا

مجھے بے بال و پر گردانا مت
میں تنہا ہی سہی لشکر رہوں گا

ستارہ اب کوئی آنگن میں اترے
اسی اُمید پہ اب گھر رہوں گا

زمانہ جو بھی چاہے نام دے دے
میں صفدؔر ہوں میں بس صفدؔر رہوں گا

صفدر ہمدانی

لکھے گا وقت ہواؤں پہ انکشاف مرے
گناہ سب تو نہیں قابلِ معاف مرے

میں تیرگی کو کبھی روشنی نہیں کہتا
ہر عہد کی ہے ہوا اس لیئے خلاف مرے

پرائے لوگوں سے کیا لیں سماعتوں کی دلیل
مرے گواہ بنے ہیں خود اعتراف مرے

پڑا ہے وقت تو آنکھوں سے ہو گیا اوجھل
وہ عمر بھر کو جو کرتا رہا طواف مرے

فقط تمہیں سے نہیں ہے یہ اختلاف مرا
خود اپنے ساتھ بھی صفدر ہیں اختلاف مرے

صفدر ہمدانی

محبت اب عداوت لگ رہی ہے
بڑی مشکل میں قدرت لگ رہی ہے

فقیہِ شہر تو خود پُر سکوں ہے
مگر سولی پہ اُمت لگ رہی ہے

تمہارے قتل سے لگتا ہے ایسے
مرے سر کی بھی قیمت لگ رہی ہے

فضاؤں میں لہو کی بو بسی ہے
بہت بے چین فطرت لگ رہی ہے

میں اپنے عہدِ نو کی کربلا ہوں
مرے خوں میں شہادت لگ رہی ہے

مقدر سو رہا ہے خاک اوڑھے
زمینِ سخت راحت لگ رہی ہے

فصیلِ شہر پر تو روشنی ہے
مگر داؤ پہ عزت لگ رہی ہے

میں اپنے ملک میں آیا ہوں جب سے
عجب بے چین صورت لگ رہی ہے

منڈیروں پر کہیں چڑیاں نہیں ہیں
عجب اس گھر کی حالت لگ رہی ہے

زمیں میں نفرتیں بوئی گئی ہیں
ہری شاخوں پہ تہمت لگ رہی ہے

سکوں میں ہیں منافق شہر بھر کے
ہمیں یہ سانس ذلت لگ رہی ہے

وہاں مصروفیت تھی چار جانب
یہاں فرصت ہی فرصت لگ رہی ہے

رکے یہ قافلۂ جاں کہیں پہ
بے معنی اب مسافت لگ رہی ہے

میں اپنے آپ کو غرقاب کر دوں
بچاؤ کی یہ صورت لگ رہی ہے

خدایا مشکلیں آسان کر دے
مجھے گھر میں بھی وحشت لگ رہی ہے

وہاں بے چین ہے وہ کل سے صفدؔر
اسے میری ضرورت لگ رہی ہے

ناصر زیدی (اسلام آباد)

برتراز مرحلۂ سودو زیاں رہتی ہے
دل جواں ہو تو محبت بھی جواں رہتی ہے

ایک مدت سے میں بھولا ہوں ادھر کا رستہ
جس گلی میں وہ مری دشمن جاں رہتی ہے

ان کے ملنے سے بھی کب بجھی ہے سینے کی جلن
ماورائے تپش وہم و گماں رہتی ہے

آپ نے حال جو پوچھا ہے تو اب سوچ میں ہوں
اس قدر اپنی خبر مجھ کو کہاں رہتی ہے؟

ایک ہستی ہے جو دیتی ہے سہارا پیہم
وہ جو ہر دم مرے نزد رگ جاں رہتی ہے

اس سے انسان کی فطرت کا کریں اندازہ
یہ کسی حال میں ہو حرص جواں رہتی ہے

کون کرتا ہے غم عشق کو ظاہر ناصر؟
یہ کسک خانہ دل میں ہی نہاں رہتی ہے

ناصر زیدی

اس سراپا شباب کی آنکھیں
جیسے ہوں محوخواب کی آنکھیں
ایسا نشہ ہے ان کی انکھوں میں
جیسے مست شراب کی آنکھیں
اک تو دل ہے ہمارا بے قابو
اس پہ آفت جناب کی آنکھیں
حال پر ہیں ہمارے مدت سے
اک مسلسل عتاب کی آنکھیں
میری آنکھیں ہیں آئینہ دل کا
ان کی آنکھیں حجاب کی آنکھیں
غیر تو غیر ہی ہیں کیا شکوہ
ہاں مگر آں جناب کی آنکھیں
کب کوئی شخص دیکھ سکتا ہے؟
کسی عزت مآب کی آنکھیں
کس نے دیکھی ہیں کون دیکھے گا
محتسب کے عذاب کی آنکھیں
ہم نے محسوس کی ہیں اے ناصرؔ!
کرم بے حساب کی آنکھیں

ناصر زیدی

مجھ کو اپنی طرح کا لگتا ہے
ویسے تو آدمی وہ اچھا ہے

گویا تم بے قصور ہو بالکل
پوچھتے ہو مزاج کیسا ہے؟

لوگ جو بھی کہیں مگر یارو!
میں ہوں اس کا وہ صرف میرا ہے

دل کو ہر دم جوان رکھتا ہوں
یہ مری عمر کا تقاضا ہے

مجھ کو تسخیر کر نہیں سکتا
میرا دشمن بہت توانا ہے

ہو کبھی سر بلند، ناممکن
دل میں اپنے حسد جو رکھتا ہے

داد ناصرؔ کو دے کوئی کہ نہ دے
شعر گوئی میں تو وہ یکتا ہے

ناصر زیدی

کرو نہ بات مگر نامہ و پیام تو لو
کبھی کبھی نگہہ شوق کا سلام تو لو

ہے کون میری طرح تم کو چاہنے والا
مثال کے لئے بس ایک آدھ نام تو لو

اگرچہ پینا پلانا ہے ناروا پھر بھی
مئے خلوص و محبت کا ایک جام تو لو

خراب حال ہوں ہو جائے اک نگاہ کرم
تم اپنی چشم فسوں گر سے کوئی کام تو لو

مجھے تعلق خاطر میں ہر سزا ہے قبول
تم اپنے آپ پہ تہمت بہ رنگ عام تو لو

بلندیوں پہ تھا جب تک تمہارا ساتھ رہا
میں گر رہا ہوں مجھے آ کے پھر سے تھام تو لو

ہے شاعری میں نہاں شخصیت بھی ناصرؔ کی
دو گو نہ لطف کو مجموعہ کلام تو لو!

ناصر زیدی

چین پڑتا نہیں مجھ کو تجھ بن
رات کٹتی ہے تو تارے گن گن

آنسوؤں کی ہے جھڑی اور میں ہوں
اچھی لگتی نہیں کن من کن من

ایک ہی شکل تصور میں رہے
صبح ہو شام ہو یا رات کہ دن

مجھ سے ہے ایک زمانہ مرعوب
ترے انداز کا پر تو تراسن

دیو قامت بھی ہیں بونے یکسر
شعر گوئی میں ہے ناصرؔ کوئی جن

ماہ پارہ صفدر (لندن)

(ماہ پارہ صفدر کم وبیش ۱۵ برس کے بعد پھر سے ادبی رسائل میں چھپنے لگی ہیں۔ان کی ادبی زندگی کے اس نئے دور میں ان کی غزلیں سب سے پہلے 'جدید ادب' شائع کررہا ہے۔**ریحانہ احمد**)

ساتھ ہے اسکا سُر کی دنیا ساتھی ہے آواز
ہم نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھی ہے آواز

کاش تمہارے دل میں بھی اک ساتھ اُتر جاتی
میری سوچ کے دریا سے جو اٹھی ہے آواز

جنگل جنگل پھیل رہی ہوتی ہے اِک خوشبو
نرم ملائم جھیلوں میں جب اُگتی ہے آواز

اس سے میرا رشتہ سب رشتوں سے بڑھ کر ہے
میں تو تھک کر سو جاتی ہوں جاگتی ہے آواز

یہ تو سچ ہے ماہ پارہؔ میں بول نہیں سکتی
لیکن میرا پیچھا کرتی رہتی ہے آواز

ماہ پارہ صفدر

رنجشیں اتنی بڑھیں کہ قربتیں گُم ہو گئیں
چلتے چلتے راستے میں منزلیں گُم ہو گئیں

برف کی سِل کی طرح سے شَل ہوئے جیسے قدم
گونج باقی رہ گئی اور آہٹیں گُم ہو گئیں

اب جو وہ بچھڑا ہے تو دل کا عجب سا حال ہے
رُک رہی ہے سانس جیسے ساعتیں گُم ہو گئیں

اُس سے ملنا جس طرح اک خواب سا لگنے لگا
نفرتوں کے درمیاں سب چاہتیں گُم ہو گئیں

ماہ پارہ صفدر

بے سبب بڑھنے لگی ہے بے رُخی
جان لے گی دیکھنا دل کی لگی

خود سے پوچھوں اپنے گھر کا راستہ
منزلیں لگنے لگی ہیں اجنبی

منزلوں کے درمیاں یہ فاصلے
بات جیسے رہ گئی ہو اَن کہی

تم تو اک پتھر ہو تم کو کیا پتہ
جلتے رہنے میں ہے کتنی چاشنی

خواب جو دیکھے تھے وہ سب کیا ہوئے
کیا ہوئی آنکھوں میں اُتری روشنی

ماہ پارہؔ پارہ پارہ ہے جگر
ٹوٹتی جاتی ہے ڈوری سانس کی

ماہ پارہ صفدر

منزل پہ بھی پہنچ کے اندھیرا دکھائی دے
سالارِ کارواں بھی لٹیرا دکھائی دے

روشن تھا جو بدن میں مثالِ چراغِ شب
وہ آخری چراغ بھی بجھتا دکھائی دے

طغیانیوں سے ٹوٹ سکا کب حصارِ جاں
کچے گھڑے میں زیست کا دریا دکھائی دے

اترے ہیں آ کے شہر میں یہ کون اجنبی
ہر اک چمکتی آنکھ میں چیتا دکھائی دے

جو بھی گیا وہ لوٹ کے آیا نہ پھر کبھی
دریا سے پار کوئی اترتا دکھائی دے

پہنے ہوئے ہے ہر کوئی شیشے کا پیراہن
مجھکو نہ کوئی آنکھ نہ چہرہ دکھائی دے

توڑا حصارِ قرب کو میں نے بہت مگر
ماہ پارہ مجھکو پھر بھی وہ اپنا دکھائی دے

ماہ پارہ صفدر

بیتی رتوں کی آہٹیں اور چند تتلیاں
پتوں کی سرسراہٹیں اور چند تتلیاں

اونچی انا پرست فصیلوں میں قید ہیں
بے نام زرد خواہشیں اور چند تتلیاں

پلکوں پہ محوِ رقص ہیں اسکے خیال میں
اشکوں کی جھلملاہٹیں اور چند تتلیاں

کہنے کو بے ثمر تھا وہ موسم مگر مجھے
دے کر گیا ہے چاہتیں اور چند تتلیاں

پھر منجمد وجود کو پگھلا رہی ہیں آج
موسم کی سرد بارشیں اور چند تتلیاں

آ کر فصیلِ شہر سے باہر رکا ہے جو
لایا ہے کچھ شکایتیں اور چند تتلیاں

ماہ پارہ اسکی یاد میں باقی بچی ہیں اب
قربت کی چند ساعتیں اور چند تتلیاں

نذیر فتح پوری (پونہ)

کیوں آئینے میں جرأتِ تشکیل بھی نہیں
اب میں نہیں تو کیا مری تمثیل بھی نہیں

ہم اپنی آبرو کے محافظ ضرور ہیں
لیکن گوارا غیر کی تذلیل بھی نہیں

پامال ہو رہی ہیں مقدس نشانیاں
ظالم کے سر پہ خوفِ ابابیل بھی نہیں

ایسا نہیں کہ قافلے پیاسے نہیں مگر
جنگل میں دور دور کوئی جھیل بھی نہیں

ہم ہس پہ اپنے خواب کی تختی لگا سکیں
دیوارِ کائنات میں وہ کیل بھی نہیں

مانوس ہو چکے ہو اندھیروں سے یوں نذیر
اب تو تمہارے ہاتھ میں قندیل بھی نہیں

نذیر فتح پوری

ہر راز زندگی کا وہ مکشوف کر گیا
خود تو چلا گیا مجھے مصروف کر گیا

سورج گیا تو روشنی موقوف کر گیا
دن کو اندھیری رات میں ملفوف کر گیا

بستی سے جب بھی گزرا کسی شہر کا جلوس
ہر آدمی کے ذہن کو ماؤف کر گیا

دیوانہ چند لمحوں کو آ کر گیا مگر
بستی کے بچے بچے کو مصروف کر گیا

ایسا گیا نذیر بچھڑ کر وہ ہمسفر
خود مجھ کو میری ذات سے محزوف کر گیا

نذیر فتح پوری

اک ایک حرف سے تحریر ہو رہا ہوں میں
عجیب کرب کی تصویر ہو رہا ہوں میں

جسے بھی دیکھو وہ تقسیم چاہتا ہے مری
یہ کیسے حرف کی جاگیر ہو رہا ہوں میں

خود اپنے آپ ہی روکے ہیں راستے اپنے
خود اپنے پیروں کی زنجیر ہو رہا ہوں میں

یہ کیسے ''نیندہولے'' ہیں میری آنکھوں میں
یہ کیسے خواب کی تعبیر ہو رہا ہوں میں

نذیؔر جن کا سنورنا محال ہے شاید
اب ایسے لوگوں کی تقدیر ہو رہا ہوں میں

نذیر فتح پوری

بھگوئے گا کیا تشنہ منظر میاں
کہ پیاسا ہے خود ہی سمندر میاں

جہاں حکمراں تھے اجالے کبھی
اندھیروں کے در آئے لشکر میاں

ہمیں بھی بہت خوف ہے دھوپ سے
ہمارا بھی ہے برف کا گھر میاں

یہ کیا پیٹھ پر زخم دیتے ہو تم
کرو وار سینے پہ کھل کر میاں

یہ باہر کی آبادیاں کیا کریں
ہیں ویرانیاں دل کے اندر میاں

نذیؔر اب ذرا ضبط سے کام لو
بہت رو چکے آج کھل کر میاں

نذیر فتح پوری

یوں سفر کا کوئی سلسلہ تو چلے
میں اگر رُک گیا ،دوسرا تو چلے

پیڑ سے تم پرندے اڑا تو چلے
اور تہمت ہوا پر لگا تو چلے

دوریاں ایک دن ختم ہو جائیں گی
کچھ ملاقات کا سلسلہ تو چلے

دیکھئے کون سیراب ہوتا ہے اب
ہم سخن کا سمندر بہا تو چلے

اور کیا کام آتی ہماری صدا
شہر سویا ہوا تھا جگا تو چلے

اس صدی میں تو یہ بھی بہت ہے نذیؔر
ہم صلیب اپنی اپنی اٹھا تو چلے

اسلم بدر (جمشید پور)

تری ہی مثل رہے بے مثال کیا کرتے
اب اور تیرے کھلونے کمال کیا کرتے

یہیں سے تیز ہواؤں کو بھی گزرنا تھا
چراغِ راہ تھے فکرِ مآل کیا کرتے

مری ہی ذات میں گُم کچھ سوالیہ چہرے
میں لا جواب تھا، مجھ سے سوال کیا کرتے

اُتر رہا تھا خود اُن پر ہر اک کرن کا عذاب
مرے اُجالے مری دیکھ بھال کیا کرتے

خیال میں تھا سمندر، نظر میں رقصِ سراب
تھکن سے چُور بدن تھے، دھمال کیا کرتے

اُنہیں پلٹ کے مری شب میں پھر سے آنا تھا
بچھڑ کے خواب سے اپنے ملال کیا کرتے

ترا ہی جال تھی دنیا بھی، ہم اُلجھتے رہے
تری گرفت میں تھے قیل و قال کیا کرتے

خود اپنے حال سے ہم بے خبر رہے اسلؔم
تو پھر زمانے سے ہم عرضِ حال کیا کرتے

اسلم بدر

آرزو پیکر و اصنام سے خالی نکلی
میں نے حسرت بھی نکالی تو خیالی نکلی

جبرِ تقدیر سے ڈر جاتے تو مر ہی جاتے
جب جینے کی کوئی راہ نکالی، نکلی

تیری تصویر بنے گی تو یقیں ٹوٹے گا
ہر یقیں کی یہاں تصویر زوالی نکلی

آج سورج بھی دیا ہاتھ میں لے کر نکلا
کوچۂ شب سے سحر بھی مری کالی نکلی

اجنبی شہر میں اک دشتِ تمنّا کے کر
کاسۂ چشم سے بینائی سوالی نکلی

تیری ٹوٹی ہوئی پازیب کے گھنگھرو تارے
دامنِ شب سے ترے کان کی بالی نکلی

اسلم بدر

پلٹ کے راستے سارے سما گئے مجھ میں
خیال میرے مسافر تھے ، آگئے مجھ میں

تمام دشت و دمن میں کھلے نظر کے گلاب
نفس نفس تری خوشبو بسا گئے مجھ میں

سراب میں بھی رہی جستجوئے سیرابی
اُبل کے ریت سے دریا سما گئے مجھ میں

وفورِ غم میں صبا سی کسی کی یاد چلی
لبوں کے پھول سے کچھ مسکرا گئے مجھ میں

تمام عمر نہ منظر کُھلے نہ در ہی کُھلا
نظارے ایسے دریچے سجا گئے مجھ میں

بجھا سکے تو بجھا لے ، ہوائے نقد و نظر
چراغِ فن مرے طوفاں جلا گئے مجھ میں

وہ کیسی ضربِ صدائے ملنگ تھی اسلم
وہ شور اُٹھا کہ سنّاٹے چھا گئے مجھ میں

اسلم بدر

کچھ فکر میری حلقۂ احسان میں بھی ہے
کچھ روشنائی میرے قلمدان میں بھی ہے

وہ بات جس کی چوٹ سے زخمی ہیں میرے شعر
وہ خاص بات میؔر کے دیوان میں بھی ہے

دھندلا گئے ہیں راستے لیکن سفر کی سمت
بھولے ہوئے سبق کی طرح دھیان میں بھی ہے

وہ لمحہ جس کی یاد سے دل ڈولنے لگے
آنسو میں بھی ہے، خون کے ہیجان میں بھی ہے

میرے گناہ اتنے زیادہ کبھی نہ تھے
پاسنگ کچھ نہ کچھ تری میزان میں بھی ہے

آہٹ سی آتی رہتی ہے ہر آن بے قدم
موجود لا مکانیت ، امکان میں بھی ہے

حیرت سے دیکھتا ہے مجھے میرا آئینہ
الجھن مجھے،خود اپنی ہی پہچان میں بھی ہے

اسلم بدر

اپنے جمود میں تھا مگن جھومتا رہا
سر کٹ کے گر چُکا تھا بدن جھومتا رہا

بکھرا ہُوا تھا شعر کی صورت ترا خیال
عالم تھا ، مبتلائے سخن جھومتا رہا

لفظوں علامتوں کی نئی بوتلوں میں بند
پی جس نے بھی شرابِ کہن ، جھومتا رہا

وہ خوشبوئے خیال کہ نافِ غزل میں تھی
دشت و دمن میں مست ہرن جھومتا رہا

مربوط اس طرح سے ہے تنظیمِ کائنات
سرسوں کِھلی زمیں پہ ، گگن جھومتا رہاا

آئے سپیرے، بین بجا کر چلے گئے
دہشت کا ناگ کاڑھ کے پھن ، جھومتا رہا

اسلم بدر

ہمارے خواب بھی کب اپنے گھر میں رہتے ہیں
کسی کی شب میں کسی کی سحر میں رہتے ہیں

عجیب بے خبری تھی تباہ ہونے تک
پناہ گاہوں میں اب ہیں ، خبر میں رہتے ہیں

سمیٹ لے گی ہمیں، منزلِ خود آگاہی
ابھی تو گردِ سفر ہیں ، سفر میں رہتے ہیں

یہ اور بات کہ دروازہ میں نے کھولا تھا
مرے سوا بھی کئی لوگ گھر میں رہتے ہیں

ہیں رہگزار پہ روشن ہزارہا شمعیں
تو پھر یہ کیسے دھُندھلکے نظر میں رہتے ہیں

نئی فضاؤں میں اُڑتے تو ہیں ضرور ، مگر
وہی پُرانے ہنر ، بال و پر میں رہتے ہیں

میں اُن کی یاد کو سیراب کرتا رہتا ہوں
فرات والے مری چشمِ تر میں رہتے ہیں

اسلم بدر

تیرے ہونے کی طرف دھیان تو ہے
میرا ہونا ، تری پہچان تو ہے
یاد ہے اُس کو سراپا میرا
وہ مجھے دیکھ کے حیران تو ہے
اک دیا طاق پہ ہے اِس گھر میں
اور کچھ ہو نہ ہو ، ایمان تو ہے
ہم تو سیلانیء صحرا ٹھہرے
جل چکا شہر ، بیابان تو ہے
رات بھی مجھ کو گوارہ ہے ، کہ وہ
میرے خوابوں سے پریشان تو ہے
اُکھڑی اُکھڑی ہیں ہوائیں میری
مجھ سے لپٹا مرا طوفان تو ہے
موجِ خوں میں ہے اُسی کی دھڑکن
مجھ میں میرا وہ نگہبان تو ہے
برف آنکھوں میں پگھلتی دیکھی
رُت بدل جانے کا ، اِمکان تو ہے
توڑ لوں کیسے تعلق اُس سے
میرے قصّے کا وہ عنوان تو ہے

جواز جعفری (لاہور)

جگر کو خون کیئے، آنکھ میں روانی لیئے
اداس پھرتا ہوں ، چہرے پہ رایئگانی لیئے

ہوا ہے شہر پہ قابض میرا عدو اور میں
بھٹکتا پھرتا ہوں جنگل میں راجدھانی لیئے

اُجڑنے والی تھی وہ داستاں سرائے، کہ پھر
پہنچ گیا میں وہاں اک نئی کہانی لیئے

اسیرِ رزق و مکاں ! بام سے کبھی مجھے دیکھ
میں تیرے کوچے میں پھرتا ہوں زندگانی لیئے

عدوُ کے نرغے میں ، دانتوں سے تھامے مشکیزہ
یہ کون ہے جو چلا آ رہا ہے پانی لیئے؟

جمالِ دیرنما ! برف ہو گئے مرے بال
کبھی میں آیا تھا اس شہر میں جوانی لیئے

جوازؔ میں تو ازل سے اسیرِ خاک ہوں اور
یہ کائنات ہے دامن میں بیکرانی لیئے

جواز جعفری

خواب کو گھول کے اشکوں میں ،بنائی ہوئی ہے
ایک تصویر جو آنکھوں میں سجائی ہوئی ہے

مہکی مہکی ہوئی آتی ہے سرِ شام ہوا
تازہ تازہ کہیں پھولوں کی چُنائی ہوئی ہے

مجھ سے کترا کے گزر ، قافلہء رنگِ بہار
کہ جنوں خیزی مری رنگ پہ آئی ہوئی ہے

ا
س لئے آنکھ بھر آئی ہے کہ مجھ کو یہ کتھا
مرے بچپن میں ، مری ماں نے سنائی ہوئی ہے

پھر سرِشام بدلنے لگا موسم کا مزاج
جانتا ہے، مری فصلوں کی کٹائی ہوئی ہے

ا
سی مدفن سے ملے گا مرے ماضی کا سراغ
جس کھنڈر کی ابھی دو ہاتھ کھدائی ہوئی ہے

ایک دن آئیں گے تعبیر کے پھل پھول جوازؔ
قلمِ خواب ، سرِچشم لگائی ہوئی ہے

جواز جعفری

فلک پہ گونج رہی ہے مری صدا کوئی ہے؟
مرے علاوہ بھی اس دہر میں بتا کوئی ہے؟

ترے ابد کے مضافات سے گزرتا ہوا
یہیں کہیں مری دنیا میں راستہ، کوئی ہے

بغیر اس کے مری راکھ بُجھنے لگتی ہے
کھلا کہ میرا بھی سورج سے واسطہ، کوئی ہے

سماعتوں پہ کب اترے گا اسکی چاپ کا رزق؟
میں کیوں جہاں میں اکیلا ہوں گر مرا کوئی ہے؟

ٹھہر سکی نہ کسی ایک چاک پر مری خاک
سو میرے پیشِ نظر اب بھی مرحلہ کوئی ہے

اکیلا کب ہے سرِ ریگ زار میرا جنوں
نواحِ جاں میں کہیں اور قافلہ کوئی ہے

جوازؔ آنکھ میں ٹُوٹا جو خواب کا کانٹا
کھلا کہ میرے تعاقب میں رتجگا کوئی ہے

جواز جعفری

وہ رو رہا تھا پسِ چشم، مجھ کو کھوتے ہوئے
کہ میرا ہو نہ سکا وہ کسی کا ہوتے ہوئے

ہوائے تیرہ شبی کاٹنے کو آتی ہے
میں تار تار ہوا روشنی کو بوتے ہوئے

کھلا ہوا تھا کسی چشمِ تر میں خواب اس کا
سو جاگ اٹھتا تھا وہ میرے ساتھ سوتے ہوئے

ترس رہا ہوں کسی نخلِ غم کے سائے کو
کہ تھک گیا ہوں میں بارِ نشاط ڈھوتے ہوئے

تمہارے بعد، اِنہیں رزقِ خاک ہونا ہے
یہ میرے آنسو، تری آستیں بھگوتے ہوئے

ہوا پرانا جوازؔ آسمان کا چولا
سو پھٹ نہ جائے کہیں بار بار دھوتے ہوئے

جواز جعفری

اُس کے گھر کا پتہ، تبدیل بھی ہو سکتا ہے
دو قدم فاصلہ، دو میل بھی ہو سکتا ہے

روک رکھا ہے جو آنسو، پسِ مژگاں، ہم نے
وہ اگر چاہیں تو ترسیل بھی ہو سکتا ہے

فاختاؤں کے تعاقب میں یہاں آ تو گئے
یہ نگر، شہرِ ابابیل بھی ہو سکتا ہے

شدتِ کار کے موسم میں معاً تیرا وُرُود
شہر میں باعثِ تعطیل بھی ہو سکتا ہے

عین ممکن ہے وہ دشنام پہ خلعت دے دے
حرفِ ناگفتہ رکے فیل بھی ہو سکتا ہے

فیصلہ، شہرِ محبت سے چلے جانے کا
آخری وقت میں تبدیل بھی ہو سکتا ہے

اسقدر شاد نہ ہو اِتنی پزیرائی سے
ترے ماں جایوں میں قابیل بھی ہو سکتا ہے

جواز جعفری

پلٹ کے آؤں گا اور ترا ہدف رہوں گا
میں اپنے منصب سے کب تلک برطرف رہوں گا

میں حرفِ زندہ، دلوں سے ہونٹوں تک آ گیا ہوں
ترے نصابوں سے کب تلک میں حذف رہوں گا

مجھے بہرحال اُس کا رستہ اُجالنا ہے
بجھے گا سورج تو میں ستارہ بکف رہوں گا

اُدھر سے کوئی ستارہ مجھ کو بُلا رہا ہے
میں کب تلک آسمان کے اِس طرف رہوں گا؟

میں فاختاؤں کی فوج کا آخری علمدار
سو تیرے لشکر کے سامنے صف بہ صف رہوں گا

کوئی بُلاوا کہ میں زمیں کی کشش سے نکلوں
یہاں رہا تو اسیرِ شام و نجف رہوں گا

جوازؔ میرے بدن میں پنچھی سے اڑ رہے ہیں
میں اور کتنے دنوں یونہی زیرِ کف رہوں گا

جواز جعفری

ترے پہلو میں لے آئی بچھڑ جانے کی خواہش
کہ گل کو شاخ تک لاتی ہے جھڑ جانے کی خواہش

تمھیں بسنے نہیں دیتا ہے بربادی کا دھڑکا
ہمیں آباد رکھتی ہے اُجڑ جانے کی خواہش

کسی کمزور لمحے میں ہمیں گرنے سے پہلے!
اُٹھا لیتی ہے تیرے پاؤں پڑ جانے کی خواہش

ہمیں اس کھال کی کھڑکی سے باہر کودنا ہے
کہاں تک روک پائے گی اُدھڑ جانے کی خواہش

خلاء میں جو ستاروں کے غبارے اُڑ رہے ہیں
انہیں پھیلائے رکھتی ہے سکڑ جانے کی خواہش

کہاں تک دیکھتے ہیں، آسماں کی وسعتوں میں
اُڑاتی ہے ہمیں مٹی میں گڑ جانے کی خواہش

جواز جعفری

اب کے میدان رہا لشکرِ اغیار کے ہاتھ
گروی اُس پار پڑے تھے مرے سالار کے ہاتھ

سایہ سوزی میں تو ہم لوگ تھے سورج کے حلیف
اب ہدف ٹھہرے کہ جب جل گئے اشجار کے ہاتھ

ذہن اس خوف سے ہونے لگے بنجر کہ یہاں
اچھی تخلیق پہ کٹ جاتے ہیں معمار کے ہاتھ

اب سرِ قریہء بے دست، پڑا ہے کشکول
روز کٹ جاتے تھے اِس شہر میں دو چار کے ہاتھ

لُوٹ کچھ ایسی مچی شہر کا در کھلتے ہی
ہر طرف سے نکل آئے در و دیوار کے ہاتھ

ہم سرِ شاخِ سناں قریہ بہ قریہ مہکے
ہم نے اس جنگ میں سر جیت لیے ہار کے ہاتھ

شگفتہ الطاف (بہاولپور)

پھر گلاب کا موسم اس کی ترجمانی ہے
پھر وہی محبت ہے پھر وہی کہانی ہے

فیصلوں کے لمحوں میں یاد ہی نہیں ہم کو
کس نے سر جھکایا تھا کس نے ہار مانی ہے

شجرۂ محبت سے نسبتیں نہیں مانگیں
ہم نے اس صحیفے میں دل کی بات مانی ہے

اختیار کو اس کے جبر کا بدل سمجھوں
یہ بھی تو بغاوت ہے یہ بھی بد گمانی ہے

اب تو اس کی آنکھوں میں اپنا گھر بنائیں گے
اب یہی محبت میں ہم نے بات ٹھانی ہے

منفرد تناسب ہے آج موسم گل میں
سرخ سرخ ہونٹوں پر بات دھانی دھانی ہے

منحرف طبیعت ہے چاہے جو کہے لیکن
پھول بھیج دینے کی ایک ہی کہانی ہے

تختِ بادشاہی سے حلقہء اسیری تک
وہ اتر کے آیا ہے اس کی مہربانی ہے

شگفتہ الطاف

غزل کا بانکپن ترتیب دے گا
سخن موج سخن ترتیب دے گا
عجب ضد ہے کہ کھلتی دھوپ میں وہ
ستاروں کا بدن ترتیب دے گا
نہ چاہوں بھی تو ان آنکھوں کا موسم
مرے دل کی چبھن ترتیب دے گا
مسیحا ہے تو بے جا موسموں میں
تنفس کی پون ترتیب دے گا
ہوائے شام کا مخمور جھونکا
گلابوں پر تھکن ترتیب دے گا
محبت کا جنوں حد سے بڑھا تو
کئی دار و رسن ترتیب دے گا
مرے الہامی ہاتھوں پر وہ اک دن
لبوں کے دو رتن ترتیب دے گا
گلابوں کے کوئی گہنے اٹھائے
خیالوں میں دلھن ترتیب دے گا
وہ میرے برف سے ہر فیصلے پر
بغاوت کی کرن ترتیب دے گا

شگفتہ الطاف

کوئی جو دل سے تمہارے سوا گزر جائے
خدا کرے کہ یہاں کربلا گزر جائے

ہمارے گھر میں نہ اترے تمہارے ہجر کا چاند
دعا کرو کہ کوئی معجزہ گزر جائے

چمک رہا ہے کسی نور سے دعا کا بدن
کہ جیسے دست حنا سے خدا گزر جائے

بلاجواز ہی اک دوسرے کو پالیں اگر
تو ایک عمر کی پل میں سزا گزر جائے

تمہارے قصر محبت کی سرحدوں سے کبھی
مجال ہے کہ کوئی دوسرا گزر جائے

جب اس کو چھوڑ دیا ہے تو پھر ہے کیسا خیال
گلی سے چاہے کوئی بار ہا گزر جائے

شگفتہ الطاف

شکستگی کے عذاب میں ہوں
میں موسم احتساب میں ہوں
مرے قبیلے کے چہرے گم ہیں
یا میں ہی دشت سراب میں ہوں
رفاقتوں سے ہے منحرف دل
بدن کے کس انقلاب میں ہوں
پس نظر جب سے پڑھنا سیکھا
شعور کے اضطراب میں ہوں
زمیں سے میرا نسب ہے لیکن
ستارہ گر کے حساب میں ہوں
اسے گنوا کر یقین ٹھہرا
خطاؤں کے ارتکاب میں ہوں
کتابوں کے لفظ مٹ چکے ہیں
مگر میں حرف نصاب میں ہوں
اب اپنی نسبت بھی سونپ مجھ کو
اگر ترے انتخاب میں ہوں
ستارہ سا ہاتھ کیا لگا ہے
کہ میں شب ماہتاب میں ہوں

پروفیسر آفاق صدیقی (کراچی)

پرسش غم کو پھر آجانا تازہ دم ہوجانے دو
کوری آنکھوں رات کٹی ہے جاؤ اب سو جانے دو

تم کیوں اپنے عیش وطرب کو تج دینے کی بات کرو
حال ہما را اور بھی ابتر ہوتا ہے ہو جانے دو

اکثر تنہا رہ کر بھی میں تنہا کب رہ پاتا ہوں
بھولی بسری یادوں میں کھو جاتا ہوں کھو جانے دو

ہر بندھن اس جگ جیون کا جیتے جی کا بندھن ہے
دنیا سے منہ پھیر کے کوئی جاتا ہے تو جانے دو

میں کانٹوں کو پھول سمجھ کر اپنا دامن بھر لوں گا
کوئی میری راہ میں کانٹے بوتا ہے بو جانے دو

اور بہت ارمان ہیں دل میں چھوڑو بھی آفاق میاں
آپ نہ کوئی رکنا چاہے مت رکنے دو جانے دو

پروفیسر آفاق صدیقی

کیا زمیں کیا آسماں کچھ بھی نہیں
ہم نہ ہوں تو یہ جہاں کچھ بھی نہیں

دیدہ و دل کی رفاقت کے بغیر
فصل گل ہو یا خزاں کچھ بھی نہیں

کیا قیامت ہے کہ اب اس شہر میں
اعتبار جسم و جاں کچھ بھی نہیں

پتھروں میں ہم بھی پتھر ہو گئے
اب غم سود و زیاں کچھ بھی نہیں

کیسے کیسے سر کشیدہ لوگ تھے
جن کا اب نام و نشاں کچھ بھی نہیں

ایک احساس محبت کے سوا
حاصل عمر رواں کچھ بھی نہیں

کوئی موضوع سخن ہی جب نہ ہو
صرف انداز بیاں کچھ بھی نہیں

امین خیال (گوجرانوالہ)

اِک چراغِ کُشتہ جلتا ہے کرم فرمایئے
اب بھی اکثر دِل تڑپتا ہے کرم فرمایئے

زندگی کی ناؤ کو ہے ناخداؤں کی تلاش
ایک بحرِ غم مچلتا ہے کرم فرمایئے

ہر نفس تیری ہی آہٹ کے چمک جاتے ہیں چاند
ہر قدم پر دِل دھڑکتا ہے کرم فرمایئے

آبلہ پُھوٹے کوئی دِل کا تو بُجھ جائے یہ آگ
زہر یادوں کا سُلگتا ہے کرم فرمایئے

دیکھیئے ٹُوٹے نہ نگہِ نیم بازی کا فسُوں
میکدہ رنگت بدلتا ہے کرم فرمایئے

سومناتِ دِل میں بھیجیں پھر کسی محمود کو
گلشنِ ایماں اُجڑتا ہے کرم فرمایئے

پھر سرِ مژگاں ستارے ٹُوٹنے کو ہیں خیاؔل
آخرِ شب چاند ڈھلتا ہے کرم فرمایئے

امین خیال

قبا کے ساتھ سینہ چاک ہو جاتا تو کیا ہوتا
بیانِ غم تھا حسرت ناک ہو جاتا تو کیا ہوتا

کمالِ سادگی میں بھی قیامت اُس کا لہجہ ہے
غمِ جاناں ذرا چالاک ہو جاتا تو کیا ہوتا

حسیں پُھولوں کی نازک چلمنوں سے جھانکنے والو
کوئی کانٹا اگر بیباک ہو جاتا تو کیا ہوتا

زمانہ تو مری تَر دامنی سے چونک اُٹھا ہے
وہ دامن بھی اگر نمناک ہو جاتا تو کیا ہوتا

تعلق ایک مدت تک رہا ہے رنجِ دوراں سے
غمِ جاناں کا بھی ادراک ہو جاتا تو کیا ہوتا

خیاؔل اپنی تو پہلے بھی کہاں زندوں میں گنتی تھی
سرِ کُوئے محبت خاک ہو جاتا تو کیا ہوتا

محبوب راہی (اکولا)

نیلام خیالات کی حرمت نہیں کرتے
ہم شاعری کرتے ہیں تجارت نہیں کرتے

رہتے ہیں سدا تابع فرماں وہ ہمارے
الفاظ کبھی ہم سے بغاوت نہیں کرتے

اخلاص میں کرتے نہیں رشتوں کی ملاوٹ
ہم لوگ محبت کی سیاست نہیں کرتے

اخلاص کی دوکانیں بڑھا دی ہیں سبھی نے
اب لوگ خسارے کی تجارت نہیں کرتے

مشکل ہے مگر خارج از امکاں نہیں کچھ بھی
بس یہ ہے کہ ہم تھوڑی بھی زحمت نہیں کرتے

ملبوس نیا دیتے ہیں جدت کا اسے ہم
ہم ترک کبھی کوئی روایت نہیں کرتے

ابہام بھی ہے شعر کا اک وصف اے راہؔی
مفہوم کیھد اہلِ ذہانت نہیں کرتے

محبوب راہی

خاک و خوں کے وہی منظر وہی تاریکئ شب
برسرِ نیزہ وہی سر وہی تاریکئ شب

پھر وہی یاس کا گرداب،وہی کشتئ دل
وہی اشکوں کا سمندر وہی تاریکئ شب

رقص پھنکارتے شعلوں کا بہر سمت وہی
درمیاں میرا وہی گھر وہی تاریکئ شب

ہر طرف نور برستا ہوا رم جھم رم جھم
اور مسلط مِرے سر پر وہی تاریکئ شب

موج در موج وہی بہتے فرات و دجلہ
تشنہ لب وارثِ کوثر وہی تاریکئ شب

نور ہی نور اجالا ہی اجالا ہر سمت
ہے مگر اپنا مقدر وہی تاریکئ شب

وہی اک منزلِ بے نام و نشاں ہے راہؔی
وہی رستہ ، وہی رہبر ، وہی تاریکئ شب

خورشید اقبال (۲۴۔ پرگنہ)

خوف طوفان کا اے دوست مرے دل میں نہیں
لطف جو موج تلاطم میں ہے ساحل میں نہیں

میرے حصے کی ہر اک سانس پہ میرا حق ہے
میری تقدیر کسی پنجۂ قاتل میں نہیں

کشتیاں پھونک دو پھر جیت تمہاری ہوگی
مجھ کو معلوم ہے یہ جوش مقابل میں نہیں

ہے ترے حسن کا معیار مری نظروں میں
دلکشی میرے لئے اب مہ کامل میں نہیں

راہ کی دھوپ کی خوگر ہے طبیعت میری
راحتِ قلب مجھے سایۂ منزل میں نہیں

ایک تم ہی نہیں خورشیدؔ پریشان یہاں
کون ایسا ہے یہاں، جو کسی مشکل میں نہیں

خورشید اقبال

چلو مانا کہ ہے پچھلے سفر کی کچھ تھکن باقی
مگر دل میں تو ہے آگے ہی بڑھنے کی لگن باقی

بڑی مدت ہوئی لیکن ابھی تک دل کے گوشے میں
کسی کی بھوری آنکھوں کی ہے ہلکی سی چبھن باقی

دکھاوے کے لئے آکر گلے تو لگ گئے لیکن
بڑی تلخی ہے لفظوں میں، ہے لہجے میں جلن باقی

بڑھائے ہاتھ دشمن بھی تو بڑھ کر تھام لیں گے ہم
ابھی ہے شہر میں اپنے، مروت کا چلن باقی

محبت میں ضروری تو نہیں ہے سامنے رہنا
تری یادیں سلامت اور مرا دیوانہ پن باقی

نہیں مایوس میں حالات سے خورشیدؔ، کچھ بھی ہو
ابھی ہے آس کی اس دل میں ہلکی سی کرن باقی

ولی بجنوری (دہلی)

سامنے اک ان دیکھا منظر کیوں رہتا ہے
سوکھی آنکھوں بیچ سمندر کیوں رہتا ہے

ہنستے بستے لوگوں میں رہتا ہوں پھر بھی
اک سناٹا میرے اندر کیوں رہتا ہے

مجھ سے دل کے زخم کہا کرتے ہیں اکثر
سبز ہوا کا موسم سر پر کیوں رہتا ہے

پیاسا اک صحرا ہے میری ذات کے اندر
پھر یہ بہتا دریا باہر کیوں رہتا ہے

وہ آئے تو اُس سے ہی پوچھیں گے اک دن
چاند اکیلا جانے شب بھر کیوں رہتا ہے

ولی بجنوری

بستی میں میری پر توِ زر تاب اور لا
اے مہرباں فلک مرے سیلاب اور لا

اک تازہ تازہ نیند ابھی اور دے مجھے
تعبیرِ جاں! میرے لئے کچھ خواب اور لا

تپتی رُتوں میں چل کے ترے پاس آئے ہیں
پیاسیں ہمیں بلا کی ہیں زہراب اور لا

جانا ہے مجھ کو اور تہِ آب ایک بار
اک غوطہ زن مرے لئے مہتاب اور لا

شمعیں جلائے بیٹھے ہیں ہم لوگ کچھ نئی
کاجل سی رات اب نئے احباب اور لا

خورشید ناظر (بھاولپور)

مرا اک بار پھر گھر جل رہا ہے
ابھی ہجرت کا موسم چل رہا ہے

ہے منزل کالے کوسوں دور لیکن
یہ دن ہے کہ ابھی سے ڈھل رہا ہے

لب اظہار پر کس طرح لاؤں
وہ غم جو دل کے اندر پل رہا ہے

ہو حملہ شاید اب دشمن رتوں کا
جو حملہ مدتوں سے ٹل رہا ہے

نہیں ناظر ادھر تم ہی پریشاں
ادھر وہ شخص بھی بے کل رہا ہے

خورشید ناظر

بستیوں میں خامشی ہے آج کل
چاندنی بھی رو رہی ہے آج کل

زرد پودے، زرد پتے، زرد پھول
یہ ہوا کیا چل پڑی ہے آج کل

بارشیں جب بھی ہوئیں جوہڑ بھرے
تھا یہی پہلے، یہی ہے آج کل

کوئی در، کوئی دریچہ وا نہیں
ہر طرف اک بے رخی ہے آج کل

زندگی ہے جیتے جی مرنے کا نام
زندگی کب زندگی ہے آج کل

ایک کوہ درد ہے مجھ پر محیط
میں ہوں اور اک بے بسی ہے آج کل

کس طرح ناظر اندھیرے دور ہوں
شب سے سب کی دوستی ہے آج کل

باصر کاظمی (لندن)

کہاں ملے گا وہ مجھ سے اگر یہاں بھی رہے
مری دعا ہے کہ وہ خوش رہے جہاں بھی رہے

دلِ خراب یہ خواہش تری عجب ہے کہ وہ
ستم بھی کم نہ کرے اور مہرباں بھی رہے

ابھی زمین پہ جنت نہیں بنی یارو
جہاں کے قصے سناتے ہو ہم وہاں بھی رہے

رہا ہمیشہ ہی سامان مختصر اپنا
مسافروں کی طرح ہم رہے جہاں بھی رہے

جو ساتھ چلنے کے بھی مستحق نہ تھے باصؔر
کچھ ایسے لوگ یہاں میرِ کارواں بھی رہے

باصر کاظمی

بادل ہے اور پھول کھلے ہیں سبھی طرف
کہتا ہے دل کہ آج نکل جا کسی طرف

تیور بہت خراب تھے سنتے ہیں کل ترے
اچھا ہواکہ ہم نے نہ دیکھا تری طرف

جب بھی ملے ہم ان سے انہوں نے یہی کہا
بس آج آنے والے تھے ہم آپکی طرف

اے دل یہ دھڑکنیں تری معمول کی نہیں
لگتا ہے آ راہ ہے وہ فتنہ اسی طرف

خوش تھا کہ چار نیکیاں ہیں جمع اسکے پاس
نکلے گناہ بیسیوں اُلٹا مری طرف

باصؔر عدو سے ہم تو یونہی بد گماں رہے
تھا ان کا التفات کسی اور ہی طرف

رؤف خیر (حیدرآباد۔دکن)

دل رکھتے ہیں سینے میں جو لاوا نہیں رکھتے
وہ درد تو رکھتے ہیں مداوا نہیں رکھتے
مکھی کا بھی اس بُت پہ چڑھاوا نہیں رکھتے
ہم جاں سے گزرنے کا ڈراوا نہیں رکھتے
ہر موڑ پہ اوروں کے لئے اور ہیں مولا
ہم تیرے سوا ملجا و ماویٰ نہیں رکھتے
یلغار تو ہوتی بہت دیدہ و دل پر
ہم ذہن میں کچھ تیرے علاوہ نہیں رکھتے
میدان بہت شاہ سواروں کے لئے ہیں
جو حیلۂ اسباب و کجاوا نہیں رکھتے
شہکار ہیں کیا کیا ہنرِ کوزہ گری کے
اور خام پڑے ہیں کوئی کاوا نہیں رکھتے
ایمان یہاں کوئی کسی پر نہیں لاتا
ہم بھی تو سند ہونے کا دعوا نہیں رکھتے
نکلیں وہ ذرا کوچۂ سربند انا سے
کب ہم بھی درِ صدق و صفا وا نہیں رکھتے
وہ لوگ سمجھ لیتے ہیں صحرا ہی کو سب کچھ
جو لوگ سمندر کا بلاوا نہیں رکھتے
خوش ہیں تو ہیں خوش خیؔر خفا ہیں تو خفا ہیں
ہم حرفِ تذبذب کا چھلاوا نہیں رکھتے

پنہاں (امریکہ)

زخم شاداب دیکھتے ہیں مجھے
درد بیتاب دیکھتے ہیں مجھے

خواب دیکھے تھے ٹوٹ کر میں نے
ٹوٹ کر خواب دیکھتے ہیں مجھے

داغِ دل ضو فشاں ہوئے یوں کہ
شمس و مہتاب دیکھتے ہیں مجھے

کھل گیا ہو نہ دوستی کا بھرم
ڈر کے احباب دیکھتے ہیں مجھے

اک تناؤ سا اپنے آپ سے ہے
کھینچ کے اعصاب دیکھتے ہیں مجھے

مجھ میں شاعر تو اور ہے پنہاؔں
اور ارباب دیکھتے ہیں مجھے

طاہر مجید (جرمنی)

درد کا اظہار کرنا ظالموں کے شہر میں
کچھ اضافہ اور کردیتا ہے ان کے قہر میں

کیا کرے گا وہ بھلا رعنائیوں کے تذکرے
زندگی جس نے گزاری ہو بھری دوپہر میں

نفرتوں کا اک الاؤ تم جلا کر دیکھ لو
ڈھونڈ لیں گے زہر کا تریاق بھی ہم زہر میں

رات بھر اس کی محبت میں سمندر محو تھا
دن چڑھا تو چاند کی تصویر تھی ہر لہر میں

اس کو جنت کی بشارت دیجئے طاہؔر مجید
کاٹ لیں جس نے سزائیں سب کی سب اس دہر میں

ارشد جمال حشمی (کانکنارا)

نہ تو منزل ہے نہ گھر ہے دنیا
فقط اک راہگذر ہے دنیا

کارخانہ یہ امیدوں کا ہے
آرزوؤں کا نگر ہے دنیا

ایک دھوکہ ہے یہ سب رونق و رنگ
ذرا سوچو تو کھنڈر ہے دنیا

دل نہیں دیکھتی منہ دیکھتی ہے
کس قدر تنگ نظر ہے دنیا

جو گیا یاں سے تہی دست گیا
کسی کنجوس کا در ہے دنیا

تیری مرضی جسے چاہے چن لے
اِس طرف میں ہوں اُدھر ہے دنیا

میں چلا تھا تو مرے ساتھ ہی تھی
رہ گئی جانے کدھر ہے دنیا

عارف فرہاد (راولپنڈی)

بہارِ دشتِ سخن میں کھِلا خیال ہے تُو
حریم ِناز میں چلتی ہوئی غزال ہے تُو

تجھے خبر نہیں تیرے حریر و مرمر کی
تجھے خبر ہی نہیں کتنی خوش جمال ہے تُو

نہ پوچھ مل کے بھی تجھ سے میں تشنہ لب کیوں ہوں
نہ پوچھ مجھ سے کہ دریائے بے مثال ہے تُو

تُو کہ رہی ہے کہ میں ابتسامِ صبحِ ازل!
میں کہ رہا ہوں کہ بس روشنی کی شال ہے تُو

میں تجھ کو لاکھ چھپاتا پھروں مگر نہ چھپے
تُو روشنی ہے، دھنک ہے، مرا خیال ہے تُو

بتا اے گوہرِ ناسُفتہ! آج کچھ تو بتا
یہ کس کے واسطے گلیوں میں پائمال ہے تُو

مرے قریب سے کچھ اس طرح گزرتی ہو
کہ دل یہ کہتا ہے مہکا ہوا رمال ہے تُو

کہیں پہ میں ہوں، کہیں وہ، کہیں ترا عارف
خود اپنے آپ میں فرہاؔد خال خال ہے تُو

عارف فرہاؔد

ہتھیلیوں کی دُعا کے اَثر کی روشنی ہے
کہا نہ تھا کہ تُو میری فجر کی روشنی ہے

کوئی تو دشت ہے ایمن کا، کوئی طور تو ہے
جہاں پہ میری وفا کے اَثر کی روشنی ہے

کہا نہ تھا کہ مجھے کچھ نظر نہیں آتا
کہا نہ تھا کہ تُو میری نظر کی روشنی ہے

کہا نہ تھا کہ سفر در سفر اندھیرا ہے
کہا نہ تھا کہ تُو میرے سفر کی روشنی ہے

کہا نہ تھا کہ مرے لفظ لفظ میں فرہاؔد
ترے خیال کے دستِ ہُنر کی روشنی ہے

پروفیسر سرور انجم (ہارون آباد)

گرہ کشائی دست جنوں کے کیا کہنے
فسوں طرازی چشم فسوں کے کیا کہنے

جو پا لیا اسے اپنی طلب سے کم سمجھا
اے میرے دل ترے شوق فزوں کے کیا کہنے

روش روش گل و گلزار کو صباحت دی
مرے شہید ترے رنگ خوں کے کیا کہنے

متاع عقل کو کہتا ہے کون بے مصرف
پہ قدرو قیمت جذب دروں کے کیا کہنے

بٹھا کے سر پہ یہ پھر منہ کے بل گراتی ہے
فریب کاری دنیائے دوں کے کیا کہنے

پہاڑ توڑ کے پھر اپنے سر کو پھوڑ لیا
دیار عشق کے اس سر نگوں کے کیا کہنے

گدائے کوچہء الفت ہے دیکھو انجم بھی
خراب و خستہ و خوار و زبوں کے کیا کہنے

پروفیسر محمد لطیف (بہاول پور)

کنج گمنام کو جی چاہتاہے
اب تو آرام کو جی چاہتا ہے
جیسے آغاز کیا تھا ہم نے
ویسے انجام کو جی چاہتا ہے
اک جواں صبح کو دل ترسے ہے
اک حسیں شام کو جی چاہتاہے
حال بے کیفی ایام نہ پوچھ
کب سے اک جا م کو جی چاہتاہے
پارسا لاکھ بنے انساں کا
لغزش گام کو جی چاہتا ہے
عشق مجبور ہے ورنہ کس کا
سنگ و دشنام کو جی چاہتاہے
وقت آتا ہے کہ دشمن سے بھی
ربط و پیغام کو جی چاہتاہے
کب سے بے حر ف بیاض دل ہے
کشف و الہام کو جی چاہتاہے
تلخیء زیست کے با وصف لطیف
طول ایام کو جی چاہتاہے

نسرین نقاش (سری نگر)

مجھ سے رہتا ہے وہ بیزار بڑی مشکل ہے
کیسے ہو عشق کا اظہار بڑی مشکل ہے

کیسے گاؤں میں محبت کے سریلے نغمے
ساز کا ٹوٹ گیا تار بڑی مشکل ہے

عقل کہتی ہے کہ کانٹوں بھرے رستے پہ نہ چل
دل کے ہونٹوں پہ ہے انکار بڑی مشکل ہے

دیکھتا تک نہیں نفرت سے بھی میری جانب
جس کا یہ دل ہے طلبگار بڑی مشکل ہے

نہ تو پتوار ہی موجود نہ مانجھی کا پتہ
ناو اب کیسے لگے پار بڑی مشکل ہے

اس سے پہلے کہ پہنچتے یہ قدم منزل پر
راہ میں کھنچ گئی دیوار بڑی مشکل ہے

چھوڑنا بھی اُسے مشکل اُسے پانا بھی محال
کشمکش میں ہے میرا پیار بڑی مشکل ہے

کیا قیامت ہے کہ نسریںؔ وہ ہوتا ہی نہیں
عرضِ دل سننے کو تیار بڑی مشکل ہے

مرتضیٰ اشعر (ملتان)

کیا پتہ اب منتظر آنکھوں میں بینائی نہ ہو
کیا خبر ہم دستکیں دیں اور شنوائی نہ ہو

کیا پتہ بارانِ رحمت کا گذر محلوں سے ہو
کیا خبر کچے مکانوں پر گھٹا چھائی نہ ہو

کیا پتہ اپنوں میں کوئی رنگ میرا ناں ملے
کیا خبر وہ اجنبی ہو کر مِرا آئینہ ہو

کیا پتہ چہرے سلگتے ہوں ابھی تک دھوپ میں
کیا خبر شبنم شگوفوں پر اُتر آئی نہ ہو

کیا پتہ لوٹیں تو سوچا ہو بہت کچھ کہنے کا
کیا خبر وہ سامنے آئے تو گویائی نہ ہو

کیا پتہ بجھ جائیں اشعرؔ رستہ رستہ دائرے
کیا خبر حاصل سفر کا آبلہ پائی نہ ہو

سعید روشن (کویت)

بنتے ہوئے حباب تہہِ آب دیکھئے
ڈوبا ہے کون یہ سرِ گرداب دیکھئے

منظر یہاں نہ اب کوئی شاداب دیکھئے
کچھ بھی بچا نہیں پسِ سیلاب دیکھئے

جب بھی چھڑی ہے بات ترے حسن کی وہاں
مجھ سے خفا ہوئے مِرے احباب دیکھئے

ہوتی کہاں سے نرم یہ دل کی زمین بھی
سوکھا پڑا ہے آنکھ کا تالاب دیکھئے

پھیلا ہے نور صبح کی پہلی اذان سے
گونجے بدن کے منبر و محراب دیکھئے

اتنا نہ کھینچئے یہاں سانسوں کے تار کو
جائیں گے ٹوٹ ساز کے مضراب دیکھئے

روشنؔ رہے گا نام ترا بھی ورق ورق
جب بھی رقم کریں گے نیا باب دیکھنا

اوشا بھدوریہ (بھوپال)

ڈوبنے والے ابھرنے کا ہنر بھول گئے
کسی ساحل پہ اترنے کا ہنر بھول گئے

زندگی اتنی محبت سے عطا کی تو نے
ہم ترے نام پہ مرنے کا ہنر بھول گئے

آندھیاں چلتی ہیں بارش بھی صدا دیتی ہے
زرد پتے بھی بکھرنے کا ہنر بھول گئے

لمحہ لمحہ تجھے محسوس کیا ہے جب سے
رنگ تصویروں میں بھرنے کا ہنر بھول گئے

ہاتھ مجبوری نے جس دن سے رکھا ہے دل پر
خواب آنکھوں سے گزرنے کا ہنر بھول گئے

راستہ اب نہیں دیتا انہیں دریا کوئی
قافلے پار اترنے کا ہنر بھول گئے

زہر ٹپکا کے گیا ہے کوئی عرضِ جاں پر
ہم تو اب بات بھی کرنے کا ہنر بھول گئے

زندگی اشکوں کا خاموش سفر ہے اوشاؔ
چل پڑے ہیں تو ٹھہرنے کا ہنر بھول گئے

کلیم ظفر (کینیڈا)

دیکھ لیتا ہے اک نظر مجھ کو
زندہ رکھتا ہے یہ اثر مجھ کو

آسمانوں کو چھو رہی ہے آج
زندگی کر کے مختصر مجھ کو

ہر خبر آپ ہی کو دیتا ہے
اور سمجھتا ہے بے خبر مجھ کو

آزماتا بھی ہے وہی ہر بار
وہ جو رکھتا ہے معتبر مجھ کو

سچ ہے تیرا کہا کہ جھوٹ ہے سب
سب میں شامل نہ کر مگر مجھ کو

تیرے در پر جھکا دیا میں نے
اونچا رکھنا تھا اپنا سر مجھ کو

کیا خبر اس نے کتنا یاد کیا
جس نے پوچھا نہ لوٹ کر مجھ کو

روپا صبا (چنڈی گڑھ)

چاند! تجھ کو میرے آنگن میں اُترنا ہوگا
میرا کاشانۂ دِل نُور سے بھرنا ہوگا

پھول چنتے ہوئے آنکھیں یہ بھر آتی کیوں ہیں
مجھ کو جینے کا یہ انداز بدلنا ہوگا

اُس کے تاروں کی کھنک بن کے رہوں حُکم یہ ہے
راگنی بن کے اُسی ساز پہ ڈھلنا ہوگا

مَوج ایسی ہوں جو ساحل پہ بکھر جائے گی
بچ کر اپنے ہی کناروں سے گُزرنا ہوگا

مری خاموشی میں وہ سُن لے مرے دِل کی صدا
چُپ کی چلمن کو صبا یوں ہی سرکنا ہوگا

سلیم اختر فاروقی (کیرانہ)

زندگانی کے لئے میری بہت اکسیر ہیں
تیری باتیں آج تک دل پر مرے تحریر ہیں

ایلیم میں چاہنے والوں کی مل ہی جائیں گے
ہم تو ایک اخبار سے کاٹی ہوئی تصویر ہیں

اس جہانِ بے سکوں میں کس کے دل کو ہے قرار
ہاں اگر مل جائے جن میں وہ ہی سچّے پیر ہیں

جو کہ سچ بولیں جہاں میں ظالموں کے روبرُو
آج باطل کے لئے وہ ہی کھلی شمشیر ہیں

جو نظر آتے ہیں اخترؔ آسمانوں میں مجھے
ایسا لگتا ہے کہ میرے خوابوں کی تعبیر ہیں

سلیم اختر فاروقی

وہ جب سے ہوئے ہیں نگاہوں کا عنواں
غزل بن گئی ہے رسالوں کا عنواں

مرّتب ہوئی ہیں جو خونِ وفا سے
میرا نام ہے ان کتابوں کا عنواں

نقابوں میں سمٹا جواں سال آیا
نظر بن گئی ہے نظاروں کا عنواں

حیا بار آنکھیں جھکی جا رہی ہیں
کہ شاخیں ہوں جیسے گلابوں کا عنواں

وہ کالج کے رستو ں کا بارِ ضرورت
لو وہ بن گئے ہیں کتابوں کا عنواں

تصور کے آنگن میں بیٹھے ہوئے ہیں
وہ بن کر ہمارے خیالوں کا عنواں

اب اخترؔ مجھے کوئی چاہت نہیں ہے
وہ ہیں میرے دل کے حوالوں کا عنواں

جدید ادب

نذر خلیق (خانپور)

گھر کا سامان تھا دکان میں کیوں
باتیں کرتے تھے لوگ کان میں کیوں

نفرتیں جن سے تھیں کبھی ہم کو
آج رہتے ہیں وہ دھیان میں کیوں

وہ یہاں سے چلے گئے کب کے
''پھر میں رہتا ہوں اس مکان میں کیوں''

دھوپ میں ہر گھڑی جو رہتے تھے
وہ چلے آئے سائبان میں کیوں

جو تھے دشمن خلیقؔ میرے کبھی
زندگی ان کی ہے امان میں کیوں

حیدر قریشی (جرمنی)

اس دربار میں لازم تھا اپنے سر کو خم کرتے
ورنہ کم از کم اپنی آواز ہی مدھم کرتے

اس کی اناتسکین نہیں پاتی خالی لفظوں سے
شاید کچھ ہوجاتا اثر، تم گریۂ پیہم کرتے

سیکھ لیا ہے آخر ہم نے عشق میں خوش خوش رہنا
درد کو اپنی دوابناتے، زخم کو مرہم کرتے

کام ہمارے حصے کے سب کر گیا قیس دوانہ
کونساایسا کام تھاباقی جس کو اب ہم کرتے

ہر جانے والے کو دیکھ کے رکھ لیا دل پر پتھر
کس کس کو روتے آخر، کس کس کا ماتم کرتے

دل تو ہمارا جیسے پتھر سے بھی سخت ہوا تھا
پتھر پانی ہو گیا، سوکھی آنکھوں کو نم کرتے

بن جاتا تریاق اسی کا زہر اگر تم حیدرؔ
کوئی آیت پیار کی پڑھتے اور اس پر دَم کرتے

رشید امجد (راولپنڈی)

بے سفری

سفر کہاں سے کب اور کیوں شروع ہوا تھا، اب اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں تھا، اب گھور اندھیرا تھا اور گردن گردن اندھیرے میں ڈوبا ہوا طویل راستہ' جس پر چلتے رہنے کا ایک احساس تھا اور اندھیرا چٹکیاں کاٹتا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وقت گزر رہا ہے، ٹھہر گیا ہے یا وہی رک گئے ہیں یا چلے جا رہے ہیں۔ بس وقت کے ساتھ ساتھ اندھیرے کے ناخن تیز ہوتے جا رہے تھے۔ اور اس کی چٹکیوں سے اٹھنے والی درد کی ٹیس بڑھتی جا رہی تھی۔ یہی ٹیس ہونے کی علامت بھی تھی، کہ تھے یا نہیں تھے کا احساس کسی اور سطح پر موجود نہیں تھا۔

وہ بھی ان میں سے ایک تھا جنھوں نے اندھیرے میں سفر کا آغاز کیا تھا۔ اسے جتنا کچھ یاد تھا وہ یہی کہ اندھیرا اب چٹکیاں کاٹتے کاٹتے تند ہوا جا رہا ہے۔ شاید کبھی اندھیرا نرم گداز ہو اور شاید کبھی اس کی تہوں میں کوئی لچکیلا پن ہو' لیکن عرصہ سے جب سے اسے کچھ کچھ یاد ہونا شروع ہوا تھا، اندھیرے کا انداز اور خراج یہی تھا۔ روشنی کے بارے میں اس کے اور اس جیسے دوسروں کے تصوّر ایک سے تھے۔

وہ ہاتھ سے دائرہ سا بناتے ہوئے سوچتا' روشنی بھی اندھیرے کی طرح ٹکورتی ہے۔ ایک دن اسے خیال آیا کہ جب اس نے اور اس جیسے دوسروں نے کبھی روشنی کو دیکھا ہی نہیں تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ اندھیرا ہے۔

وہ بہت دیر سوچتا رہا۔ ہوسکتا ہے یہ روشنی ہو اور اندھیرا کچھ اور ہو۔ بہت دنوں تک جب اسے سوال کا جواب نہ ملا۔ تو ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے ایک بزرگ سے پوچھ لیا'

وہ کچھ دیر چپ رہے پھر بولے۔۔۔ ''معلوم تو مجھے بھی نہیں لیکن میں نے سنا ہے کہ ایک بار باہر کی دنیا سے کوئی یہاں آیا تھا۔ جس نے اس اندھیرے کا احساس کرایا تھا۔''

''اور تب سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہم اندھیرے میں رہ رہے ہیں''

''شاید ہاں''

''اور اندھیرا اس لئے ہے کہ ہم ہر شے کو ٹٹول کر دیکھتے ہیں اس کی پہچان نہیں رکھتے''

''شاید ہاں''

''اور میرے باپ نے بھی اسی اندھیرے میں زندگی گزار دی اور میں نے بھی اسی میں آنکھ کھولی اور زندگی گزار رہا ہوں۔ اور میرے بعد میرا بیٹا بھی۔۔۔۔۔''

''شاید ہاں''

''اور میرے باپ کے لئے یہ اندھیرا اتنا کرخت نہیں تھا شاید اس میں کوئی ملائمیت ہو' میرے لئے وہ چٹکیاں کاٹنے والا ہے۔ جس کی ٹیس کئی کئی دن محسوس ہوتی ہے' اس کے ناخن اب کافی بڑھ گئے ہیں اور تیز ہیں اور میرے بیٹے تک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

''شاید ہاں''

اُس نے جھنجلا کر بزرگ کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔۔۔ ''آپ کے ہر جواب میں شاید کیوں ہے''؟

بزرگ ہنسے۔۔۔ ''تمہارا ہر سوال بھی تو ادھورا ہے' تمہارا جملہ بھی مکمل نہیں''

اب خیالوں اور سوالوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے باپ نے اس اندھیرے سے نکلنے کی جدوجہد کیوں نہیں کی۔ کیا اسے اپنے بیٹے کا خیال نہیں تھا۔۔۔۔ نہیں تھا تو اس کے ذہن میں یہ خیال کہاں سے آیا، کیسے آیا۔ بس سوال ہی سوال تھے اور جواب نہیں تھا' صرف اندھیرا تھا اور سفر تھا کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ تھا بھی یا نہیں، اب تو اسے بار بار یہ خیال بھی آتا کہ سفر ہے بھی کہ نہیں۔ وہ چل بھی رہے ہیں یا ایک ہی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ دکھائی تو کچھ دیتا نہیں پھر یہ کون بتائے کہ وہ چل رہے ہیں یا ایک ہی جگہ رکے ہوئے ہیں، ہوسکتا ہے کبھی چل رہے ہوں اور اب رک گئے ہوں۔ اس گھور اندھیرے میں نہ کچھ سوجھتا تھا' نہ کچھ سمجھ میں آتا تھا، اور بتانے والا کوئی نہ تھا۔ جس سے بھی کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا' وہ اپنے سوال لئے ہوئے ہوتا۔ بس سوالوں کا ایک دائرہ تھا اور جواب۔۔۔۔۔۔''

آخر کسی کو تو کچھ معلوم ہوگا، کوئی تو جواب دے سکتا ہوگا' وہ کون ہے' کہاں ہے؟

اب وہ اس کی تلاش میں تھا کوئی نہ کوئی ضرور اندر کی بات جانتا ہے لیکن چپ سادھے بیٹھا ہے، وہ اپنے آپ سے کہتا' لیکن وہ ہے کون اور کیوں نہیں بولتا۔ بولنے پر بظاہر کوئی پابندی بھی نہ تھی، بلکہ وہ سب ضرورت سے زیادہ بولتے تھے۔ ہر وقت بولتے ہی رہتے تھے، بلکہ نیند میں بھی بڑبڑاتے رہتے تھے۔ آوازیں تھیں اور شور تھا لیکن ان میں پرندوں کی چہچہاہٹ نہ تھی کہ مدت سے پھولوں نے کھلنا بند کر دیا تھا، اور کوئی گیت نہیں تھا کہ عرصہ سے گیت

نگار نے گیت لکھنا بند کر دیا تھا کہ کوئی گیت سننے والا نہیں تھا۔ اسے خیال آیا کہ یہ جو عرصہ سے چپ ہیں ضرور کوئی بات جانتے ہیں۔ پرندے تو جواب دے نہیں سکتے تھے، گیت نگار ضرور کچھ جانتا ہوگا مگر وہ ہے کہاں؟ اس گھور اندھیرے میں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔ کہ اب اس کے لئے چھپنے کے سوا اور کیا چارہ تھا ! وہ اس کی تلاش میں لگ گیا۔ آوازوں سے ٹٹول کر، کبھی آوازیں دے کر وہ اسے ڈھونڈتا رہا، لیکن وہ اسے نہ ملا۔ پھر جب وہ مایوس ہو گیا تو ایک دن اچانک ہی وہ اس کے قریب آ گیا۔ اُس کے سوال کے جواب میں وہ چپ رہا، دیر تک چپ رہا۔

اُس نے پھر سوال دہرایا۔۔۔ ''تم چپ کیوں ہے، بتاتے کیوں نہیں۔ یہ اندھیرا کب ختم ہوگا؟

وہ پھر چپ رہا،

''کب ختم ہوگا یہ اندھیرا؟'' اس کی آواز میں اب ایک التجا تھی۔

دیر کی خاموشی کے بعد گیت نگار ایسی آواز میں جو بمشکل سنی جا سکتی تھی، بولا۔۔۔ ''شاید کبھی نہیں''

''کبھی نہیں'' وہ روہانسا ہو گیا۔۔۔ ''کبھی بھی نہیں''

''شاید کبھی بھی نہیں'' گیت نگار کی آواز میں آنسو چھلک رہے تھے۔۔۔ ''اندھیرا تو کبھی نہ کبھی ختم ہو ہی جاتا ہے لیکن آنکھیں ہی نہ ہوں تو۔۔۔۔''

''کیا'' وہ چیخا اور اپنی آنکھوں کو ٹٹولنے لگا۔۔۔ ''کیا ہماری آنکھیں ہی۔۔۔۔۔''

اور اسے لگا، اُس کے کان بھی نہیں، اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے، ہوتا رہا ہے۔ اس کے اندر ہی کوئی سرسراہٹ سی ہے، ایک آہٹ سی اور بس۔۔۔۔! یہ عجب انکشاف تھا کہ اس کی آنکھیں ہیں، نہ کان، وہ رو بھی نہیں سکتا، تو۔۔۔ ہنس تو سکتا ہے اور غیر اردی طور پر قہقہہ ایک فوارے کی طرح اُس کے ہونٹوں سے پھُوٹ نکلا۔

فتح محمد ملک کی زندگی مسلسل جدوجہد کی ایک علامت ہے۔ گورنمنٹ کالج اصغر مال میں تدریس کے دوران بھی وہ روزنامہ تعمیر سے وابستہ تھے کہ اپنے سفر کا آغاز انہوں نے یہیں سے کیا تھا۔ صوبائی محکمہ اطلاعات میں سکرپٹ ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ انہی دنوں مساوات کے اجراء کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حنیف رامے اس کے انچارج تھے۔ ملک صاحب کنیز فاطمہ کے ذریعے مساوات میں پہنچ گئے۔ کالج سے چھٹی لی اور مساوات کو چلا دیا۔ پھر وزیر اعلیٰ پنجاب کے پریس سیکریٹری بنے۔ اس دوران بھی انہوں نے ادیبوں سے رابطہ قائم رکھا۔

رشید امجد کی خودنوشت سوانح **تمنا بے تاب** کے صفحہ نمبر ۱۴۰۔۱۳۹ سے اقتباس)

منشا یاد (اسلام آباد)

ماں جی

ساتویں جماعت کا نو ماہی امتحان ہو رہا تھا۔

میں نے ابھی آدھا پرچہ حل کیا ہوگا کہ ماسٹر فاروقی اپنی کرسی اٹھوا کر میرے قریب لے آئے۔ مجھے لگا میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے ہیں۔ مجھے اس سے الجھن ہونے لگی۔ کوئی لقمے گن رہا ہو تو آپ کھانا کیسے کھا سکتے ہیں۔ پرچا حل کرنے کی میری رفتار سست پڑ گئی مگر ماسٹر صاحب آخرِ وقت تک میری گردن پر سوار رہے۔

خدا خدا کر کے پرچا مکمل ہوا۔ ماسٹر صاحب نے چھیننے کے انداز میں پرچا میرے ہاتھ سے لیا اور بولے

''گاؤں کا کوئی آدمی باہر تمہارا انتظار کر رہا ہے''

میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میرے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ لڑکے جمع ہو گئے

''کیا ہوا؟''

''میری ماں مر گئی''

ماسٹر صاحب نے شفقت سے میرا کندھا تھپتھپایا اور بولے ''یہ تم سے کس نے کہا؟''

''مجھے معلوم ہے'' میں نے روتے ہوئے جواب دیا ''گاؤں سے نواب مجھے لینے آیا ہے''

انہوں نے گاؤں سے آنے والے آدمی کو بلوا کر اس کا نام پوچھا۔ وہ سچ مچ نواب ہی تھا۔ مجھ سے پہلے وہ گاؤں کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا شخص اور ہر فن مولا قسم کا آدمی تھا جس نے پوری چار جماعتیں پڑھ رکھی تھیں۔ ہمارا اس سے بھائی چارہ تھا۔ اس نے ماسٹر صاحب کے سامنے قسم کھائی اور مجھے یقین دلایا

''تمہاری ماں جی زندہ اور سلامت ہیں۔ انہوں نے خود مجھے بھیجا ہے کہ تمہیں ساتھ لیتا آؤں''

ایسا پہلے بھی ہوتا تھا۔ گاؤں میں اس کی کریانے کی دکان تھی۔ وہ جب بھی سودا سلف لینے آتا، ماں جی کی ہدایت کے مطابق مجھ سے مل کر اور خیریت معلوم کر کے جاتا اور اگر اگلے روز چھٹی ہوتی تو مجھے ساتھ لے جاتا۔ لیکن آج اس کی خورجین خالی تھی اور وہ صرف مجھے لینے آیا تھا۔ تاہم اس کے بار بار قسمیں کھانے کے بعد مجھے اس

کی بات پر یقین آ گیا۔اور ہم گاؤں کے لئے روانہ ہوگئے۔

میں پچھلے دو تین برسوں سے پڑھائی کی خاطر خالہ کے پاس رہتا تھا۔ان کا گاؤں شہر کے مضافات میں تھا۔

شروع میں میرے پاس بائیسکل نہیں تھی اور نہ ہی میں چلا سکتا تھا۔ان دنوں مہینوں بعد ریل گاڑی کے ذریعے اپنے گاؤں جا پاتا۔چھٹی جماعت میں بائیسکل مل گئی مگر میری ٹانگیں پیڈلوں تک نہیں پہنچتی تھیں۔پھر اس کا حل بھی نکل آیا۔خالہ کے گاؤں سے اور بھی لڑکے پیدل سکول جاتے تھے۔ان میں ایک کو بائیسکل چلانا آتی تھی مگر اس کے پاس بائیسکل نہیں تھی۔اس طرح مجھے ایک ڈرائیور مل گیا۔مگر ساتویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے میں نے خود چلانا شروع کر دی اور اب میں ہر ویک اینڈ پر اپنے گاؤں چلا جاتا اور پیر کی صبح کو بیس اکیس میل کا سفر طے کر کے سکول پہنچ جاتا تھا۔بیمار ہونے اور بستر پر پڑ جانے سے پہلے ماں جی ہفتہ کے دن میرے لئے اچھی اچھی چیزیں پکا کر رکھ دیتیں اور اگر وقت بچ جاتا تو چرخہ اٹھا کر چھت پر لے جاتیں اور شہر سے آنے والے راستے کی طرف رخ کر کے انتظار کی پونیاں کاتنے لگتیں۔میری بائیسکل کے پہیے اور ان کا چرخہ ایک ساتھ گھومتے۔ہوا مخالف ہوتی تب بھی لگتا پکی ڈور سے بندھا کھنچا چلا جا رہا ہوں۔

میرے راستے میں پندرہ میل لمبی نہر پڑتی تھی۔جب یہ کناروں تک بھری بہہ رہی ہوتی۔اس سے ایک عجیب طرح کی دہشت محسوس ہوتی۔ماں جی کو گھر بیٹھے اس سے ہول آتا رہتا۔خود مجھے بھی پندرہ میل لمبائی میں بہتے پانی کو دیکھ دیکھ کر اکثر اپنے یا دوسروں کے ڈوبنے کے خواب دکھائی دیتے رہتے بعض اوقات میں دیکھتا۔میں سوکھی پڑی نہر میں پانی کے آگے آگے بھاگ رہا ہوں اور کئی گز اونچا پانی میرے پیچھے شوکتا لپکتا چلا آتا ہے۔۔گذشتہ رات بھی میں نے ایسا ہی ہولناک خواب دیکھا تھا۔

میں نے دیکھا کہ وہ گہرے پانی میں ڈوب رہی ہیں۔ہاتھ پاؤں مارتے مارتے ان کا سانس پھول گیا ہے مگر ہر لحظہ وہ پانی میں چھپتی جا رہی ہیں۔میں کنارے پر کھڑا روتا اور مدد کے لئے پکارتا ہوں مگر کوئی میری مدد کو نہیں آتا نہ ہی دور تک کوئی ذی نفس دکھائی دیتا ہے۔پھر وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے غرقِ آب ہو جاتی ہیں۔میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔

یہ خواب اصل صورتِ حال کے عین مطابق تھا

وہ کئی مہینوں سے بیمار تھیں مگر ان کا تسلی بخش علاج نہیں ہو رہا تھا۔ابا جی خود حکیم تھے مگر ان کے علاج سے انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ان کے علاج سے کسی کو فائدہ ہوتا یا نہ ہوتا مگر مریضوں کے انجام کے بارے میں ان کی پیش گوئی ہمیشہ درست ثابت ہوتی۔ماں جی کے بارے میں بھی انہوں نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ ان کا بچنا محال ہے۔شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے علاج پر بھی پوری توجہ نہیں دیتے تھے۔تاہم انہوں نے اپنے علاج پر اکتفا

نہ کیا اور ایک مشہور حکیم کا علاج شروع کرا دیا جو چند میل کے فاصلے پر رہتے تھے مگر ماں جی کو ان کے علاج سے بھی کوئی خاص افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔انہیں تپ دق تشخیص ہوئی تھی جسے اس زمانے میں لا علاج مرض سمجھا جاتا تھا۔ڈاکٹری علاج میسر نہیں تھا اور پاکستان اور امریکہ کے بہترین ہسپتالوں میں ڈاکٹر اور پروفیسر آف میڈیسنز کے فرائض سرانجام دینے والے ان کے پوتوں کو ابھی بہت بعد میں پیدا ہونا تھا۔

خالہ ان دنوں پہلے ہی ماں جی کے پاس تھیں ہم شہر سے نکلے تو ظہر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

نومبر کی آخری تاریخ تھی اور خزاں کا موسم اپنے جوبن پر تھا۔ہر طرف درختوں کے سوکھے ہوئے پتے، اداسی اور گرد و غبار۔تنگ سی پکی سڑک کا راستہ صرف تین میل لمبا تھا مگر نہایت تکلیف دہ۔ایک تو ہوا مخالف دوسرے کوئی بس یا ٹرک گزرتا تو اتنا گرد و غبار اٹھتا کہ دیر تک کچھ دکھائی سجھائی نہ دیتا۔مگر جب ہم نہر کی پٹڑی پر آئے۔ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا اور پیڈل مارنے میں نسبتاً آسانی محسوس ہونے لگی۔

عام طور پر میں ایک ہفتہ بعد گاؤں جاتا تھا مگر جب سے ماں جی علیل ہوئی تھیں ان کی تیمارداری اور چھوٹے بھائی بہن کی دلداری کے لئے ہر دوسرے تیسرے دن چلا جاتا۔رات کو ماں جی کے پاؤں دباتا، انہیں دوا کھلاتا پلاتا اور ان کی طبیعت بہتر ہوتی تو کتابوں سے کہانیاں اور نظمیں پڑھ کر سناتا۔انہیں کہانیاں اور نظمیں بہت اچھی لگتی تھیں۔انہیں خود بھی بہت یاد تھیں اور وہ اپنی پڑھی سنی ہوئی ساری کہانیاں مجھے میرے بچپن ہی میں منتقل کر چکی تھیں۔کہانی سے میری دلچسپی انہی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ان کی بے وقت موت کے بعد میں نے کتابوں اور قصے کہانیوں میں پناہ لی اور جس سال وہ فوت ہوئیں اسی سال بچوں کے رسالے میں میری پہلی کہانی کے روپ میں طلوع ہوئیں۔

مجھے بعض اوقات اتوار کو ان کی دوا لینے اور کیفیت بتانے حکیم صاحب کے پاس جانا پڑتا۔سردیوں کے چھوٹے چھوٹے دن تھے۔گھر پہنچتے پہنچتے دیر ہو جاتی۔ماں جی میری اس بھاگ دوڑ سے دکھی ہوتیں۔مگر مجبوری تھی کیوں کہ ابا کو بائیسکل چلانا نہ آتی تھی۔میں رات کو دیر سے سوتا مگر اگلی صبح منہ اندھیرے سکول کے لئے روانہ ہو جاتا۔گھر کے کام کاج اور ماں جی کی دیکھ بھال کے لئے میری ایک پھوپھی زاد بہن موجود تھی۔وہ ناشتہ بنا دیتی تھی۔میں خوب تیز بائیسکل چلاتا مگر سکول پہنچنے میں اکثر دیر ہو جاتی۔کلاس ٹیچر ماسٹر فاروقی ابھی میرے گھر کے حالات سے آگاہ نہیں تھے انہوں نے مجھے کئی بار وارننگ دی مگر ہر بار کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا کہ مجھے سکول پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔تنگ آ کر ایک روز انہوں نے میری پٹائی کر دی۔

اس روز ہوا مخالف اور سخت سردی تھی۔گھاس پر کہرا جما ہوا تھا اور اس قدر دھند چھائی ہوئی تھی کہ نہر کا دوسرا کنارہ تک نظر نہ آتا تھا۔ہاتھ پاؤں ٹھٹھر رہے تھے۔میں نے دو تین بار سرکنڈوں کو آگ لگا کر ہاتھ تاپے اور بڑی مشکل سے سکول پہنچا۔ماسٹر صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، تابڑ توڑ میرے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں پر ڈنڈے

برسانا شروع کردیئے ۔ مجھے ڈنڈوں کی تکلیف سے زیادہ ندامت کا احساس مارے ڈال رہا تھا کیونکہ میں کلاس ما نیٹر تھا اور پڑھائی کی وجہ سے کبھی سزا کی نوبت نہیں آئی تھی ۔

پیریڈ ختم ہونے تک ان کا غصہ اتر چکا تھا۔ جاتے ہوئے وہ مجھے دفتر میں آنے کا اشارہ کر گئے ۔ میں ان کے دفتر پہنچا۔انہوں نے بار بار دیر سے آنے کی وجہ پوچھی ۔ میں نے والدہ کی بیماری اور بیس میل سفر طے کر کے سکول پہنچنے کا ذکر کیا تو ان کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔ کہنے لگے ۔تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔اسکے بعد وہ مجھ سے خاص شفقت اور رعایت کرنے لگے اور میرے گھر کے حالات اور ماں جی کی بیماری سے باخبر رہتے ۔

اس سے پہلے جب کبھی میں نواب کے ہمراہ گاؤں جاتا تھا تو اس کے ساتھ ریس لگاتا۔ایک تو واپسی کے سفر میں وہ تھکا ہوا ہوتا دوسرے اس کی بائیسکل پر بوجھ لدا ہوتا ۔اور میں تازہ دم اور طفلانہ جوش سے لت پت۔ گھنٹیاں بجاتا، بکرے بلاتا اور قلقاریاں مارتا آگے نکل نکل جاتا۔مگر آج ایسا لگتا تھا جیسے میری ٹانگوں میں جان نہ ہو یا بائیسکل کے پہیوں کو گریس اور تیل کی سخت ضرورت ہو۔اگرچہ نواب کی باتوں پر مجھے یقین آ گیا تھا لیکن گذشتہ رات کا خواب میرے ذہن سے چپکا ہوا تھا۔اور جیسے میرے اندر کوئی چیز کم ہوگئی یا چھِن گئی تھی۔

میں ایک عرصہ سے دیکھ رہا تھا کہ وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔وہ آہستہ آہستہ مر رہی تھیں مگر میرے بس میں کچھ نہ تھا۔کبھی کبھی انہیں دوا سے عارضی طور پر افاقہ معلوم ہوتا مگر پھر مرض دوبارہ غلبہ کر لیتا۔ہم کئی بار ان کے مرنے کا منظر دیکھ چکے تھے۔اچانک ان کا سانس اکھڑ جاتا اور وہ ہانپنے لگتیں۔آنکھیں ابل پڑتیں اور تیماردار عورتیں ان کے سرہانے بلند آواز میں سورہِ یاسین کی تلاوت کرنے لگتیں۔مگر ان میں زندہ رہنے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ دوبارہ سنبھل جاتیں یا شاید قدرت کو رحم آ جاتا اور انہیں کچھ اور مہلت مل جاتی۔ میں تین روز پہلے ہی تو آیا تھا۔ان کی حالت اچھی نہیں تھی ۔میں انہیں اس حالت میں چھوڑ کر سکول آنا نہیں چاہتا تھا مگر انہوں نے مجھے زبردستی بھیجا۔کہنے لگیں اگر تم امتحان دینے نہیں جاؤ گے تو میرا خواب کیسے پورا ہوگا۔ میں نے کہا میں سکول چلا جاؤں گا۔تو تم میرے پیچھے مر جاؤ گی۔

''نہیں مروں گی'' وہ مسکرائیں ''تمہیں دیکھے بغیر کیسے مر سکتی ہوں''

''ایسی بات ہے تو میں کبھی آؤں گا ہی نہیں'' میں نے کہا'' تاکہ تم ہمیشہ زندہ رہو''

''نہ اڑیا'' وہ بولیں ''ایسی زندگی کا کیا فائدہ؟''

دراصل یہ ساری خرابی ابا کی وجہ ہی سے تھی جنہوں نے ان کے مرنے کی پیش گوئی کر رکھی تھی۔

ماں جی ابھی زندہ تھیں۔ان کے مرنے میں ابھی بہت دن باقی تھے مگر میں انہیں خوابوں میں ہر روز مرتے ہوئے دیکھتا۔خوابوں اور خیالوں کے کوہ قافوں میں آبِ حیات کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا۔کاش غیب سے کوئی مردِ حکیم یا کوئی فرشتہ آ جائے اور انہیں پہلے کی طرح بھلا چنگا کر دے۔کوئی معجزہ؟ کوئی کرامت؟ میں چاہتا تھا ان کی تصویر بن جائے ۔چھوٹا اس وقت چار سال کا تھا۔وہ بڑا ہو کر پوچھے گا ماں کیسی تھی تو اسے کیا بتائیں گے۔کیا پتہ خود مجھے ماں جی کی صور

ت بھول جائے ۔مگر تصویر تو شہر جا کر بنوائی جا سکتی تھی اور وہ سہارے کے بغیر بستر سے نہ اٹھ سکتی تھیں اور میرے ہاتھ میں سٹل کیمرہ آٹھ، مووی کیمرہ پینتیس اور ویب کیم آنے میں ابھی چالیس سال پڑے تھے۔

ابا مجھے شہر بھیجنا اور ہائی سکول میں داخل کرانا نہیں چاہتے تھے۔ان کا ارادہ مجھے قریبی قصبے کے ورنیکلر مڈل سکول میں داخل کرانے کا تھا۔مگر ماں جی مجھے ہائی سکول میں داخل کرانا اور انگریزی پڑھانا چاہتی تھیں۔عام طور پر دیہات میں شوہروں کے فیصلوں کے سامنے بیویوں کی مرضی اور خواہش کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔لیکن ماں جی ڈٹ گئیں۔انہوں نے میری خالہ کو پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ان کے پاس پڑھنے کے لئے بھیجیں گی۔میں نے پرائمری کا امتحان پاس کر لیا تو ابا مجھے منڈی مویشیاں کا میلہ دکھانے شہر لے گئے۔ وہاں خوب رونق تھی سینما، تھیئٹر ،سرکس اور موت کا کنواں۔ میں وہیں خالہ کے پاس رہ پڑا۔ابا کا خیال تھا میں کچھ دنوں میں اداس ہو جاؤں گا اور خالہ ان کو خط لکھیں گی کہ آ کر لڑکے کو لے جائیں۔مگر خالہ نے ماں جی کی خواہش کے مطابق مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔خوش قسمتی سے ان کے سسرالی رشتہ داروں میں بہت سے سکول ٹیچر تھے انہوں نے میرا ایسٹ دلوا کر مجھے پانچویں میں داخل کرا دیا۔

خالہ اگرچہ ماں جی کی طرح ہی مہربان اور محبت کرنے والی تھیں اور انہوں نے ایثار اور محبت کی شاندار مثال قائم کی۔کھانے پینے کی چیز کم ہوتی تو اپنے بچوں سے چھپا کر مجھے دے دیتیں۔مگر ان دنوں ان کے معاشی حالات اچھے نہ تھے۔خالو بہت اچھے اور شفیق آدمی تھے مگر وہ دور پار کے رشتے داروں کے پاس سندھ چلے گئے تھے اور ان کا خط تک نہ آتا تھا۔ابا مجھے بہت تھوڑے پیسے دے کر گئے تھے۔سکول کی فیس، کپڑے اور دوسرے اخراجات خالہ جان ادا کرتیں۔ میں جانتا تھا ان کا ہاتھ تنگ ہے۔اس لئے کسی طرح کی غیر ضروری فرمائش نہ کرتا۔ہم ریلوے لائن کے ساتھ چار میل پیدل چل کر سکول جاتے تھے۔موسم سخت گرم اور راستہ پتھریلا تھا۔جلد ہی میرے جوتے پھٹ گئے ۔کچھ روز میں ان کی مرمت کروا کر کام چلاتا رہا پھر وہ تکلیف دینے لگے۔تلا بالکل بیکار ہو گیا تھا۔میں انہیں جوتا کیوں نہ پہنا،سموسا کیوں نہ کھایا،تلا نہ تھا کے مصداق سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں چھپا کر ننگے پاؤں سکول چلا جاتا۔واپسی پر پہن کر گھر آ جاتا۔چونکہ ہم رات کو باہر کی حویلی میں جا کر سوتے تھے اس لئے خالہ کو پتہ ہی نہ چلا کہ میرے جوتے پھٹ چکے ہیں۔ مجھے والد صاحب کا انتظار رہتا مگر وہ تو جیسے مجھے سزا دے رہے تھے۔میرے خط کا جواب بھی نہ دیا۔

ان دنوں گرمی کی چھٹیاں جولائی میں ہوتی تھیں۔سخت گرمی پڑ رہی تھی ۔ ہر چیز جھلس رہی تھی لوگ بارش کے لئے دعائیں مانگتے اور ہر روز اس انتظار میں رہتے کہ کب ہوائیں کالی بدلیوں کو گھیر لاتی ہیں۔بارش تو نہ آئی لیکن میرے فلک پر ایک روز تتر کھمبی بدلی گھر آئی ۔میری زندگی میں جو چند خوبصورت ترین اور یادگار لمحے ہیں ان میں اس ایک لمحے کا بھی شمار ہوتا ہے۔میں سکول کے برآمدے میں خوش خطی کی مشق کر رہا تھا کہ غلام

محمد گھڑی ساز کی دکان سے ان کا ایک شاگرد اور خالہ کے سسرالی عزیزوں کا لڑکا رشید بائیسکل پر اطلاع دینے آیا کہ تمہاری امی آئی ہیں ۔ مجھے لگا جیسے ٹھنڈی ہوا چلنے اور ساون کی پھوار برسنے لگی ۔ وہ پیغام دے کر چلا گیا اسے کچھ اور کام بھی تھا۔ میں بھاگم بھاگ دکان پر پہنچا ۔ وہ اس کے رہائشی کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھیں ۔ مجھے دیکھ کر کھل سی گئیں ۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے دعا دی اور میرا ماتھا چوما اور دیر تک میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا جیسے مجھے محسوس کر رہی ہوں یا جیسے میری موجودگی کا یقین کر رہی ہوں ۔

''ابا کیسے ہیں؟'' میں نے سلام دعا کے بعد پوچھا

''ان کی آنکھیں آئی ہوئی تھیں ورنہ وہ آتے''

میں نے چھوٹے بھائی اور بہن کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگیں ''تمہارے لئے بہت اداس ہیں''

''آپ کس کے ساتھ اور کیسے آئی ہیں؟''

کہنے لگیں ''گاؤں کا حافظ تاجا اور اس کی گھر والی یہاں آ رہے تھے میں بھی ساتھ آ گئی ۔ خیال تھا کوٹ حسن خاں سے بس مل جائے گی مگر ہمارے پہنچنے سے پہلے وہ نکل گئی تھی ۔ اس لئے ہمیں پیدل ہی آنا پڑا''

گاؤں کا پیدل سفر بارہ کوس یا اٹھارہ میل تھا۔ میں پریشان ہو گیا ''آپ اتنی دور پیدل چل کر آئی ہیں؟''

''تو کیا ہوا'' وہ بولیں ''آ تو گئی''

''آپ تھک گئی ہوں گی''

''تمہیں دیکھ کر ساری تھکاوٹ دور ہو گئی''

ہم نے تین ماہ بعد اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ وہ منہ اندھیرے ناشتہ کر کے گھر سے نکلی تھیں اور اپنے اور میرے حصے کے گھی ملے آٹے کے پراٹھے اور آم کا اچار ساتھ لائی تھیں ۔ یہ جگہ بازار کے عین درمیان میں تھی ۔ ایک طرف پھلوں کی دکانیں تھیں ۔ آم ، آڑو، آلوچے ، آلو بخارا، اور خوبانیاں ۔ دوسری طرف حلوایوں کی دکانیں، جہاں طرح طرح کی خوشنما مٹھائیاں سجی تھیں ۔ دودھ سوڈے کی دکان تو اتنی قریب تھی کہ بوتلیں بھرنے کی چھک چھک کی آواز صاف سنائی دیتی تھی ۔ میرا جی چاہتا میں شہر کی ساری نعمتیں لا کر ان کے سامنے ڈھیر کر دوں ۔ مگر مجھے تو انکی کی شکل دیکھے بھی کئی ہفتے ہو گئے تھے ۔ میں گلاس لے کر گھڑے سے ان کے لئے پانی لینے کو اٹھا تو ان کی نظر میرے ننگے پیروں پر پڑ گئی ۔

''تمہارے جوتے کہاں ہیں؟''

میں چپ رہا تو انہوں نے پھر پوچھا میں پھر بھی خاموش رہا تو وہ رونے لگیں

''تم اساڑھ کی اس گرمی میں پتھریلے راستوں پر ننگے پاؤں چل کر سکول آتے جاتے ہو؟''

وہ اتنا روئیں کہ اگر میں خالی گلاس ان کے سامنے رکھ دیتا تو وہ ان کے آنسوؤں سے بھر جاتا ۔ لیکن اچانک ایک خوشگوار خیال سے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں ۔ بولیں

''آج مجھے یقین ہو گیا میرا خواب ضرور پورا ہو گا تم پہلی آزمائش میں پورا اترے ہو''

پھر وہ مجھے جوتوں کی دکان پر لے گئیں اور نئے جوتے دلوائے ۔ اب مجھے اپنے پھٹے پرانے جوتوں کی جو میں نے رستے میں چھپائے ہوئے تھے ضرورت نہ تھی مگر خالہ کے گاؤں جاتے ہوئے انہوں نے اصرار کر کے وہ جوتے منگائے اور بعد میں اپنے ساتھ گاؤں لے گئیں ۔ یہاں بیچاری خالہ کو رلایا وہاں ابا کو۔ ان کا خیال تھا وہ یہ جوتے کسی سند یا تمغے کی طرح سنبھال کر رکھیں گی مگر جب وہ خود ہی نہ رہیں تو ان کی محفوظ کی ہوئی چیزیں کہاں باقی رہتیں ۔

ان کے ہمیشہ کے لئے چلے جانے کے بعد رشتے داروں کے تقاضے پر ابا نے میری شادی یا منگنی کرنا چاہی ۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ ابا کا مجھ پر زیادہ زور نہ چلتا تھا۔ وہ مجھ پر سختی کرتے تو میں گھر آنا چھوڑ سکتا تھا ۔ مجھے خالہ کی مدد اور حمایت حاصل تھی ۔ میرا بھائی اور بہن دونوں بہت چھوٹے تھے ۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ابا نے میرے اور خالہ کے اصرار پر دوسری شادی کر لی ۔ لیکن وہ ماں جی کو ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد کرتے رہے ۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک عام عورت نہ تھیں ۔ وہ ان عورتوں میں سے تھیں جنہوں نے ہر قسم کا کالا اور سفید جادو ورثے میں پایا ہوتا ہے اور جنہیں دوسروں کو بس میں اور مطیع کرنے والے سارے منتر یاد ہوتے ہیں ۔ ماں جی کے چلے جانے کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے تھے اور ہر قسم کی گفتگو بے تکلفی سے کر لیتے تھے ۔ ایک بار انہوں نے مجھے ماں جی سے اپنی پہلی ملاقات کا قصہ سنایا۔

ایک روز وہ اپنے مویشی چرانے پاڑ میں لے گئے ۔ پاڑ بمعنی تقسیم وہ علاقہ ، جہاں ایک گاؤں کی حد ختم اور دوسرے کی شروع ہوتی ہو۔ وہاں ساتھ والے گاؤں کی دو جوان لڑکیاں اپنے کھیت سے ساگ توڑ رہی تھیں ۔ ابا کا کوئی مویشی ان کے کھیت میں چلا گیا۔ وہ لٹھ لے کر دوڑے اور اپنے مویشی کو واپس لے آئے مگر ان میں ایک جو قدرے بڑی تھی بہت خفا ہوئی اور دیر تک انہیں برا بھلا کہتی رہی ۔ مگر دوسری خاموش رہی ۔ صرف اتنا کہا۔ ''جانے دو آپا۔ اس بے چارے کا کیا قصور''

ابا کہتے ہیں انہوں نے اپنے گھر میں تو کیا پورے گاؤں میں اتنی حلیمی اور حلاوت سے بات کرنے والی عورت نہ دیکھی تھی ۔ ایک اجنبی لڑکی کے منہ سے ہمدردی، اپنائیت اور محبت سے لبریز یہ سیدھا سادا سا جملہ ان کے دل میں اتر گیا، اور کئی دن تک کانوں میں گونجتا رہا۔ آخر کار انہوں نے والدہ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ وہ اسی گاؤں اور برادری کی تھیں اور سب کو جانتی تھیں ۔ اگلے ہی روز اسے ان کے لئے مانگ آئیں

وہ اپنے سسرال آئیں تو ان کا پالا میری چاچیوں اور پھوپھیوں سے پڑا اور بقول ابا کے ایک معصوم

ہرنی بھگیاڑیوں میں گھر گئی۔مگر انہوں نے اپنی وضع نہ بدلی۔میری ایک پھوپھی نے جونو جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں اور دنیا کی ہر سہاگن کو اپنے جیسا دیکھنا چاہتی تھیں، زبان کی قینچی چلاتے چلاتے ایک روز سچ مچ کی چھری سے انہیں زخمی کر دیا۔مگر انہوں نے ابا سے کہا سبزی کاٹتے ہوئے ان کا ہاتھ کٹ گیا۔مجھے بھی منع کر دیا کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کروں ۔ پھوپھی جان پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔وہ ان کی اس کشادہ دلی اور درگزر سے خوفزدہ سی ہو گئیں۔کہتیں یہ کسی عام انسان کے بس کا کام نہیں۔

میرا خیال ہے ابا ٹھیک ہی کہتے تھے ان کے رویے میں بردباری اور لہجے میں ایک عجیب سی مٹھاس تھی۔وہ سرتاپا شفقت اور محبت تھیں جس سے بڑا جادو دنیا میں ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔اپنے شوہر اور بچوں سے ہی نہیں وہ اپنے والدین، بھائی بہنوں اور دیگر رشتے داروں سے بھی بے حد محبت کرتی تھیں ۔اپنے اکلوتے بھائی سے تو انہیں بہت ہی لگاؤ تھا۔مجھے یاد ہے ایک بار ماموں سے ملاقات کوئی مہینے ہوگئے ۔وہ ان کے لئے بہت اداس رہتیں ۔ایک روز میکے گاؤں کا کوئی آدمی ملنے آیا اور پوچھا بہن جی کوئی سکھ سنیہا ؟

مجھ سے کہا ماموں کے نام خط لکھ دو۔میں قلم دوات لے آیا اور کہا لکھوائیں

انہوں نے صرف ایک مصرع لکھوایا: آقلمے منہ لا سیاہی متھا ادب گھسا کے۔اور چپ ہوگئیں۔میں سمجھا انہیں دوسرا مصرعہ بھول گیا ہے میں نے کہا۔آگے بھی تو بولیں ۔بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگیں ''مجھ سے نہیں لکھوایا جاتا۔تم خود ہی کچھ لکھ دو''

میں نے لکھ دیا۔ماموں جان اس کے بعد آپ کی بہن کی آواز بھرا گئی۔

میں نے خط لفافے میں بند کر کے ننھیال کے آدمی کو دے دیا اور وہ چلا گیا۔اگلے روز ہم ابھی ناشتہ کر رہے تھے جب ماموں جان کی گھوڑی کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔پلٹ کر دیکھا تو وہ اندر آ رہے تھے۔ماں جی ننگے پاؤں دروازے کی طرف دوڑیں۔''بسم اللہ میرا ویر''

ماموں جان ان سے کچھ ہی بڑے تھے مگر وہ ان کا والد کی طرح احترام کرتی تھیں ۔علیک سلیک اور چائے ناشتے کے بعد ماموں جان نے میرا لکھا ہوا رقعہ جیب سے نکالا اور خفگی سے بولے

''تم نے رقعے میں مجھے لکھا ہے اس کے بعد آپ کی بہن کی آواز بھرا گئی۔گرامر کے لحاظ سے تو جملہ ٹھیک ہے مگر میں پوچھتا ہوں میری بہن تمہاری کچھ نہیں لگتی ؟''

میں نے کہا ''ماموں جان آپ برا نہ مانیں میرا کوئی قصور نہیں انہوں نے مجھے منع کر رکھا ہے کہ آپ کے اور نانا جی کے سامنے ان کو ماں جی کہہ کر نہ بلاؤں''

''کیوں؟''

''یہ تو آپ ان سے پوچھیں۔کہتی ہیں مجھے شرم آتی ہے''

اس پر ابا اور ماموں دیر تک ہنستے رہے اور وہ محجوب ہوتی رہیں۔

نہر کے پندرہ میلوں میں چھے پل اور تین گدوں پلیاں آتی تھیں ۔جب ہم تیسرے پل پر تھے اور تقریباً نصف فاصلہ طے کر چکے تو اچانک میری بائیسکل کے پہیے جام ہوگئے یا شائد ٹانگوں کی رہی سہی سکت بھی جاتی رہی ۔میں نیچے اترا اور بائیسکل کو سٹینڈ پر کھڑی کر کے اس کے وہیل گھمانے لگا۔نواب آگے چلا گیا تھا وہ پلٹ کر آیا۔اس نے پہیے اور فرائی وہیل چیک کیا اور ناراض ہو کر بولا ''تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ میں انہیں زندہ سلامت چھوڑ کر آیا تھا''

میں نے کہا ''نواب ایسا لگتا ہے کچھ ہوگیا ہے۔میرا دل بیٹھا جا رہا ہے''

'' کچھ نہیں ہوا تم یوں ہی دل چھوڑ بیٹھے ہو''۔اس نے کہا۔پھر قریبی ٹیوب ویل سے پانی لا کر مجھے پلایا اور تسلی دی اور مجھے اپنا کندھا تھام کر چلنے کو کہا

میں کچھ دیر اس کا کندھا تھام کر بائیسکل چلاتا رہا۔پھر آہستہ آہستہ سب کچھ نارمل ہوگیا۔جب ہم گاؤں پہنچے۔لوگ جمع تھے۔انہیں نہلایا جا چکا تھا اور ان کا جنازہ ہمارے انتظار میں رکھا ہوا تھا۔

بعد میں ہمیں بتایا گیا کہ صبح سے ان کی آنکھیں دروازے پر لگی تھیں ۔بار بار طبیعت خراب ہوتی اور سانس اکھڑ جاتا مگر وہ خود کو سنبھال لیتیں ۔آخر کار تھک ہار کر ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔اور یہ عین وہی لمحہ تھا جب ہم آدھا راستہ طے کر چکے تھے اور جب میری بائیسکل کے پہیے جام ہوگئے اور دل بیٹھ گیا تھا۔لیکن میں آج تک اسکی کوئی عقلی اور سائنسی توجیح نہیں کر پایا کہ ایسا کیسے ہوگیا تھا۔کیا یہ بھی کوئی طلسم تھا؟

مشرف عالم ذوقی (دہلی)

لیبارٹری

گندہ تالاب، کیکڑے اور وہ

یہ قیاس لگانا بہت آسان ہے کہ وہ کہاں پیدا ہوئے ہوں گے —— وہ سابرمتی آشرم سے دلی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ کہیں، کسی بھی طرح، کسی بھی حال میں —— لیکن معاف کیجیے گا۔ اُنکی پیدائش کے عمل کو کسی بھی طرح میں 'کلوننگ پروسیس' سے جوڑنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اس لئے کہ کلوننگ کے ذریعہ چاہے وہ بھیڑ، ہو یا انسان —— اور یقیناً آپ تسلیم کریں گے کہ سائنس کی تجربہ گاہیں، انسانی تجربہ گاہوں کے مقابلے، کم خطرناک ہیں —— نہیں، اس بحث کے لئے ڈولی بھیڑ' یا پہلے انسان 'مکاؤف' کے تصور سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ سائنس کا پیدا کردہ انسان بھی گوشت پوست کا ہی انسان ہوگا مگر اُس انسان سے کم خطرناک ہوگا —— جو انسان کے ذریعہ، انسانی فضا میں، انسانی گھر، انسانی کمرے میں اور انسانی عمل کے دوران عالم وجود میں آ گیا ہے —— (اس لئے تسلیم کر لیتے ہیں کہ کلوننگ کا انسان دوم درجے کا انسان ہوگا، کہ اُس کے اندر جنگ اور تہذیب کے جراثیم وہ شدّت اختیار نہیں کر پائیں گے جو............)

اس لیے فرض کرتے ہیں کہ وہ وہی تھے جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں، انسانی عمل کے دوران ——

اور فرض کرتے ہیں کہ وہ سابرمتی آشرم سے دلّی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا، ہو سکتے ہیں ——

○○

وہ کئی تھے۔ چار، پانچ چھ، سات، آٹھ ...... یعنی کل ملا کر اتنے کہ اُنکی گنتی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ وہ بیحد نرم ملائم، سادہ لوح یا ایسے تھے، جن کو لے کر پانیوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔ یعنی کسی بھی برتن میں ڈال دو —— وہ ایسے تھے کہ آپ اُن کا کچھ بھی استعمال کر سکتے تھے —— اور جس دن کا واقعہ ہے، اُس دن دوپہر کا سورج آگ برساتا ہوا اپریل مہینے کو جلانے اور جھلسانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دو بجے کا وقت ہوگا۔ 'وہ' بہرکیف، ساری رات کے تھکے ہوئے —— ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے بیٹھے، گندے پانی سے بار بار نکلتے اور اندر جاتے کیکڑے کا لطف لے رہے تھے ——

'کیکڑے کے کتنے پاؤں ہوتے ہیں۔'

دوسرا زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا —— کیکڑے کی آنکھیں کہاں ہوتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا ——'

'سالے میں نے پاؤں کے بارے میں پوچھا تھا۔

—— 'اور میں نے آنکھوں کے بارے میں۔'

اُن میں ایک سن رسیدہ تھا۔ اُس کی بڑی بڑی دانشورانہ، آنکھوں میں چمک لہرائی۔ 'دیکھو، کتّے کو......'

'کتّا نہیں کیکڑا'

'ایک ہی بات ہے۔'

'ایک ہی بات کیسے، تم اور میں کیا......'

وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھا —— ایک ہی بات ہے...... دیکھو...... دیکھو کیکڑا مٹی سے پھر باہر نکل آیا۔

'بارش ہوگی۔'

'اِن سالوں کو پتہ کیسے چل جاتا ہے۔'

'بارش کی اطلاع ملتے ہی کیکڑے اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں۔'

'اسی سنجیدہ قسم کے دانشور نے اطلاع بہم پہنچائی۔ کیکڑے کے بارہ پاؤں ہوتے ہیں۔ کینکڑے اپنے پاؤں کا حساب نہیں رکھ پاتے۔ انکے لئے زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو۔ دیکھو...... سالا گرا ——

بارہ پاؤں نہیں۔ کینکڑے کے دس پاؤں ہوتے ہیں ——

'آٹھ......'

'چھ......'

پہلے نے گفتگو کے رُخ کو ہی بدل دیا تھا۔ کیکڑے کے ہاتھ کہاں ہیں؟ آں؟ ہاتھ ——

'ہاں، ہاتھ کہاں ہیں؟'

پہلا پُر اُمید تھا —— 'دراصل آپ لوگ جسے پیر سمجھ رہے ہیں وہ......'

'ممکن ہے۔'

'نہیں —— یا تو کیکڑے کے ہاتھ نہیں ہوتے یا پاؤں۔'

○○

دھوپ سخت تھی، لیکن اچانک بادلوں کا ایک کارواں دھوپ کے آگے سے گزر گیا۔

'بارش ہو سکتی ہے۔'

'نہیں بھی۔'

'کیکڑے زمینوں سے باہر آ رہے ہیں، اس لئے ممکن ہے......'

کیکڑے زمینوں سے باہر نہیں آ رہے ہیں، جان بچا کر بھاگ رہے ہیں۔'

'جان بچا کر——'

'بارش کے موٹے موٹے قطرے، پتھر بن کر......'

'معصوم کیکڑے۔'

'قطعی نہیں——' بیحد سنجیدہ نظر آنے والے دانشور نے منطق کا حوالہ دیا—— ایسے بدنما، بدصورت، بدہیئت اور اس گندے آکٹوپس کی چھوٹی قسم کو کیا نام دیں گے۔ یہ کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن معصوم نہیں ہوسکتا۔

وہ دیر تک سر جوڑے بے بنیاد، غیر دلچسپ گفتگو میں الجھے رہے کہ کیکڑہ عالم وجود میں کیسے آتا ہے۔ کیکڑہ دیکھتا کیسے ہے؟۔ کیکڑا زندہ کیسے رہتا ہے۔ کیکڑے کی زندگی کتنے دنوں کی ہوتی ہے۔ یا، کیکڑوں کے پاس زندگی کا تصور کیوں نہیں ہے۔ کیکڑے اپنی حفاظت کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔ وہ دیر تک سر جوڑے بیٹھے تھے کہ بادلوں کی اوٹ میں گم ہوتے سورج نے اِن کی تفریح طبع کے لئے بارش کی کچھ موٹی بوندیں آسمان سے بھیج دیں۔ کیکڑا کچھ لمحے تک تڑپا۔ پانی کے چھوٹے سے گڈھے میں 'اچھلا' کودا—— اوپر نیچے کیا۔ بارش ذرا تیز ہوئی تو چھوٹے سے گڈھے میں کیکڑے کی لاش تیر رہی تھی۔

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے اُٹھے——

——'جو اپنی حفاظت نہیں کر پاتے ہیں'

دوسرے نے جوڑا—— جو زندہ رہنا نہیں جانتے ہیں۔

تیسرا مسکرایا—— اور جو اقلیت میں ہوتے ہیں...... اقلیت، وہ اس لفظ پر دل کھول کر ہنسا۔

'ہم نے جو کچھ دیکھا، وہی اس کی زندگی تھی۔ یعنی بس اُتنی ہی زندگی، جتنی ہم دیکھ سکے۔ اُس نے ذرا سا ہاتھ پاؤں مارا اور——'

'اس کی لاش کا کیا کیا جائے۔' دانشور، سنجیدہ تھا۔ بارش سے گیلی ہوئی مٹی اُس نے دونوں ہاتھوں میں بھری۔ کیکڑے کے 'جسم' پر ڈالی۔ عقیدت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔

'رام نام ستیہ ہے۔'

دوسرے نے تڑکہ لگایا، 'جھوم کے بولو ستیہ ہے۔

'ناچ کے بولو ستیہ ہے'

'گا کے بولو ستیہ ہے۔'

'رام نام ستیہ ہے......'

بارش کی رم جھم جاری تھی۔ کپڑے بھیگ چکے تھے۔ چلتے چلتے 'یہ کئی' ٹھہر گئے۔ پہلے نے دوسرے کو—— دوسرے نے تیسرے...... تیسرے نے چوتھے...... یعنی سب نے ایک دوسرے کو باری باری سے دیکھا——

پہلے کی آواز مدھم تھی...... 'رام نام......'

اس کے بعد کوئی کچھ نہیں۔ سب خاموش ہوگئے۔ اور اٹھ کر یونہی آوارہ گردی کے لیے نکل گئے——

کالی رات' مہذب لوگ اور تجربہ گاہ

وہ مہذب لوگ تھے۔ وہ اتنے مہذّب تھے کہ اپنے مہذب ہونے کی دلیلیں دے سکتے تھے۔ اور اُن کی دلیلیں اتنی باوزن ہوا کرتی تھیں کہ اُن دلیلوں پر چپ چاپ لوگ سر جھکا لیا کرتے تھے۔

محترم قارئین، یہاں اُن بہت ساری سیاہ راتوں کا ذکر ضروری نہیں ہے، جو 'تجربے' کے لئے اُن کی لیبارٹری میں رکھی ہوئی تھیں۔ لیبارٹری۔ وہ تہذیب سے جڑی ہوئی ہر شئے کو اپنی تجربہ گاہ میں لے جاتے تھے۔ اُنہیں سائنس میں مکمل یقین تھا۔ ردرفورڈ' سے آئن اسٹائین اور گراہم بیل سے نیوٹنس لاء کے بارے میں اُن کی معلومات خاصہ وسیع تھیں۔ جیسے وہ جانتے تھے کہ ہر ایک عمل کا اُس کے مساوی اور مخالف ایک ردّ عمل ہوتا ہے۔ مادّہ کے فزیکل اور کیمیکل ریئکشن پر اُن کی خاص نظر ہوا کرتی تھی۔ اور وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم آج تک کی، اس سب سے زیادہ مہذب دنیا کے، سب سے زیادہ مہذب باشندے ہیں۔ اور یہ بات اُنہوں نے اپنی گرہ میں باندھ لی تھی کہ اِس مہذب دنیا کا اصول ہے، جو طاقتور ہیں، وہی زندہ رہیں گے۔ یعنی جو اقلیت میں ہیں، کیڑے مکوڑے یا کیکڑے وہ ویسے بھی مُردہ ہیں اور اُنہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔

تو یہ مہذب لوگوں کی لیبارٹری تھی، جہاں یہ جاننے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ تہذیب اور جنگوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جنگیں ہی وہ بیش قیمت زیور ہیں، جن سے ہمیشہ سے تہذیبوں کو آراستہ کرنے کا کام لیا جاتا رہا ہے۔

تو فرض کر لیتے ہیں، یہ وہی تھے جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں اور انسانی عمل کے دوران——

اور فرض کر لیتے ہیں کہ وہ سابرمتی آشرم سے دلّی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا ہو سکتے تھے——

وہ 'کئی' تھے اور پچھلی کئی راتوں سے لیبارٹری کے لئے کام کر رہے تھے——

اور یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ وہ کوئی بہت دل سے اپنے کام کو انجام نہیں دے رہے تھے۔ نہ اُنہیں مجبور کیا گیا تھا۔

بلکہ وہ ایک 'چھوٹے' سے خوف کی بنیاد پر، کہ اس طرح مہذب لوگوں کی دُنیا سے اُنہیں 'دیش نکالا' مل سکتا ہے——وہ اپنے ضمیر کی آواز پر اس کام کے لئے تیار ہو گئے تھے——

اور اس لئے بھی—— کہ ان میں سے سب کے پاس ایک خاندان تھا——خاندان میں ماں باپ تھے——بھائی بہن تھے۔ بیوی تھی اور بچے تھے......

اور اس لئے بھی...... کہ بچے معصوم ہوتے ہیں——

اور اُن سے کہا گیا تھا۔ جو مضبوط ہوتے ہیں، بس اُنہیں ہی جینے کا حق ہوتا ہے۔ تہذیب کا فرمان بھی یہی ہے۔

اکثریت کی آواز بھی یہی——اور اقلیتوں کو......

اُنہیں چانکیہ کے اشلوک پڑھائے گئے تھے......

nqjtZuLFk p liZL; oja liksZ u nqtZu %A

likZs na'kfr dkys rq nqtZuLrq ins insAA

(بُرے انسان اور سانپوں میں اگر موازنہ کیا جائے تو سانپ بہتر ہے
کیونکہ سانپ اُسی وقت ڈستا ہے جب موت آتی ہے اور انسان تو قدم
قدم پر ڈستا رہتا ہے——)

اور اُنہیں بتایا گیا، اس سے پہلے کہ وہ آپ کو ڈسیں، آپ کی تہذیب کو۔ آپ......

○○

وہ کئی تھے——

اور کئی' گیس کے سلنڈروں سے بھرے ٹرک پر 'لد' کر ساری رات تہذیب کے نام نئی نئی فنتاسی کو جنم دیتے رہے۔ یعنی ایسی فنتاسیوں کو جن کے تذکرے نہیں ہو سکتے۔ جن پر گفتگو نہیں ہو سکتی۔ زندہ معصوم بچوں کو نئے نئے دلچسپ طریقوں سے آگ میں زندہ جلانے سے لے کر، آبرو ریزی اور حاملہ عورتوں کی کوکھ میں ہاتھ ڈال کر—— نہیں جانے دیجئے۔ فنتاسی لفظوں کا لباس اوڑھ لے تو ذائقہ جاتا رہتا ہے۔

آپ ایسا کیجئے۔ آپ خود ہی اچھی سی فنتاسی گڑھ لیجئے۔ کیونکہ آپ نے ایک طرف جہاں 'اتہاس' کے قصے پڑھے ہیں، وہیں ہٹلر، مسولینی، چنگیز خاں اور نریندر مودی کے نام بھی سُنے ہیں۔ آپ بابر سے بابری مسجد تک سب کچھ جانتے ہیں——

اس لئے ذائقہ دار فنتاسیاں گڑھ لیجئے۔ جس قدر چاہیے 'رس' یا 'گھول' ملا لیں۔ آپ کی مرضی——

○○

محترم قارئین،

وہ کئی تھے——

اور وہ وہی تھے جو سابرمتی آشرم سے دلّی آشرم چوک تک......

اور وہ وہی تھے جو انسانی فضا، انسانی گھر اور انسانی......

○○

سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا——

پچھلے کئی دنوں سے وہ 'تہذیب' کو بچانے میں لگے تھے۔ اور آپ جانتے ہیں، تہذیبوں کی حفاظت میں ایسی ہزاروں جانوں کا نقصان تو ہوتا ہی ہے——ہزاروں جانیں لی گئی تھیں۔ وہ بھی ہزاروں طریقوں سے—— مگر——اُس گھر میں جو کچھ ہوا، وہ نیا تھا۔ ایک اکثریتی فرقہ کے شخص نے اقلیتی فرقہ کے کچھ لوگوں کو 'پناہ' دی تھی، کہانی بس یہیں سے پیدا ہوئی تھی۔

وہ بس اُس آدمی کو دیکھ رہے تھے جو گھگھیائی ہوئی آواز میں اِن لوگوں کو دیکھ کر چیخ پڑا تھا۔

'مجھے نہیں۔ میں تو اکثریت......'

'اکثریت!'

'ہاں۔ میری متی ماری گئی تھی......' وہ پاگلوں کی طرح چیخا___ یہ میری بیوی ہے یہ بہن۔ یہ بیٹی ہے۔ اور یہ بیٹا۔ یہ سب میرے ہیں۔ ہاں اُنہیں۔ انہیں لے جاؤ۔ جو بھی کرنا ہے کرو۔ کرو۔ میری متی ماری گئی تھی۔ میں بیوی کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ دوست ہے۔ بچا لو۔ میں گھر لے آیا۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ وہ چاروں...... لے جاؤ...... لے جاؤ......' وہ اپنے گھر کے لوگوں کو ایسے گھیر کر کھڑا تھا، جیسے چڑیا انڈے سیتی ہے۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ بدن ڈول رہا تھا۔ آواز میں گھبراہٹ تھی۔ بیوی، بہن، اور بچوں کی حالت بھی وہی تھی۔

'تم نے بچایا کیوں؟'

'میں نے کہا نا۔ بیوی نے......'

'میں نے نہیں،' بیوی چیخی۔ جھوٹے ہو تم۔'

'م......م......میری بیٹی نے......'

'خیر جو بھی ہو،' یہ کئی' اُن کی طرف گھومے۔ وجہ جو بھی ہو لیکن تم نے بچانے کی کوشش کی۔ اس لئے کہ......دوست!

'میں نے کہا نامتی ماری گئی تھی۔'

'یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ اقلیت ہے۔'

بیوی نے بیٹی کوایک گندی سے گالی بکی' وہ اُس کے ساتھ پڑھتی ہے۔اس لئے دوست لگتی ہے۔'

دوست کوئی نہیں ہوتا' دانشور سنجیدہ تھا۔دوستی برابر والوں میں ہوتی ہے۔اکثریت کی اکثریت سے اور......'

'ہمیں چھوڑ دو......چھوڑ دو......انہیں لے جاؤ......'

دانشور نے اقلیت کے چاروں گنہگاروں کی طرف دیکھا۔وہ سچ مچ ایک لاش بن گئے تھے۔چہرے سپید پڑ گئے تھے جسم میں خون نہیں۔چاروں مذبح کے جانوروں کی طرح اُداس کھڑے تھے۔یعنی کس کی باری پہلے آتی ہے۔پھر کس کی باری___

دانشور نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔

'باہر آؤ' اُس نے گھر کے لوگوں کو غصے میں اشارہ کیا۔باہر کوئی نہیں بھاگے گا۔جو جیسے ہے۔جس حال میں ہے، ویسے ہی۔میرا مطلب......

اکثریت والا اب بھی چلاّ رہا تھا۔انہیں لے جاؤ......میری تو متی ماری گئی تھی۔

○○

یہ کئی' اب باہر تھے۔باہر' ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے۔

'دیکھو——' دانشور سنجیدہ تھا۔ذرا سوچو۔یہ ایک بے حد حسین تجربہ ہوگا، یعنی اس سے پہلے جتنے تجربے ہم کر چکے ہیں، یا ہم کریں گے۔یا ہم کرنے والے ہیں۔'

سب نے ایک دوسرے سے کانا پھوسیاں کیں۔پھر پُر امید ہو گئے۔

'اب کیا ارادہ ہے!'——دانشور جلد از جلد اپنی 'پیاس' کو انجام دینا چاہتا تھا۔

'باس۔مکان مالک کا کیا کیا جائے۔'

'وہ تو اکثریت کا......' پہلا بولتے بولتے ٹھہر گیا۔

دانشور غصے میں بولا۔پریشانی اب ایسے ہی لوگوں سے پیدا ہوئی ہے۔ایسے ہی لوگ......یہی لوگ ہمارے اب تک کے تجربے کو ناکام کرتے رہے ہیں۔'

'تو سب سے پہلے......'

دانشور نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔"ساری باتیں یہیں کر لوگے کیا۔کچھ اُن لوگوں کے لئے چھوڑو۔اُنہیں معلوم ہونا چاہئے۔اُن کے ساتھ کچھ لمحوں میں، آنے والے کچھ لمحوں میں کیا ہونے والا ہے۔"

اگلے ہی لمحے، یہ لوگ اندر تھے___ سامنے اکثریت اور اقلیت کے سہمے ہوئے 9 افراد ان کے فیصلے کے منتظر تھے۔

'آہ، فنتاسی۔' دانشور چلاّیا۔دوسرے ہی لمحے اُس کی آواز بدل گئی—— تہذیب ہر بار انصاف کرتی ہے۔جیسے کوتیا۔یہ تہذیب کا اصول ہے۔یہ، یہ بہت زیادہ چلاّ رہا تھا۔اس کے منہ میں تیزاب کے قطرے ٹپکاؤ۔تیزاب کے قطرے......آہ، اور اُس کی بیوی۔وہ بہت تیز بولتی ہے۔مرچی کی طرح۔پہلے اُس کے جسم پر، آنکھوں میں مرچی کے پاؤڈر ڈالو——بیٹی نے بچانے کی کوشش کی تھی۔ہے نا۔ایک بیحد پیاری عمر۔اور اس عمر میں ایک بیحد پیارا چہرہ۔جیسا ہونا چاہئے—— اسے بانٹ لو۔ایسا کرو۔دونوں بچیوں کو بانٹ لو۔اِن کے سامنے۔تفریح کرو——اِن میں سے کوئی کچھ نہیں بولے گا۔جسم تفریح کے لئے ہوتا ہے۔کمسن کے گوشت زیادہ ذائقہ دار ہوتے ہیں۔

'اور___اقلیت والوں کے لئے باس۔'

ایک بار میں ایک فنتاسی۔ان کے لئے کچھ الگ سوچتے ہیں۔سب سے پہلے اُس سنپولئے کو۔اس کا بھیجا اُڑا دو۔اقلیتی طبقے کا سنپولیا خطرناک ہوتا ہے۔حرامی۔

بچے نے تھوک دیا تھا۔

پہلے نے ریوالور تان لیا——اور اس درمیان ایک گندی گالی بکتا ہوا اکثریت کا بچہ سامنے آ گیا تھا۔

"تو بھاگ جا——"

'دھائیں۔'

دوسرا بچہ ایک لمحے کے لئے دوسرے کمرے میں پھر......رہ گیا۔گولی دوسرے بچے کے سینے پر لگی تھی۔سینے سے خون کے فوّارے چھوٹ پڑے تھے۔کوئی بھی نہیں چیخا——

سب جیسے اس کھیل کے خاتمے سے پہلے ہی انجام' کو جان چکے تھے۔

دانشور نے کھیل کا طریقہ سمجھایا——اِسے پنکھے سے لٹکا دو۔اُس کی ساڑی ہٹاؤ۔پہلے بلیڈ سے وہاں تک......پھر——' اُس نے بچیوں کو جلتی آنکھوں سے دیکھا——یہ نئے کپڑے کی طرح ہیں۔قینچی سے کبھی نئے کپڑے کو کاٹا ہے۔ان کی چھاتیاں......' وہ مسکرا رہا تھا۔بلیڈ گھماتے ہوئے' تم ایک عجیب سے نشے میں ڈوب جاؤ گے۔'

تو یہ کمرہ اب ایک لیباٹری تھا۔تجربے چل رہے تھے۔نئے نئے تجربے——موت۔عورتیں اور مرد——جوان بچیاں اور فنتاسی——زندگی اور ایڈونچر——زمین پر ایک گھنٹے کی تفریح کے بعد آٹھ لاشیں سجی تھیں۔

'حکم باس۔' پہلا آہستہ سے بولا۔

یہ طے تھا کہ سب تھکن سے چور ہو گئے تھے۔

’ابھی آخری فنتاسی باقی ہے۔یعنی آخری تجربہ۔ دونوں مرد کی لاش چھوڑ دو۔ باقی گھسیٹ کر اندر لے جاؤ۔ ہم ایک نیا تجربہ کریں گے۔‘

’ان کے عضوتناسل کاٹ دو‘ دانشور سنجیدہ تھا۔اورتم —— تم سلائی جانتے ہونا۔ ماڈرن ٹیلرس کے بچے۔ کپڑے سیتے سیتے انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں تیری۔‘

’حکم...... حکم باس‘

’ان کے عضوتناسل بدل دو۔‘

’مطلب ۔مطلب باس۔‘

’’اِن سالے سوکالڈ......‘ اُس نے پھر گندی سی گالی بکی —— ان سالوں کو بتانا ہے اب۔ سمجھانا ہے —— دھرم کو کھیل سمجھنے والوں کومزہ چکھانا ہے —— یہ، جو ہر بار ہمارے تجربوں کو —— اُس نے پھر گالی کا سہارا لیا —— اچانک چونکا —— یہ آوازیں سن رہے ہو۔ ہمارے دوسرے ساتھی یہاں پہنچنے ہی والے ہیں —— اُنہیں دیکھنے دو کہ ایسے لوگوں کے پاس نہ اپنا دماغ ہوتا ہے، نہ عضوِ تناسل ۔اب آپریشن شروع کرو ——‘

آپریشن شروع ہوگیا۔

پھر ٹیلر ماسٹر نے جیب سے قینچیاں، فیتے اور بلیڈ کا پیکٹ نکال دیا۔ وہ ایک منجھے ہوئے درزی کی طرح بدن کے ’چادر‘ کو لے کر بیٹھ گیا —— چمڑے کی جھلّی، جو نئے انسانی وجود کے لئے زندگی کا امرت بن جاتی ہے۔ فنکاری اور صفائی سے بدل دی گئی تھیں۔ٹیلر ماسٹر نے انتہائی مہارت سے اپنا کام انجام دیا تھا۔ساتھیوں نے شاباشی دی۔ کندھے تھپتھپائے۔ دونوں لاشیں۔ باہر مین گیٹ پر ٹانگ دی گئیں ——‘

تجربہ کامیاب تھا۔

مگر کھیل اب شروع ہوا تھا ——

تہذیب کے پیامبر ڈھول،تاشہ بجاتے آتے ۔عضوتناسل کو دیکھتے۔ گندی گالیاں بکتے پھر گزر جاتے —— وہ دیر تک بلکہ کہنا چاہیے کئی گھنٹے تک اس کھیل سے مستفیض ہوتے رہے۔ چلتے وقت دانشور نے قہقہ لگا کر کہا۔

’صرف بدن کی ایک چمڑی بدل دینے سے ۔تم سب سمجھ رہے ہونا —— آہ، کیا کیا دلکش کھیل تھا۔‘ آہ، اس کھیل کو ہم بہت دن تک بھول نہیں پائیں گے۔ اورہمیں اُس ۔اُس مکاّر مکان مالک کو اُس کے کئے کی سزا بھی دینی تھی۔ اب اُس کی لاش دیکھو۔اُس کی لاش کی تکا بوٹی ہو چکی ہے۔ جبکہ اقلیت کی لاش۔‘

’باس‘ اُس پر تو پھول مالائیں چڑھی ہیں۔‘

’اب چلو، اس کھیل کا سرور تا زندگی قائم رکھنا ہے۔‘

وہ جھومتے ہوئے نشہ کی حالت میں آگے بڑھ گئے۔

○○

بچہ اور زندگی

’تمہیں وہ بچہ یاد ہے‘

’بچہ؟‘

’باس، وہ اقلیت کا بچہ، ہم تو اُس بچے کو بھول ہی گئے۔،

’اُسے بچانے مکان مالک کا بچہ آ گیا تھا۔‘

’پھر ہم کھیل میں الجھ گئے۔‘

’اور بچہ بھاگ گیا۔‘

’وہ بچہ کہاں جا سکتا ہے ——؟‘ دانشور کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

’اُس کی نیلی نیلی آنکھیں‘ پہلا مسکرایا۔ تمہیں اُس بچے کی یاد ہے۔ اُس کے چہرے پر زرا بھی ڈر یا گھبراہٹ نہیں تھی۔‘

’اُس کے ہونٹ‘ دوسرا کہتے کہتے ٹھہرا......

’بولو...... بولو......‘ دانشور کی آنکھیں مند گئی تھیں۔

’کھٹّے کھٹے بیر جیسے تھے۔اور پیارے۔‘

’اُس کا چہرہ۔‘ تیسرے نے اپنے خیال کا اظہار کیا —— یقیناً وہ ایک بہت خوبصورت بچے کا چہرہ کہا جا سکتا ہے۔‘

’وہ کہاں چھپا ہوگا؟‘ دانشور کو اپنی غلطی پر غصہ آ رہا تھا۔

’اُسے چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔‘

’اُسے مارنا......‘ پہلا کہتے کہتے ٹھہر گیا......

دانشور نے حیرانی سے پوچھا__ ’کہیں تم سب اُس بچے پر رحم تو نہیں کر رہے۔‘

’نہیں باس۔ قطعی نہیں۔‘

’مگر کیا اُسے مارنا......‘

دانشور غصے میں گھوم گیا۔ مطلب۔’تم لوگ کہنا کیا چاہتے ہو؟

’بچہ ہے۔‘

’بچے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔‘

’کیوں نہ ہم اُسے اکثریت کا بنا دیں؟‘

’اکثریت ——؟‘ دانشور چونک گیا تھا۔

’ہاں۔ دھرم پریورتن۔ بچہ تو پانی ہوتا ہے۔

دانشور کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ابھی زیادہ گھنٹے نہیں ہوئے۔ بچہ بھوک پیاس سے بے حال ہو رہا ہوگا۔ وہ یقیناً چھپا اور زندہ ہوگا۔ ہمیں بچے کو تلاش کرنا چاہیے۔

’اور بچانا بھی۔‘

پہلا ابھی بھی مطمئن نہیں تھا۔ کیا وہ وہاں موجود ہوگا —— میرا مطلب ہے......‘

دانشور نے پُر امید لہجے میں کہا۔ فضول کی باتیں نہیں۔ ہم اس مدعے پر بہت باتیں کر چکے ہیں۔

’بچے کی زندگی ضروری ہے‘ —— ٹیلر ماسٹر نے لمبی سانس لی۔

’ہاں، اُس کی زندگی بیش قیمت ہے‘ —— یہ پہلا تھا۔

اُس کی زندگی سے، یعنی اب کی زندگی سے۔ نئی زندگی سے بہت کام لینے ہیں‘۔ یہ دانشور تھا۔

○○

محترم قارئین!

تو یہ سارا کچھ اُس چھوٹے سے بچے کے لئے ہوا —— اُس چھوٹے سے آٹھ سالہ بچے کے لئے، جس کی آنکھیں نیلی تھیں، چہرہ خوبصورت تھا اور جس کا تعلق اقلیت سے تھا۔ تو یہ سب کچھ اُس چھوٹے سے بچے کے لئے ہوا، جس کے لئے اکثریت کے بچے نے، بچاتے ہوئے اپنی جان دے دی اور جو تہذیب کی اس جنگ کے دوران جان، بچانے کے لئے اپنے گھر میں ہی لا پتہ ہو گیا تھا۔ اور یقیناً ایسے بچے کو بچانا ایک اہم فریضہ تھا۔ اور جیسا کہ دانشور نے سوچا، تہذیب کے عروج کے لئے، مذہب کو ہی واحد ہتھیار کے طور پر سوچا جا سکتا ہے۔ بچے کا دھرم پریورتن ہو جائے تو......

اور یقیناً یہ ساری جنگ تہذیب کے لئے، تہذیب کے نام پر لڑی گئی تھی۔ اور اُن کے سوچنے کا پڑاؤ وہی گندہ نالہ یا تالاب تھا، جہاں اُنہیں وہ کینکڑ املا تھا —— یا بلوں سے نکلتی برساتی کالی چیونٹیوں کو انہوں نے پاؤں تلے روند دیا تھا۔

وہ دوبارہ جلے ہوئے مکانوں اور جلی ہوئی شاہراہوں سے گزرتے ہوئے اُس مکان تک پہنچ چکے تھے۔ آسمان پر

کوّوں اور گدّھوں کی اُڑان دور تک دیکھی جا سکتی تھی...... ابھی بھی آس پاس کئی مکانوں سے دھوئیں نکل رہے تھے۔

’بچے طاقتور ہوتے ہیں۔‘

دانشور مسکرایا —— ہاں‘۔

’اور اسی لئے بچے سب کچھ سہہ لیتے ہیں۔ عذاب، بارش اور جنگ!‘

’ہاں۔‘

’بچے مرتے نہیں ہیں‘

’ہاں‘

’بچے مر کر بھی نہیں مرتے ہیں، دانشور پھر مسکرایا۔ ’اُسے آواز لگاؤ۔ کھوجو‘

’لیکن ہم پکاریں گے کیا؟

’ہاں یہ مسئلہ تو ہے۔‘

’بچہ۔ ہم اُسے بچہ کیوں نہیں کہہ سکتے‘

’بچے تو سب ہوتے ہیں...... اکثریت......‘ پہلا کہتے کہتے ٹھہر گیا۔

دانشور کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ ’نہیں‘ اُسے بچہ کہہ کر آواز لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔

’پھر ——؟‘

’پھر۔ سوچتے ہیں۔‘

’اُس کی آنکھیں نیلی تھیں‘

’ہاں۔

’بال بھورے تھے۔‘

’ہاں۔

’نیلی آنکھوں والا بچہ؟‘

’یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔‘

’بھوری آنکھوں والا ——؟‘

یہ بھی نہیں‘

وہ شاہزادے جیسا دکھتا تھا؟ کیا شاہزادہ کہہ کر......‘

’نہیں۔‘ دانشور سنجیدہ تھا —— اقلیت پر شہنشاہیت برسوں پہلے ختم کر دی گئی۔ نہ تاج نہ تخت —— نہ بادشاہ —— نہ

شہزادے......‘

’لیکن اب تو وہ ہمارے ہو رہے ہیں۔ یعنی دھرم پریورتن......‘

’اس کے باوجود نہیں۔‘

پھر——؟‘

’دانشور فیصلہ کر چکا تھا۔ اقلیت۔ یہ نام بہت ہے۔ چلو، ہم اُسے اسی نام سے پکارتے ہیں۔‘

’اُس نے کسی فوجی کی طرح کمانڈر‘ کا رول نبھاتے ہوئے کہا۔’ ایسا کرو۔ تم اس طرف۔ تم اُس طرف۔ ایک میرے پیچھے پیچھے آئے......اور......‘

باس، الگ الگ ہٹ کر ہم کمزور نہیں ہو جائیں گے___ ٹیلر ماسٹر کی آنکھوں میں چمک تھی۔

’پوائنٹ‘

’اس طرح تو بچہ ہم پر حملہ بول سکتا ہے۔ وہ آٹھ سال کا ہے۔ آٹھ سال کے بچے کا دماغ انتہائی شیطان کا اور سازش سے بھرا ہوتا ہے۔‘

’پوائنٹ‘

’سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بچہ سب کو ایک ساتھ دیکھ کر ڈر جائے گا۔‘ یہ بھی ٹیلر ماسٹر تھا......

’ بچے کو ڈرانا نہیں ہے——بچانا ہے——‘ دانشور کا چہرہ غصے سے پیلا پڑ گیا۔ چلو دیر مت کرو۔ تلاش کرتے ہیں۔ اقلیت......اق لیت۔ بیٹے......؟

’اقلیت......‘

’میرے اقلیت......‘

’اقلیت ڈارلنگ......‘

وہ بچے کو تلاش کر رہے تھے۔ گھر کی کوئی شئے سلامت کہاں تھی۔ زمین سے قالین، دیوار سے لے کر کمرے اور کمرے کے مہنگے سامان——لاش کی ہڈیاں کتّے، گدھ اور کوّے کھا چکے تھے۔ سامانوں کے جنازے بکھرے تھے......ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں ان کی ملی جلی آوازیں بازگشت کر رہی تھیں۔

’اق......لیت......‘

’میرے بچے اقلیت......

’یہاں تو کوئی نہیں ہے۔‘

’اوپر۔ اوپر دیکھتے ہیں۔‘

’بالائی منزل کی سیڑھیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔‘

دانشور کی چیخ نکل گئی——’سنبھل کر آنا‘۔

پہلا چیخا۔’سر بچاؤ۔

چھت کا ایک چھوٹا سا حصہ بھڑ بھڑا کر تیز آواز کے ساتھ گرا——

دانشور مطمئن تھا۔ بچہ اوپر نہیں ہو سکتا۔‘

دوسرے کا خیال تھا۔ چھت بُری طرح بیٹھ چکی ہے۔ یعنی ایک کوّا بیٹھنے کے تصور سے بھی___ بچہ کا چھپنا تو دور کی چیز ہے۔‘

’کیا بچہ اسی گھر میں ہوگا۔؟‘ ٹیلر ماسٹر نا امید تھا——’یعنی وہ بھاگ کر کہیں اور بھی تو پناہ لے سکتا ہے۔ کہیں اور......‘

دانشور مطمئن تھا۔’ بچہ کہیں اور پناہ لے ہی نہیں سکتے۔‘

’کیوں؟۔‘

’کیونکہ آندھی تیز تھی۔ درخت سارے گر گئے تھے۔‘

دانشور اپنے جواب سے مکمل طور پر مطمئن تھا۔ ایسی صورت میں بچے کے سامنے اس کھنڈر میں چھپنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچتا ہے۔‘

’آگے اندھیرا ہے۔‘

’ٹارچ۔ ٹارچ نکالو۔‘

اُن میں ایک نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹارچ نکالا۔ ٹارچ نکالتے ہوئے پھپھسایا___ ’’سنتے ہیں، کچھ ملک ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں رات ہی رات ہوتی ہے، دن نہیں ہوتے۔‘

’ہاں۔‘

’باس یہاں بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔‘

دانشور کا لہجہ غصے سے بھرا تھا——’ہم ایک نیک مقصد کے لئے—— سمجھ رہے ہو نا، بچے کو بچانے کے لئے۔

’وہ زندہ ہوتا تو ہماری آواز ضرور سنتا۔‘

’وہ زندہ ہے اور یقیناً ہماری موجودگی سے گھبرایا ہوا ہے۔‘

’اقلیت......‘

’اقلیت بیٹے......‘

مائی ڈارلنگ اقلیت،

آواز لگاتے ہوئے، وہ ایک بار پھر آگے بڑھ رہے تھے۔ آگے، ٹوٹے ہوئے کھنڈر کے ملبے میں——دروازے، کھڑکیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے۔ کہ اچانک......

’کوئی ہے۔‘ آواز گونجی

’ٹارچ۔‘

’کوئی ہے—— ‘دانشور اندر ہی اندر خطرے کے سائرن‘ کے طور پر کانپ گیا تھا۔ پہلے نے ٹارچ جلایا——‘

دوسری آواز اٹھی——بچہ ہے۔‘

’کہتا تھا، نا......‘

ٹارچ کی روشنی ٹوٹے ہوئے لاہوری اینٹے، بھربھرائی مٹی سے ہوتی ہوئی بچے کے چہرے پر ٹھہر گئی ہے......

’باس......‘

ٹیلر ماسٹر نے چیخ کر کیا—— ’باس بچہ ہی ہے۔‘

’اوہ گاڈ۔‘

دوسری آواز آئی۔ ’بچے کی نبض دیکھو۔‘

’کوئی ضرورت نہیں باس‘۔

ٹیلر ماسٹر کی آواز گونجی—— ’بچے کی پیٹھ میں گولیاں لگی ہیں‘۔

پہلے نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا——بچہ مر چکا ہے۔

دوسرا ٹارچ کی روشنی میں بھیانک بدبو دیتے ہوئے بچہ کی لاش پر جھک گیا۔ ’بچہ کو مرے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔‘

○○

محترم قارئین!

کہانی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن یقیناً کچھ باتوں کا قیاس لگایا جا سکتا ہے۔ جیسے لوٹتے وقت یہ بہت مایوس رہے ہوں گے۔ ممکن ہے بچے کو نہیں بچا پانے کی صورت میں۔ یا اس سے زیادہ، ممکن ہے، دھرم پریورتن کے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا پانے کی صورت میں——یا ممکن ہے۔

کوئی اچھا سا قیاس آپ بھی کیوں نہیں لگا لیتے۔

لوٹتے ہوئے ان کے چہرے جذبات سے عاری تھے اور ایسے چہروں کا فائدہ ہے کہ آپ کچھ بھی قیاس لگا سکتے ہیں۔

لیکن قارئین، سب سے ضروری جو بات ہے، وہ یہی ہے۔ کہ یہ وہی تھے جو سابرمتی آشرم سے دلّی کے آشرم چوک

تک——

اور جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں۔ انسانی کمرے میں......اور انسانی عمل کے دوران—— کیا اب بھی آپ کو یقین نہیں ہے کہ یہ ’کئی‘ کبھی پیدا بھی ہوئے ہونگے——!

○○○

مشتاق انجم (ہوڑہ)

سسکتی روشنی کی فریاد

سکشن آفیسر نے فون کریڈل پر رکھا اور میری طرف مڑتے ہوئے کہا۔

’’مسٹر ظفر۔ چیف سکریٹری کا فون تھا۔ آپ نے اپنے برانچ کی assessment report اب تک submit نہیں کی براہ کرم آج شام تک رپورٹ مکمل کر لیں۔‘‘

’’او کے سر، میں کوشش کروں گا‘‘

دور سے آتی ہوئی کار کی ہیڈ لائٹ کی روشنی دھیرے دھیرے قریب تر ہوتی گئی۔ انقلاب زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے تیز ہونے لگے۔

’’چھناک‘‘ مضبوطی سے بند کھڑکی کے شیشے پتھر پھینک کر توڑ دیئے گئے۔ باہر کی ہوا دندناتی ہوئی کمرے میں در آئی۔ ٹیبل پر بکھرے ہوئے نئے پرانے پلان ادھر ادھر اڑنے لگے۔ کسی تھیٹر کی بتیوں کی طرح کمرے کی بتیاں دھیرے دھیرے دم توڑنے لگیں۔ اور پھر اس تاریکی میں ایک سُرخ روشنی ابھری۔ اور پھیلتی گئی۔ آناً فاناً کمرہ کسی فوٹو گرافر کا ڈارک روم بن گیا۔ کمرے کی لال روشنی میں ہر قسم کے نگیٹو (negative) کو پازیٹو (positive) کیا جانے لگا۔ جماعت کے لوگ بہت مطمئن تھے لیکن کچھ لوگ پریشان تھے۔ عالم بدحواسی میں گھبرا گھبرا کر ادھر دوڑ رہے تھے۔ انہیں سانس تک لینے کی فرصت نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے گھر میں بہت سے انجان مہمان آ گئے ہوں۔

اس وقت میرا بھی جی چاہنے لگا کہ تھوڑی سی پی لوں اور قبرستان کی سی ننگی خاموشی میں کچھ ارتعاش پیدا کر دوں۔ عوام کی محنت اور اعتماد اپر آنسو بہاؤں میں سوچتا رہا سوچتا رہا اپنی کرسی میں دبکا ہوا اور ابھی تک کھانے کے لئے مجھے آواز نہیں دی گئی تھی۔

ایک دن میں نے ایک فوٹو گرافر کو پکڑ ہی لیا۔

’’فوٹو گرافر۔ اگر کوئی آدمی جھوٹ بول رہا ہو اور تمہیں پتہ چل جائے کہ وہ سراسر دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔ تو کیا تم اسے ٹوک دو گے؟‘‘

اس نے کہا۔ ’’موقع کی بات ہے‘‘

بس مجھے غصّہ آ گیا۔ ’’تمہارے سربراہوں نے یہی تعلیم دی ہے تمیں؟‘‘

اس نے برجستہ جواب دیا۔ ’’آج کل سربراہوں کے پیچھے کون چلتا ہے۔ ہمارا ہر شخص بذاتِ خود ایک سربراہ ہے۔ اس کے اپنے نظریے ہیں۔ الگ اصول ہیں۔‘‘

فوٹو گرافر کی زبان سے نظریے اور اصول کی بات سن کر میرا موڈ چوپٹ ہو گیا۔

’’کیا اصول ہیں تمہارے؟‘‘ میں نے چڑچڑے پن سے کہا۔

’’سب کو سکھ ملے۔ سب کے پیٹ بھرے ہوں۔ سب کے سروں پر چھت ہو۔ سبھی cultured ہوں۔‘‘

’’سب سے مراد کون لوگ ہیں؟‘‘ میں نے پوچھا

’’عوام‘‘

’’عوام یا ہم جماعت؟‘‘

’’تم مفت میں confused ہو رہے ہو۔ تمہاری عادت ہے کہ تم حالات کا مقابلہ کرنے سے جی چُراتے ہو۔ مثلاً تمیں اپنے کرایہ دار سے کرایہ مانگنا پڑے تو تم اس سے نہیں مانگو گے تا کہ وقتیکہ وہ تمہیں خود نہ دیدے یا کوئی ایسی بات کہنے سے احتراز کرو گے جس سے تمہارے دل کا سکون غارت ہو جائے۔ لیکن ایسے میں ہم لوگ عین مقام پر پہنچ کر دوٹوک فیصلہ کر دیتے ہیں جہاں تم اپنے دل کا سکون کھو بیٹھتے ہو وہاں ہم لڑ جھگڑ کر ایک مستقل قسم کے سکون کی بنیاد رکھ دیتے ہیں‘‘

کوئی تیز لانچ پانی سے گزر جائے تو پانی میں ایک گھاؤ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مجھے اس فوٹو گرافر کے پیچھے ایک گھاؤ سا نظر آ رہا تھا اور اِرد گرد کی فضا اس گھاؤ کو پاٹنے کے لئے چاروں طرف سے اڈتی دکھائی دیتی تھی۔

ایک فوٹو گرافر ہماری بستی میں بھی رہتا ہے ایک دن ایک بیوہ کے پنشن فارم پر دستخط کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

’’عورت کے لئے سب سے اچھی ورزش گھر کا کام ہے۔ جس سے اس کا جسم گٹھا رہتا ہے۔ اور وہ بیمار نہیں ہوتی۔ کپڑے دھونے سے بازوؤں اور چھاتی میں طاقت آتی ہے کام نہ کیا تو موٹی ہو جائے گی‘‘

’میں بہت پریشان ہوں، مجھے کسی کی نصیحت نہیں سننی‘ بیوی سچ مچ پریشان لگ رہی تھی اُس کی آنکھوں میں اُداسی اور ویرانی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

’’کوئی بات نہیں۔‘‘ فوٹو گرافر نے کہنا شروع کیا ’’لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ محنت کے ہتھوڑے سے ہی امیری اور غریبی کے درمیان حائل دیوار کو گرایا جا سکتا ہے‘‘

بیوہ بہت زیادہ اداس نظر آنے لگی۔ قدرے توقف کے بعد دھیرے سے بولی

’’ایر کنڈیشند کمرے میں بیٹھ کراس قسم کی باتیں کرنا بہت آسان ہے صاحب‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے منھ دوسری طرف گھمالیا اور اپنے کلمے کی انگلی سے اپنی آنکھوں کے سمندر کو دیکھا کی موجیں کنار یسے ٹکرا کر جھک گئی تھیں۔

جیسے کچھ دیر روشنی کی طرف دیکھنے سے ہر چیز پر ایک لال نیلا اور کالا دھبّہ سا نظر آتا ہے اور نگاہ کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا رہتا ہے اسی طرح اس منظر نے مجھے ایک منحوس رنگ اور دھبّے کے پیچھے دھکیل دیا۔ جہا ں ایک لمبی راہداری تھی جو شمشان کی طرح بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

’’اس قدر مضحل کیوں ہو۔ آواز یقیناً میری بیوی کی تھی کیونکہ میری پریشانیاں دور کرنے کا ٹینڈر غالباً اسی کے نام نکلا ہے۔

میں نے اسے بتانا شروع کیا۔

’’ایک شاعر یا ادیب اسی سماج میں سانس لیتا ہے جس میں اس کا قاری۔ دونوں کے درمیان ایک رشتہ ہوتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس رشتے کو قائم و دائم رکھنے کے لئے فنکار پر کیا لازم ہوتا ہے۔ کیا وہ ایسی چیزیں پیش کرے جن سے قاری کے حلق میں کونین بھر جائے‘

’’ہرگز نہیں‘‘ اس نے مجھے ٹوکا

’’تو تمہارے خیال میں فنکار ہمیشہ جھوٹ کا سہارا لیتا ہے؟‘‘

’’یہ بھی ٹھیک نہیں‘‘ اس نے برجستہ کہا۔

’’تو پھر؟‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

’’شوگر کوٹیڈ (suger coated) گولیوں کا استعمال‘‘ وہ شرارت سے مسکرائی۔

’’ بکومت۔ شوگر کوٹیڈ گولیوں کا بھرم زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا‘‘

’’تو پھر بیج ڈالنے سے پہلے کھیت اچھی طرح ہموار کر لو‘‘ اس بار وہ سنجیدہ تھی۔

’’لیکن فوٹو گرافر کے ڈارک روم میں ہر نگیٹو کو بہ آسانی پازیٹو کر لیا جاتا ہے‘‘

’’ہاں..... یہ صحیح ہے لیکن۔ چھری صحیح ہاتھ میں ہو تو زندگی بخشتی ہے اور غلط ہاتھ میں ہو تو زندگی سے محروم کر دیتی ہے۔‘‘

’’مسٹر ظفر! میں چونک پڑا اور گھبراہٹ میں میری زبان سے نکلا۔

’’یس سر‘‘

"as sessment report?"

’’ابھی لایا سر‘‘۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور میں رپورٹ تیار کرنے میں منہمک ہو گیا۔

ترنم ریاض (دہلی)

ٹیڈی بیئر

سیاہ چشمے کی بائیں جانب کے کھلے حصے میں سے وہ اسے چپکے چپکے دیکھ رہی تھی، جو خود میں گم گا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گٹار بھی بجا رہا تھا۔ گاڑی کے ہلکوروں کے ساتھ اس کے ماتھے پر آگے کو لا کر پیچھے کی طرف سجائے گئے بال بھی جھول جاتے۔ اس نے قلمیں بڑھا رکھی تھیں جو کم عمری کے سبب گو زیادہ گھنی نہ تھیں مگر کسی نہ کسی طرح اس کے پسندیدہ اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے مغربی گلوکار کے بالوں کے اسٹائل سے ملتی تھیں کہ اسٹیج پر ایک کردار کی ادائیگی کے لیے اسے بال اس کی طرح رکھنا تھے۔ شہر کے اسکولوں میں وہ سب سے خوش گلو فنکار چنا گیا تھا۔

مقابلے کی تیاریوں کے دوران اس نے ایک دن ماں کو اس گانے کی وجہ تسمیہ بتائی تھی کہ ایک ہوٹل میں کسی نامعلوم نوجوان نے ایک پرزے پر ایک سطر لکھ چھوڑی تھی ’میں ایک تنہا راستے کا مسافر ہوں۔‘ کسی نے اسی حادثے سے متاثر ہو کر یہ گانا لکھا تھا۔

’’دیکھئے نامام۔۔۔کس طرح ایک نامعلوم نوجوان اتنے بڑے Master Piece کی بنیاد بن گیا۔ کیا ہوا ہوگا اسے۔۔۔میں کبھی کبھی سوچتا ہوں۔۔۔ کیوں کی ہوگی اس نے خودکشی۔۔۔وہ کیوں تھا اکیلا۔۔۔ کیا اسے۔۔۔کوئی سمجھتا نہیں ہوگا۔۔۔یا پھر۔۔۔‘‘

راحیل کی لمبی لمبی انگلیاں گٹار کے تاروں پر ٹھہر گئی تھیں۔

’’نہیں بیٹا۔۔۔کبھی کبھی انسان کسی شدید جذباتی دباؤ کے زیر اثر سوچ نہیں پاتا اچھی طرح۔۔۔او ر اس کمزور پل میں اس طرح کی حرکت۔۔۔کر گزرتا ہے۔۔۔‘‘

نائلہ کا ممتا بھرا دل پل بھر کو کانپ سا گیا تھا۔

’’تو وہ لمحہ۔۔۔انسان باہمت ہو تو۔۔۔ٹال سکتا ہے۔۔۔اور اگر ٹل جائے۔۔۔تو ایسا حادثہ کبھی نہ ہو۔۔۔‘‘

تمہیں تو میں سمجھتی ہوں میرے بچے۔۔۔کوئی سمجھے نہ سمجھے۔۔۔میں تو تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔

گاڑی میں بیٹھی نائلہ سوچتی رہی اور آہستہ سے گردن بائیں جانب موڑ کر اُسے دیکھنے لگی۔ راحیل نے بے رنگ چشمہ پہن رکھا تھا۔ اُس میں سے اس کی بند آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ چہرے کے تاثرات میں گردوپیش سے بے خبری کا عالم تھا۔۔۔ مگر دونوں ہاتھوں کی محتاط انگلیاں نہایت ماہرانہ انداز میں گٹار کے سخت تاروں کو کچھ ایسی نرمی سے چھیڑ رہی تھیں کہ سُر بادلوں کی طرح فضا میں تیر رہے تھے۔ اس نے بیحد سریلا نغمہ چھیڑ رکھا تھا۔ اسے پریکٹس کے لیے اپنے گروپ کے باقی ساتھیوں سے ملنے ایک دوست کے وہاں جانا تھا۔ نائلہ کو بھی راستے میں ایک جگہ اترنا تھا۔ وہ اس کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھی اس کے گیتوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ایک تیز دھن والا گانا شروع کیا۔

وہ بالکل مغربی انداز میں، کبھی بے حد اونچے سُر میں تان کھینچتا اور کبھی ٹھڈی حلق سے لگا کر بھاری سی غراہٹ نما آواز میں گا کر منھ بڑا سا کھول دیتا اور کبھی ایک دم چوڑا کر کے تمام دانتوں کو نمایاں کرتا ہوا زوردار آواز میں نعرہ سا لگا کر کچھ پل خاموش ہو کر دائیں بائیں دیکھتا اور پھر یکلخت دوبارہ دھیمے سُر سے شروع کر کے اونچے سُر تک جا پہنچتا۔

اس عمل کا مشاہدہ نائلہ کے لیے نہایت دلچسپ عمل تھا۔ جب وہ چہرے کے سارے پٹھے تان کر دانتوں کی نمائش کر کے ماتھے پر بہت سے آڑے بل ڈال کر کوئی سُر ادا کرتا تو اسے بے تحاشا ہنسی آجاتی جسے وہ بسیار ضبط سے چھپا لیتی۔

Put a chain around my neck

And lead me everywhere

So let me be your teddy bear

کیا گا رہا ہے۔۔۔ میرا ٹیڈی بیئر۔۔۔

نائلہ کا دل کرتا اس سے کہے۔۔۔ ابھی کل تک گول مٹول سا ٹیڈی بیئر تھا، وہ سوچتی۔۔۔ دبلا پتلا، لمبا ہو گیا۔۔۔ ساری جان گانے کی ادائیگی میں لگانے سے اس کی گردن پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگتیں۔ حالانکہ گاڑی کے اندر ٹھنڈک تھی۔ پھر نائلہ کا جی چاہتا کہ پرس میں سے رومال نکال کر اس کے چہرے اور گلے پر سے پسینہ پونچھ لے۔ اس سے پہلے کے نائلہ کی منزل آجائے، سرخ ٹی شرٹ میں چھپے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا لمس اپنی ہتھیلی میں محفوظ کر لے۔ مگر اس کے پاس ایسا کوئی بہانہ نہ تھا کہ اسے چھو لیتی۔

کہ وہ ناراض تھا اس سے۔۔۔ شاید۔۔۔ مگر اتنے دنوں۔۔۔ کیوں۔۔۔ آخر۔

کیا وہ خود بھی اس جیسی تھی۔۔۔

نائلہ سوچنے لگتی۔ راحیل کی ثابت قدمی پر اسے خوشی ہوتی۔

اُسے تصویر بنانے کا شوق تھا۔

''اُف، اف۔۔۔ گناہ۔۔۔ گناہِ کبیرہ۔۔۔'' اماں سر پر آنچل درست کرتی جانے کب آ کر اس کے عقب میں کھڑی ہو جاتیں۔

''ایک تو پڑھائی نہیں کرتی۔۔۔ دوسرا۔۔۔ یہ۔۔۔ شکلیں۔۔۔ اللہ۔۔۔ یہ اولاد۔۔۔ جہنم رسید کروائے گی۔۔۔'' چوری پکڑے جانے سے وہ شرمندہ سی ہو کر رہ جاتی۔

''اپنی باجی کو دیکھو۔۔۔ اوّل آتی ہے اکثر ہی۔۔۔ ورنہ دوئم تو ضروری ہی۔۔۔ اور تم۔۔۔ پڑھو گی نہیں تو فیل ہو جاؤ گی۔۔۔ میں نے ہی بگاڑا ہے شاید تمہیں۔۔۔''

''اماں۔۔۔ یہ تو۔۔۔ ڈرائنگ ہے۔۔۔ اسکول میں۔۔۔''

''جھوٹ تو نہیں بولتیں۔۔۔؟ تمہارے ابا سچ کہتے ہیں۔۔۔ کہ میرا ہی قصور ہے۔۔۔ تمہاری ہر بات مان لیتی۔۔۔ ہوں۔۔۔''

''جھوٹ ہی تو بولا جا رہا ہے۔۔۔ یقیناً۔۔۔'' ابّا کی آواز پتھر کی طرح کان میں پڑتی۔۔۔ نائلہ پتھر سی دیکھا کرتی۔

''کہاں لے جائیں گی یہ لکیریں۔۔۔ یہ تصویریں تم کو۔۔۔؟''

ابا جانے کیسے اسی وقت گھر میں داخل ہوتے۔

''یہ شریف لڑکیوں کا چلن نہیں ہے۔۔۔'' وہ چہرہ اس کی طرف اور نظریں دوسری جانب کر کے کہتے اور چلے جاتے اور اماں پاؤں پٹختی ہوئی ان کے پیچھے۔ ایسے میں کتنا غصہ آتا تھا۔۔۔ اُسے۔۔۔ دونوں پر۔

جیومیٹری کی کاپی کے سادہ ورق پر بنے رنگ برنگے چہرے پر اس کے دو آنسو ٹپ سے گرتے۔ پانی کا رنگ پانی میں گھل کر بے رنگ سا ہونے لگتا۔ رونے کی خواہش گلے کے اندر پھندا سا ڈالنے لگتی۔

''اتنی محنت سے۔۔۔ میں نے۔۔۔ خراب ہو گئی تصویر۔۔۔ یہ ابّا۔۔۔ یہ ابّا۔۔۔ آخر ہیں ہی کیوں۔۔۔ سب کچھ تو ہوتا ہے اماں کے پاس۔۔۔ کھانا۔۔۔ جیب خرچ۔۔۔ کتابوں کے پیسے۔۔۔ کاپیوں کے۔۔۔ کاپیوں کے پیسے۔۔۔ اتنے سارے۔۔۔ پھر ابّا بھلا کیوں۔۔۔ رعب جمانے کے لیے۔۔۔ اللہ کرے۔۔۔ اللہ کرے۔۔۔ کہ۔۔۔ اللہ نہ کرے۔۔۔ ایسا سوچتا ہے کوئی اپنے ابا کے لئے۔۔۔''

جانے یہ کس کی آواز تھی۔۔۔ آواز تھی بھی یا۔۔۔ جو بھی تھی مگر نائلہ نے سن لی تھی۔۔۔

شاید پہلے کبھی سنی تھی اس نے یہ آواز۔

تصویریں بنانا جاری رہا۔۔۔ آرٹ فائل مہینے میں دو بار باقاعدگی کے ساتھ گم ہو جایا کرتی۔۔۔

رنگ اسکول کے ساتھی استعمال کر لیتے تو بے چاری نائلہ کیا کرتی۔۔۔ جواز معقول ہوا کرتا۔۔۔ اور امی کی تھوڑی سی ڈانٹ اور تنبیہہ کے عوض ایک نئی آرٹ فائل۔۔۔ سودا مہنگا نہیں تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو کس قدر فائدہ مند۔۔۔

پیلے رنگ کے پتلے ٹین کے مستطیل ڈبے میں بارہ خانے مختلف رنگوں کے۔۔۔ اور ساتھ میں نرم و نازک سنہری بالوں والا مو قلم۔۔۔ تصوّر میں بسی ہزار شبیہات۔۔۔ کمرے کی تنہائی۔۔۔ اب جنت میں بھی کیا ہوتا ہوگا۔

زندگی جنت سے بھی حسین تھی۔ مگر دنیا کی ہر جنت کی طرح عارضی۔۔۔ کہ اس کے سارے رنگ، راز اور تصوّر طشت از بام ہو گئے۔ اسے آج بھی کتنا دکھ ہوتا ہے یاد کر کے۔۔۔

گاڑی رک گئی تھی۔ نائلہ نے ٹھنڈی آہ بھری اور ونڈو کے باہر دیکھنے لگی۔ سرخ روشنائی سے لکھے Relax کے دائرے پر باجی کا چہرہ نظر آیا۔۔۔ اس کا دل جیسے کہ خود کلامی کرنے لگا۔

ہفتے کا دن تھا۔ اسکول میں آدھے دن کے بعد چھٹی ہوا کرتی تھی۔

باجی دو دن سے کہہ رہی تھیں کہ ان کی ہفتے اور اتوار کی دو دن کی چھٹی ہے اور وہ اماں کے ساتھ مل کر میرا کمرا صاف کروائیں گی۔

''میرا کمرہ صاف ہے بالکل'' میں نے باجی کی آنکھوں میں جانے کون سی چمک سے نظریں چرا کر کہا تھا۔

''تم کیا جانو۔۔۔ اپنے پاؤں کے تلوے دیکھو۔۔۔ میں جانتی ہوں کیا صحیح ہے۔۔۔'' انہوں نے 'میں' پر زور دیا تھا۔ آخر کو مجھ سے پانچ، چھ برس بڑی تھیں۔

''رہنے دیجیے نا باجی۔۔۔ اگلے ہفتے کر لیں گے۔۔۔ یا اتوار کو میری بھی چھٹی ہوگی نا۔۔۔ تو۔۔۔''

مجھے اپنے کام نہیں ہیں کیا اتوار کو۔۔۔؟'' باجی گردن مٹکاتیں۔

''ٹھیک کہتی ہیں باجی۔ تم زیادہ دخل مت دو'' اماں کو جب باجی پر زیادہ پیار آتا۔ تو اسے باجی بلایا کرتی تھیں۔۔۔ اماں کی یہ بات مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔۔۔''

''اچھا چلو۔۔۔ اتوار کو ہی کر لیں گے۔۔۔ انہوں نے نہایت حاکمانہ انداز میں رحم کھا کر کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔۔۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔۔۔ باجی۔۔۔ دھوکے باز باجی۔۔۔

میں کسی ٹکٹ یافتہ مجرم کی طرح بیٹھک کے دروازے سے لگی تھی۔ تھانے کی دیواروں پر چسپاں جرائم پیشہ افراد کی تصویروں کی طرح میز پر میری چار آرٹ فائلوں کے موٹے موٹے ورق بکھرے تھے۔ بے شمار چہرے لیے ہوئے۔۔۔ کہیں بڑے۔۔۔ کہیں چھوٹے۔۔۔ کوئی بزرگ۔۔۔ کوئی بچہ۔ نرم تاثرات لیے ہوئے، دودھ

پہنچانے والے حاجی صاحب گوالے کا چہرہ۔۔۔ میری حساب کی سنگدل ٹیچر کا ناراض چہرہ۔۔۔ بڑے دانتوں والے چوکیدار بابا کا چہرہ۔۔۔ روتی ہوئی چھوٹی سی لڑکی کا بسورتا ہوا۔۔۔ کوئی مسکراتا۔۔۔ کوئی غصہ ور۔۔۔ کوئی گنجا۔۔۔ کہیں لمبے لمبے بالوں والی عورت کا۔۔۔ گورا۔۔۔ کالا۔۔۔ ہر چہرہ مجھے اپنے چہرے کی طرح عزیز تھا۔

''یہ سب کیا ہے۔۔۔؟'' ابّا کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ انہوں نے میز پر اپنا لمبا بازو ایک جھٹکے سے جھاڑو کی طرح پھیر دیا۔ لمبے سے فراک کے اندر میرے گھٹنے کانپ کانپ کر ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے رہے۔

اور بعد میں باجی کے قبضے میں چلے گئے۔ چہرے لہراتے لڑھکتے فرش پر بکھر گئے۔

اماں نے مجھ سے بات کرنا ترک کیا۔

حساب کے پرچوں میں بمشکل تمام پاس ہونے کی بجائے۔۔۔ میں فیل ہو گئی۔۔۔ اور تعجب کی بات یہ کہ باجی کو پہلے ہی پتا تھا کہ جو سوال وہ مجھے کروا رہی تھیں امتحان میں وہی سوالات غلط کر کے میں فیل ہو جاؤں گی۔

دوبارہ باجی کی تحویل میں دینے سے پہلے ابّا نے ایک نہایت تجربہ کار اور سینئر قسم کے حساب داں استاد کا انتظام کیا کہ باجی کے خود امتحان سر پر تھے۔

حساب کے استاد گھر آنے لگے۔

ماسٹر جی کے پیلے دانتوں پر ہر وقت رالیں جمع رہتیں۔ منھ سے ریشم کے لچھوں ایسے نئے نویلے چوزوں کے درمیان جوں کے توں پڑے رہ جانے والے انڈے کی سی بدبو آتی جنہیں باجی مجھے سنگھانے کے بعد پیٹ پکڑ کر دوہری ہو کے ہنسا کرتی تھیں۔ اور جیسے چوزوں کے استقبال کے لیے ٹوکری کے گرد کوٹھری میں کھڑی میں اماں کے چہرے پر لاتعلق سی مسکراہٹ دیکھ کر بجھ سی جایا کرتی۔ اس سے کہیں زیادہ تکلیف مجھے ماسٹر جی کے پاس قیامت جیسا ایک گھنٹہ گزارنے میں ہوتی۔

اکثر سر پر سے شملے والا صافہ اتار کر ماسٹر جی دونوں ہاتھوں کے میلے ناخنوں سے اپنا گنجا سر کھجاتے ہوئے منھ کھول کھول کر جمائیاں لیتے او رالجبرا کے زبانی یاد فارمولے دوہراتے ہوئے آنکھیں بند کر کے سمجھایا کرتے۔

جیسے تیسے مڈل اسکول ہوا۔

باجی نے گھر میں مشورہ دیا کہ اگر آرٹس پڑھوں گی تو ڈرائنگ تو کرنا ہی ہوگی۔۔۔ اور سارا وقت میں ڈرائنگ کرتی رہوں گی تو پڑھوں گی کہاں۔۔۔ اس لیے نویں درجے میں میڈیکل پڑھایا جائے اور یہ کہ وہ مجھے خود گائیڈ کریں گی۔۔۔ کہ آخر ان کی میڈیکل کی پڑھائی کس دن کام آئے گی۔۔۔ کہ۔۔۔ کہ روز Good یا Excellent ملتا تھا انہیں پریکٹیکل کاپی پر۔

گھر میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ جس دن باجی نے میری رَف کاپی پر ماسٹر جی کا جمائی لیتے ہوئے سر کھجاتا ہوا چہرہ دیکھا تھا، اسی دن یہ معاہدہ ہوا تھا کہ اگر میں ان کی سائنس کی ڈایگرامز بنایا کروں تو وہ کسی سے نہیں کہیں گی کہ میں نے چہرے بنانے میں دوبارہ وقت ضائع کرنا شروع کر دیا ہے۔

''یہ تو۔۔۔بالکل۔۔۔لگتا ہے ابھی ہاتھ نیچے کر کے آنکھیں کھولیں گے اور سوال چیک کریں گے۔۔۔تمہاری کاپی پر۔۔۔''

باجی کئی لمحوں تک تصویر کو دیکھتی رہی تھیں۔۔۔

''اب تو تم بالکل اصلی صورت جیسا۔۔۔خیر۔۔۔یہ کوئی اچھی بات تو ہے نہیں۔۔۔اماں تو تمہیں کوئی کام تک نہیں بتاتیں کہ وقت نہ ضائع ہو۔۔۔ویسے۔۔۔میری ڈایگرامز میں ایسا کوئی وقت نہیں لگے گا۔۔۔ اور پھر میں ان سے کچھ۔۔۔کہوں گی بھی نہیں۔''

بہرحال۔۔۔

میری ہمدرد باجی۔۔۔میں Maths میں Nil، Physics کے Problems کیسے Solve کروں گی۔

مجھے سائنس سے ذرا دلچسپی نہیں۔۔۔میں کیا پڑھوں گی۔

مگر باجی جو تھیں پڑھانے والی۔

وہ میری استاد مقرر ہوئیں تو ان کا مجھے بلاوجہ پیٹنا بھی جائز ہو گیا۔۔۔

چہرے جانے کہاں چلے گئے۔۔۔اماں کا چہرہ ناراض۔۔۔ابا کا چہرہ مجھے دیکھتے ہی رنگ بدلتا۔۔۔ باجی کا چہرہ۔۔۔فاتح سے تاثرات لیے۔۔۔اور میرا چہرہ۔۔۔آئینے میں نظر ہی نہ آتا۔۔۔

تمہیں تمہاری شخصیت مبارک ہو۔۔۔

نائلہ نے پہلو میں بیٹھے راحیل کو کنکھیوں سے دیکھا۔

موسیقی میں گم گردوپیش سے بے خبر یہ چہرہ مبارک ہو۔۔۔

اس نے ڈرائیونگ سیٹ کے سامنے اوپر کی جانب لگے چھوٹے سے آئینے میں راحیل کی بند آنکھیں دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔

نواں درجہ کسی طرح ہو ہی گیا تھا۔

نائلہ سوچنے لگی۔۔۔۔۔۔۔Physiology کے Diagrams نے کہانی کی طرح سمجھے انسانی نظام کی Description میں بہت مدد دی۔ ریاضی اور فزکس میں فیل۔۔۔باقی تمام میں اول۔۔۔

یہ تھا دسویں جماعت کے ششماہی امتحان کا نتیجہ۔ اور بورڈ کے امتحانات میں شامل ہونے کے لیے ان

سب میں پاس ہونا ضروری تھا۔ بڑی مشکل سے ان پرچوں میں دوبارہ امتحان دینے کی اجازت ملی اور پاس کر لیے مگر بورڈس میں اگر ایک بھی مضمون میں پاس نہ ہوئے تو پورے امتحان میں فیل ہونا لازمی تھا۔ اور پھر سال ضائع ہو جانا طے تھا۔

اور میں تین سال لگاتار پرائیویٹ امتحان دیتی اور فیل ہوتی گئی۔

نئی نئی لیکچرر ہوئی باجی کو جب لڑکے کی اماں اور خالہ دیکھنے آئیں تو چھوٹے صاحبزادے کے لیے، جو پڑھائی چھوڑ کر بھائی کی دکان میں خاصا کام سنبھال لیتے تھے، مجھ پر غور ہوا۔

باجی کے سسرال جانے کے بعد کی آزادی کے تصور میں مگن اور مسرور میں اماں کا پیازی رنگ کا کامدانی دوپٹہ اوڑھے برفی کی طشتری لیے اندر داخل ہوئی تو دونوں بزرگ خواتین نے مجھے باری باری چونک کر دیکھا تھا۔

فیصلہ یہ ہوا کہ ایک کند ذہن لڑکی کو پڑھانے کی کوشش میں مزید وقت ضائع کرنا حماقت ہوگا۔ رشتے کو قدرت کی طرف سے اشارہ سمجھ کر قبول کر لیا جائے۔

سارے چہرے روٹھ گئے مجھ سے....

زندگی کے افق پر ایک نیا چہرہ ابھرا۔ اس کا گھر سنبھالنے میں سارا آرٹ خوب کام آیا۔ اور پھر سگھڑ نکلی میں۔۔۔کہ جیٹھ جی کی پروفیسر بیوی کی غیر موجودگی میں مجھے گھر کا ہر کام خوش اسلوبی سے نبھانے کی ہدایت تھی۔ اور وہ کبھی کبھی بہ آواز بلند خدا کا شکر کرتیں کہ کم از کم یہ ذرا سا سلیقہ تو پیدا ہوا مجھ میں۔۔۔جو میں نے ان ہی کی صحبت میں سیکھا تھا۔۔۔کیونکہ پڑھنے میں مصروف و مشغول ہونے کے باعث انہیں مجھے ہی کام کاج سمجھانا پڑا ہے مائیکے میں۔۔۔

اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں کیونکہ جب میری ہی دلچسپی تعلیم میں نہیں تھی تو انہوں نے مجھے گھر سنبھالنے لائق بنانے میں محنت کی۔

رات کے کھانے کی میز پر پھولی ہوئی گرم گرم چتکبری روٹیاں میرے ہاتھ سے لیتے وقت، ان سب باتوں کا انہوں نے کئی دفعہ کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

کھلے دل والی باجی۔۔۔

راحیل نے دوبارہ وہی سریلا نغمہ چھیڑا تو نائلہ پھولی ہوئی روٹی چھوڑ کر گاڑی کی پچھلی نشست پر لوٹ آئی۔

Since my baby left me

I found out a place to dwell

Its, down at the end of a lonely street

Of heart break hotel

وہ بالکل ایلوس پریسلی کی طرح سر ہلا رہا تھا۔ دھن بھی دل میں اترے جاتی تھی۔۔۔آج راحیل کی آواز میں نائلہ نے درد محسوس کیا تھا۔ گانے کا اس کے بعد کا حصہ نائلہ کو اور اُداس کرے گا۔۔۔وہ جانتی تھی۔اور شاید راحیل بھی جانتا تھا۔اس نے آواز ذرا دھیمی کرلی۔ یہ گانا اسے بہت پسند تھا۔اور اسے اسٹیج پر بھی گاتا تھا۔اسے گاتے وقت اداس ہوجانا بھی اچھا لگتا تھا۔

You make me so lonely baby

I get so lonely

You make me so lonely

I could die

نائلہ رنجیدہ نظر آرہی تھی۔۔۔

خدا نہ کرے۔۔۔میرے فنکار۔۔۔آخری لائن سن کر اس نے دل میں کہا۔

آج بہت اداس ہے راحیل۔۔۔وہ سوچنے لگی۔

اس کا باپ اس سے بہت خفا ہے۔۔۔اور باپ کی ہاں میں ہاں اگر نہ ملائی جائے تو بچے خراب ہوجاتے ہیں۔ باجی نے کہا ہے۔

''میں نے اسے گٹار کیوں لے کردی۔

میں نے اسے میوزک اسکول کیوں بھیجا۔

شاموں کو بورن ویٹا والا دودھ ہاتھ میں لیے اس کے کمرے کے دروازے کے قریب کھڑے ہوکے اس کا گٹار سن سن کر اس کی حوصلہ افزائی کیوں کی۔

میں ماں ہوں۔۔۔کہ دشمن۔۔۔شرم نہیں آئی مجھے۔

اپنا انجام بھول گئی۔۔۔میں۔۔۔

باجی، راحیل کے نویں جماعت کے ششماہی امتحان میں ریاضی کے ۱۰۰ میں سے ۳۴ نمبر دیکھ کر اونچی آواز میں سمجھا رہی تھیں۔ آوازیں سن کر گھر کے دوسرے لوگ بھی آگئے تو مارے ہمدردی کے باجی کی آواز گلوگیر ہوگئی تھی۔

"O just shut up." وہ چیخا تھا۔ یہ مام کا زمانہ نہیں ہے۔۔۔شاید اس کی نظروں میں میرا اس کی کاپی

کے کور پر پنسل سے کھنچا ہوا اس کا گٹار بجاتا اسکیچ گھوم گیا تھا۔ جو دو سال سے اس نے اپنی میز کی دراز میں رکھا ہے۔

"just do'nt interfere in my life" وہ اسکول سے ملا رپورٹ کارڈ لے کر کمرے سے جانے لگا تو اس کے باپ نے اس کے چہرے پر ایک زور کا تھپڑ امارا۔

''بڑوں سے زبان لڑاتے ہو'' میں نے فوراً کہا۔

اس نے میری طرف زخمی نظروں سے دیکھا۔۔۔شفاف رخسار پر پانچ سرخ لکیریں چھپ گئی تھیں۔

کئی دن مجھ سے نظر ملا کر بات نہیں کی تھی۔ میں نے سمجھانا چاہا تو کمرے میں گھس کر دروازہ پٹخ کر بند کردیا۔

اس کے بعد میں نے کچھ نہ کہا۔

نائلہ نے تصور میں اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

اسکول کی طرف سے جب والدین کے اجازت نامے پر دستخط کی باری آئی تو۔۔۔میں نے چپکے سے دستخط کردئے اور کسی کو پتا نہ چلا۔

اب میرے ٹیڈی بیئر کو مجھ سے ناراض نہیں رہنا چاہئے۔

نائلہ سوچنے لگی۔

آج وہ اسی ریہرسل کے لیے جا رہا تھا۔ اپنے پسندیدہ گلوکار کے گائے سب سے پسندیدہ گانے کی ریہرسل۔۔۔وہ اس کے گانے گاتے ہوئے اکثر سوچوں میں گم ہوجاتا۔

''قابل لوگ زیادہ دیر جیتے ہی نہیں۔۔۔کیوں مام۔''

ایک دن جب اس نے نائلہ کو ایلوس پریسلی کے کئی گانے گا کر اور بجا کر سنائے تھے، وہ ایسے ہی اداس تھا۔

ایلوس پریسلی نوجوانی میں ہی انتقال کر گیا تھا۔ بے حد خوش شکل نوجوان تھا وہ۔۔۔بیضوی چہرہ۔۔۔اونچا قد۔۔۔تندرست، چست بدن، سرخ وسفید رنگت، بالوں کا رنگ سیاہ کرتا تھا وہ اور پوشاک اپنے وضع کردہ انداز کی جاپانی شہزادوں کی بڑے کالروں والی جیسی کچھ۔ جس سے شانے اور وجیہہ معلوم ہوتے۔ چمکیلے رنگوں والی۔ بہت سے رنگ برنگے بٹنوں والی۔ مختلف ڈیزائن کے ہیرے جڑی کمر بند والی۔ گاتے ہوئے جب اسٹیج پر تھرکتا تو دلوں کی دھڑکن اس کی تال پر تھرکتی۔ یہ باتیں نائلہ کو راحیل نے بتائیں تھیں۔

نائلہ یاد کر رہی تھی کہ ایک بار اس نے کسی شو کے دوران اپنا پسینہ خشک کر کے رومال تماشائیوں کی طرف اچھالا تھا تو لوگوں نے اس رومال کو حاصل کرنے کے لیے کسی نایاب نعمت کی طرح انگنت ہاتھ بڑھائے تھے ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا نائلہ نے۔

''موت تو اللہ کے اختیار میں ہے بیٹا۔۔۔ایسا تو نہیں ہے۔۔۔بہت سے قابل لوگ برسوں جیتے ہیں۔۔۔بہت سے عام لوگ کم جیتے ہیں، یا اس کا الٹ بھی ہوتا ہے۔۔۔''

''مگر مما۔۔۔میں کیوں اس شدّت سے محسوس کرتا ہوں۔۔۔اس کے بارے میں اتنا زیادہ۔۔۔میں دیکھیے۔۔۔ اس کی موت کے تیس سال بعد پیدا ہوا۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ King تھا وہ Music کا۔۔۔Rock-n-Roll۔۔۔I just adore him mom''

''کیوں کہ آپ کی نظر میں وہ سب سے اہم آدمی ہے۔۔۔آپ موسیقی کو جاننے سمجھنے والے ہیں۔۔۔اور وہ ایک پیدائشی موسیقار تھا۔''

''ہاں۔۔۔ایک مکمل فنکار تھا وہ۔۔۔اُس گمنام شخص کا درد کیسے محسوس کیا اس نے۔۔۔کہ درد کو گانے میں تبدیل کر کے امر کر دیا۔۔۔کتنا مشہور ہو گیا Heart Break Hotel کے نام سے وہ مغربی ہوٹل۔۔۔جب اس نے گانے کے ساتھ ڈانس کر کے لوگوں کا دل جیت لیا تھا جب تک گانے کے ساتھ کوئی ناچا نہیں کرتا تھا اسٹیج پر۔۔۔وہ ایک دردمند۔۔۔ایک دردمند دل تھا اس کے پاس۔۔۔ امریکن ہو کر بھی وہ افریقیوں کے دکھ بانٹتا تھا۔

گورا ہو کر بھی اس کے اندر سے افریقیوں کی آواز آتی تھی۔۔۔ انسان کو ایسا ہی سچا اور ایماندار ہونا چاہیے۔۔۔ہے نا۔۔۔ہے نا مام۔۔۔''

نائلہ کو اچھا سامع پا کر وہ دل کی باتیں کہتا۔۔۔

''ہاں۔۔۔میری جان۔۔۔میرا بچہ کتنا عقل مند ہے۔۔۔''

وہ اس کا شانہ تھپتھپا دیتی۔۔۔

بال سہلا دیتی۔۔۔

ماتھا چوم لیتی۔۔۔

''مما۔۔۔دیکھئے گا۔۔۔سارے اسکولز میں سے ہمارا گروپ ہی فرسٹ آئے گا۔۔۔اس بار بھی فائنل میں پرفارم کرنے کے لیے۔۔۔ہم سب بہت dedicated ہیں۔۔۔''

''انشاءاللہ۔۔۔'' نائلہ دعا دیتی۔

انشاءاللہ۔۔۔گاڑی میں بیٹھی نائلہ نے دھیرے سے گردن اس کی طرف موڑی۔

آج وہ ضرور مجھ سے بات کرے گا۔ میرا شکریہ ادا کرے گا۔ میری گود میں سر رکھ کر مجھے منائے گا۔۔۔معافی مانگے گا مجھ سے۔

مگر نائلہ صرف سوچتی ہی رہی۔۔۔ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ اپنی دھن میں گاتا بجاتا رہا۔

نائلہ کی منزل قریب آ رہی تھی۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے کامیابی کی دعائیں دینا چاہتی تھی۔ بہت دنوں سے اس نے اس کا سر نہیں چھوا تھا۔ مگر وہ بالکل بے خبر گا رہا تھا۔

یہ مجھ سے ایسے نہیں روٹھ سکتا۔ اس چہرے میں تو میں نے آرٹ فائلز کے سبھی چہرے جوڑ رکھے تھے۔ اس کے معصوم ہاتھوں کی ماہرانہ جنبش سے چھیڑے جانے والے نغموں کو سنتے ہوئے میں پیلے رنگ کے ٹین کے نازک سے مستطیل ڈبے کے سب رنگ اور ان رنگوں سے مزید بننے والے ان گنت رنگ دیکھ لیتی تھی۔

نائلہ نے نہایت اُداسی سے سوچا۔

میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہوگا۔۔۔مگر اس میں بسے فنکار کے ساتھ کچھ برا نہیں ہونے دیا۔

اس کے اس Concert کی منظوری دینے کے لیے جانے کیسے کیسے جواب دینا ہوگا مجھے۔۔۔

وہ ایک آہ بھر کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں آخر کار بھیگ ہی گئیں۔ کون سمجھے گا مجھے۔۔۔آخر۔۔۔اس کے بوجھل دل میں خیال ابھرا۔۔۔

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ اس نے تھکے ہارے سے قدم گاڑی سے باہر رکھے ہی تھے کہ راحیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''یہ سب۔۔۔آپ ہی کی وجہ سے ممکن ہو پایا ہے مام۔۔۔ مجھے کامیابی کی دعا دیجئے۔۔۔ My sweet mom۔۔۔آپ کو جانے کیا جھیلنا پڑے گا نا۔۔۔؟ مگر میں آپ کے ساتھ ہوں مما۔۔۔آپ گھبرایئے گا نہیں'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''صرف آپ۔۔۔آپ مجھ سے ناراض مت رہیے گا کبھی۔۔۔میں غلط نہیں ہوں نا مما۔۔۔؟''

تم کبھی غلط نہیں تھے، میرے فنکار۔۔۔نائلہ اسے دیکھتی رہی۔۔۔پھر سر ہلکے سے نفی میں ہلا کر اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتی ہوئی باہر آ گئی۔۔۔''

اظہار تشکر

جدید ادب کا یہ شمارہ اس کی کتابی صورت میں چھپنے اور ریلیز ہونے سے لگ بھگ ایک ماہ پہلے انٹرنیٹ پر آ رہا ہے۔ یہ سب **اردوستان ڈاٹ کام** کے **آرگنائزر جناب کاشف الہدیٰ** کی اردو سے اور ہمارے **جدید ادب** سے محبت کا نتیجہ ہے۔ یہ ان کا اخلاص ہے کہ ہمارے لئے جنوری کے **جدید ادب** کو دسمبر 03ء ہی میں انٹرنیٹ پر پیش کرنے کا موقعہ مل رہا ہے۔(**حیدر قریشی**)

محمد عاصم بٹ (اسلام آباد)

انتظار

بھاٹی گیٹ سے ذرا اندر آئیں، یہی کوئی دس بارہ قدم تو بائیں جانب ایک ڈھائی تین فٹ اونچی دیوڑھی پر چھوٹا سے مزار بنا ہوا ہے، چھتر سائیں کا۔اس کے برابر ایک کمرے کا میوزیم ہے جس میں شیشے کے پٹوں والی الماریوں میں چھتر سائیں کے عام استعمال کی اشیاء رکھی گئی ہیں جیسے ایک تو ان کی چھتری ہی ہے، جس کی وجہ سے انہیں چھتر سائیں کا نام ملا۔مزار کے عقب میں ایک مسجد ہے جس کا دروازہ مزار کے برابر واقع ہے۔مزار، مسجد اور میوزیم دو دو تین تین منزلہ مکانوں میں گھرے ہوئے ہیں۔بازار سے ذرا ہٹ کر ہوتے تو بہت ممکن تھا اب تک کسی کٹڑی کے صحن کا حصہ بن چکے ہوتے۔خیر میں اس مزار اور خود چھتر سائیں کو تب سے جانتا ہوں جب وہ کرامات والے چھتر سائیں نہیں بنے تھے بلکہ تب ان کا کوئی نام نہیں تھا۔یہ ایک ننگ دھڑنگ رہنے کے شوقین مجذوب تھے۔

مسلم ماڈل سکول، جہاں میں نے چھٹی میں داخلہ لیا، سے متعلق میری اولین یادوں میں چھتر سائیں سے جڑی ہوئی یادیں موجود ہیں۔چھٹی جماعت مجھے اس لئے بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اسی زمانے میں میں نے سکول سے 'پھُٹنے' کے سلسلے کا آغاز کیا۔دو ایک دوست کلاس میں ہی ایسے مل گئے جن کے ساتھ میں ہفتے میں دو تین بار سکول سے ہوا ہو جاتا۔تب یہیں بھاٹی گیٹ کے باغ میں نالے کے ساتھ ساتھ گھوما پھرا کرتے۔گندے نالے کے کنارے ایک جگہ چوڑا گڑھا تھا جہاں' مجھے یاد ہے ایک مجذوب بیٹھتا تھا جو ہر وقت بے تکان مغلظات بکتا۔بچے اسے حیرت سے تکتے اور ڈرتے بھی مگر تجسس کے مارے دور بھی نہ ہٹتے تھے۔وہ مغلظات بکتا تو بچے پتھر اٹھا کر اسے مارتے۔وہ بھی غصے میں جو کچھ ہاتھ آتا' ان کی طرف پھینکتا۔بچے چیختے ''ننگا پڑ نگا۔لوہے دا کنگا۔'' وہ چڑتا اور منہ کو طرح طرح سے بناتا کچھ بکتا۔لیکن اپنی جگہ سے ہلتا نہیں تھا۔اس گڑھے میں جیسے وہ قید تھا۔کسی جادو نے اسے مٹی پر جما دیا تھا۔وہیں بول و براز کرتا۔وہیں ایک کروٹ سو جاتا۔

میں عام طور پر صرف تبھی بھاٹی گیٹ کی طرف جاتا جب سکول سے رفو چکر ہوتا۔وہیں باغ میں بنچ پر اینٹ کے ٹکڑے سے بارہ ٹینی کھینچ کر اور اس پر پتوں اور پھولوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ کر ہم دوست کھیلا کرتے

۔ساتویں میں میرے یاروں کی ٹولی تتر بتر ہوگئی۔عالی موٹا سکول چھوڑ گیا۔اقبال گنجا چھٹی پاس ہی نہ کر سکا۔اکرم لوٹا اور سعید میرے ساتھ رہے۔لیکن ہم تینوں ہی 'لائی لگ' قسم کے لڑکے تھے۔ہمیں ایسے جی دار لڑکوں کی ضرورت رہتی جن کی پیروی ہم کریں۔خود سے کوئی قدم اٹھانے کی مجھ میں ہمت تھی نہ ان میں۔یوں ہمارا اسکول سے 'پھُٹنا' بھی کم ہو گیا اور بھاٹی گیٹ جانا بھی۔

سو ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ کب چھتر سائیں کے دن پھر گئے۔کب اسے فیکا پہلوان جیسا مجاور مل گیا جو اس کی گندگی دھوتا، اس سے مغلظات سنتا' اس سے مار بھی کھاتا اور اس کی روٹی پانی کا خیال کرتا۔وہیں چھتر سائیں کے گڑھے کے قریب ہی اس نے ٹین کی چادر کی آڑ سی بنا کر اپنے رہنے اور سونے کا بندوبست کر رکھا تھا۔میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو وہ کوئی چھٹا ہوا بدمعاش معلوم ہوا۔سوائے اس کی بھیگی ہوئی شربتی سی آنکھوں کے، اس کے جسم کے کسی حصے اور اس کی کسی عادت کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا تقریباً ناممکن تھا کہ اس جناتی جثّے والے انسان میں ایسا بیویوں جیسا برداشت کا مادہ موجود تھا۔سوال یہ تھا کہ آخر کس لئے؟ وہ کس واسطے چھتر سائیں کے ناز اٹھاتا تھا؟ یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی۔

لوگ اسے چھتر سائیں کا سایہ، اس کا جانشین، ہم راز اور ایسے ہی نام دیتے۔سوائے ان موقعوں کے' جب چھتر سائیں کی گالیوں وغیرہ میں سے اعداد کی نشاندہی کرنے کے لئے لوگ اس سے رجوع کرتے اور وہ مستعد ہو کر چوکڑی مار کر بیٹھ جاتا کہ سائلوں کی بات سنے اور انہیں قسمت کے اعداد بتائے، وہ عام طور پر اپنی ٹین کی آڑ والی کٹیا میں کسی پرانے ٹرک کے ٹائر کو سر کے نیچے رکھے لیٹا رہتا اور جانے کیا سوچتا۔اس کی موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں بڑی معصومیت اور جاذبیت تھی۔

میرے والد چھتر سائیں کے بڑے معتقد تھے۔انہیں ان کی کئی کرامات بھی ازبر تھیں۔اکثر ہمیں سائیں سے وابستہ معجزات سناتے۔بات یہ تھی کہ اندرون لوہاری گیٹ میں سٹہ بازی کے دو اڈے تھے۔ایک سوتر منڈی میں تھا، جھنڈے خان کی حویلی کے تہہ خانے میں۔دوسرا سید مٹھا بازار میں الیاس ٹیناں والے کی بیٹھک میں۔میرے والد صاحب دونوں ہی اڈوں پر جایا کرتے تھے۔یہ باتیں ظاہر ہے تب ہمیں معلوم نہیں تھیں۔آہستہ آہستہ ادھر ادھر سے علم میں آئیں۔میرے والد صاحب ہی نہیں، شہر بھر سے سٹہ باز، لوٹا گھمانے والے اور حتیٰ کہ حصص کا کام کرنے والے بھی چھتر سائیں کے پاس آتے۔ان سے مغلظات سنتے اور پھر ان کے ترجمان فیکا پہلوان کے حضور پہنچتے۔وہ کہتا ''سائیں ہوراں نے تنہہ واری آکھیا دفع ہو جا۔دو واری آکھیا آ تیریاں لتا بھناں۔تنہہ واری جان نوں آکھیا، دو واری آن نوں، رہ گیا اک نمبر۔''

یا پھر یہ عُقدہ کچھ اس طرح حل ہوتا، ''سائیں ہورا نے آکھیا تیری ماں نوں چار کتے۔۔۔۔۔اک مظلوم تے چار ظالم۔اک ظالم نوں مظلوم کھا گیا۔باقی رہ گئے تنہہ۔''

کسی کا نمبر لگ جاتا تو وہ خوش ہو کر نذرانہ لاتا۔ سائیں ہر شے کو اٹھا کر پھینکتے جاتے۔ فیکا صرف کھانے پینے کا سامان رکھ لیتا۔ باقی روپیہ کپڑا لتا سب لوٹا دیتا۔ ایسے ہی کسی سرخرو ہونے والے سائل نے رنگ برنگے کپڑوں سے بنا ایک بڑا چھتر لا کر سائیں کے گڑھے کے کنارے نصب کر دیا کہ دھوپ اور بارش میں بھی سائیں سائے میں رہیں۔ اسی رنگ برنگے چھتر کی وجہ سے ان کا نام چھتر سائیں پڑا۔

چھتر سائیں کی اعداد ظاہر کرنے کی شکتی کو، کہتے ہیں فیکے پہلوان نے ہی دریافت کیا۔ فیکا خود بڑا جواری تھا۔ گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا اور پہلوانی کا شوق رکھتا تھا۔ جوئے میں اپنی جائیداد لٹا دی تو گھر والوں نے اسے نکال باہر کیا۔ یہ سائیں کے آستانے پر آ رہا۔ پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ''سائیں ہوراں نے میرے من وچ حق سچ دا دیوا بالیا اے۔ حق۔ حق۔'' فیکا جناتی جثّے کے ساتھ سائیں کی غلاظت دھوتا اور اس کی مار کھاتا ہوا ایک ایسے منظر کا حصہ معلوم ہوتا جو حقیقی نہیں لگتا تھا، کسی خواب یا کسی فلم کے سیٹ کا حصہ معلوم ہوتا۔

میں ساتویں میں تھا جب میری والدہ کا انتقال ہوا۔ چھوٹا بھائی تیسری یا چوتھی میں ہوگا۔ بہن تین ساڑھے تین سال کی تھی۔ میرے والد نے اسی سال دوسری شادی کر لی۔ ہماری دوسری ماں مسلم ٹاؤن میں رہتی تھی۔ بڑی مال دار عورت تھی۔ اس کا بہت بڑا مکان تھا جہاں ہم ابو کی شادی کے کوئی ایک ڈیڑھ ماہ بعد ہی منتقل ہوئے۔ ہماری کبھی اس سے نہیں بنی۔ ہمیں ہماری ماں کبھی نہیں بھولی، جو خون کی الٹیاں کرتے ہوئے مر گئی۔ ہم اس عورت کو، جس کے ساتھ میں اس کی آخری سانس تک رہا، کبھی اپنی ماں کے طور پر قبول نہیں کر سکے۔

ہمارا باپ تو پہلے بھی کوئی باقاعدہ کام نہیں کرتا تھا۔ ماں ہی ٹیوشنیں پڑھا کر اور ہاتھ سے کروشیا وغیرہ کا کام کر کے پیسے کماتی۔ اب امیر عورت کا ساتھ ہوا تو گاہے بگاہے کچھ کرنے کا تکلف بھی جاتا رہا۔ بلکہ ایک اور عادت شراب نوشی اپنا لی۔ روزانہ دھت ہو کر گھر آتا۔ اونچا بولتا تو دوسری ماں جو ذرا 'ہتھ چھٹ' واقع ہوئی تھی، اس پر پل پڑتی۔ پھر وہ گھر میں ہی بیٹھ کر پینے لگا۔ میں دسویں جماعت کا امتحان دے کر فارغ بیٹھا تھا، جب ہمارا باپ چل بسا۔ بیمار رہنے لگا۔ دو ایک بار ہسپتال میں بھی داخل ہوا۔ پتہ نہیں گردوں کا مسئلہ تھا یا کیا تھا۔ آخری بار ہسپتال گیا تو پھر اس کی لاش ہی ایمبولینس کے ذریعے واپس آئی۔

دوسری ماں کا رویہ یوں تو کبھی بھی ہمارے ساتھ بہتر نہیں رہا۔ ابو کی وفات کے بعد تو وہ بالکل ہی ہم سے بے زار ہو گئی۔ جیسا ایک سوتیلی ماں کے بارے میں سنا کرتے' بس ویسی ہی جابر اور بات بات پر تذلیل کرنے والی۔ ایک بوڑھی عورت' جو کبھی اس کے ہاں ملازم تھی' ماہ دو ماہ بعد اس سے ملنے آتی تھی۔ وہ آدھ ایک گھنٹہ وہاں بیٹھتی۔ گاؤں کی کوئی سوغات جیسے موسمی پھل' گھر کا بنا ہوا گھی' ساگ' مرونڈے' یا ایسی ہی کوئی شے جو عام طور پر اس کی صحت کے لیے موافق نہ ہوتی لیکن وہ اصرار کے ساتھ اسے کھاتی۔ ماں نے ہی بتایا کہ اس ملازمہ کی بیٹی کی شادی پر سارا خرچ اس نے اٹھایا تھا جس کا وہ احسان مانتی اور اس کے باوجود کہ وہ چونڈہ میں اپنے بیٹے کے پاس

چلی گئی تھی۔ لاہور اپنی بیٹی سے ملنے آتی تو اسے سلام کرنے ضرور آتی۔ اس ملازمہ کے سامنے ہم تینوں بہن بھائیوں سے بالعموم اور مجھ سے بالخصوص اس کا رویہ بہت ہتک آمیز ہوتا۔ وہ ہمیں ایسے دیکھتی جیسے ہم کوئی ادنی اور حقیر مخلوق تھے جو کیچڑ میں لتھڑے ہوئے اس کے صاف ستھرے گھر میں پڑے اور گندگی پھیلا رہے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جس کے سامنے وہ ہماری تذلیل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی' اس کا ہم سے برتاؤ بہت مشفقانہ تھا جیسے وہ ہماری حالت زار کا احساس کرتی اور اپنے رویے سے ماں کی بدسلوکی کا مداوا کرنے کی کوشش کرتی۔

میرا اندرون شہر جانا' جہاں میری کچھ سال پہلے تک کی ساری زندگی گزری تھی' مسلم ٹاؤن منتقل ہونے کے بعد قریب قریب موقوف ہو گیا۔ ایف۔ اے کے ابھی داخلے نہیں کھلے تھے اور میرے پاس دن بھر میں کرنے کو کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس فارغ عرصے میں گاہے بگاہے وہاں جانا شروع کیا۔ گھومتا گھامتا، دوستوں سے ملتا ملاتا معلوم نہیں کیوں ہر پھر کر چھتر سائیں کے ڈیرے پر چلا جاتا۔ وہاں اب تو کافی رونق ہو گئی تھی۔ چھتر سائیں کا گڑھا ویسا بدہیئت نہیں رہا تھا، جیسا پہلے کبھی ہوا کرتا تھا۔ سائیں کے اعداد سے سرخرو ہونے والے کسی سائل نے وہاں آس پاس مٹی ڈلوا کر کافی رقبے میں کچا پکا فرش بنا دیا جو سرکتا ہوا فٹ پاتھ کے سرے تک آ گیا تھا۔ یہ اتنا کشادہ تھا کہ وہاں ہم دس بارہ لڑکے آسانی سے کرکٹ کھیل سکتے تھے۔ اس رقبے کے اردگرد فیکے پہلوان نے جھاڑ جھنکار رکھ دی اور کہیں کہیں لکڑی کے شہتیر سے گاڑ کر رنگ برنگے جھنڈے لگا دیئے۔ سائلوں کے لئے دو ایک چٹائیاں، دریاں اور موڑھے جیسی بیٹھنے کی چیزیں بھی کوئی سائل ہی وہاں رکھ گیا ہوگا یا پھر فیکا پہلوان خود ہی کسی کچرے کے ڈھیر سے اٹھا لایا ہوگا۔ خیر اب وہاں آنے والے سائلوں کو سائیں کے بدبودار گڑھے کے کنارے کھڑے ہو کر ان کی مغلظات سننے کا انتظار نہ کھینچنا پڑتا۔ وہ چٹائی یا موڑھا سرکا کر گڑھے کے پاس بیٹھ جاتے۔ چھتر سائیں سے اپنے حق میں دعا کرنے کی درخواست کرتے جس کے جواب میں، جیسا کہ انہیں توقع اور خواہش بھی ہوتی، سائیں انہیں فحش گالیوں سے نوازتے جن میں جنون کا رنگ نمایاں ہوتا اور جو باقاعدہ گالیاں نہیں ہوتی تھیں۔ اکثر مختلف جنسی اعضاء اور حرکات کو تکرار سے بیان کیا جاتا۔ یا وہ ایسی زبان میں اونچا بولتے جو کسی کو خاک بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ لیکن سائلوں کو یقین تھا کہ ان اجنبی آوازوں میں بھی کوئی پیغام تھا جسے شاید دنیا میں بس ایک ہی آدمی سمجھنے کی اہلیت رکھتا تھا، اور وہ تھا فیکا پہلوان۔

عجیب بات یہ تھی کہ جسمانی طور پر فیکا پہلوان جتنا بے ڈھنگا اور بے ڈول واقع ہوا تھا، اس کے گلے میں اتنا ہی رچاؤ، سُر، اور سوز تھا۔ نعت پڑھے، یا ٹپے گائے، لوگ سننے کے لئے ٹھہر جاتے۔ گو کم ہی اونچی آواز میں کچھ گاتا۔ چھتر سائیں جتنا فحش گو اور طبیعت کا کھردرا تھا، اس کے بالکل برعکس فیکا پہلوان اتنا ہی خوش گلو، خوش گو اور خوش اخلاق۔ عوامی حافظے میں اخلاق سے گرا ہوا کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جو کبھی اس کی زبان سے نکلا ہو۔ یہ اس کی آنکھوں کی حیا ہی تھی کہ عورتیں بھی اس ڈیرے پر آتی اور فیکے پہلوان سے ہی رجوع کرتی تھیں۔ اس سے اپنے

بیمار بچوں پر ہاتھ پھرواتیں۔ اس سے تعویز گنڈا کرنے کو کہتیں جو وہ نہ کرتا۔ بس ہر ایک کو دیہاتی ڈسپنسری کے کمپاؤڈر کی طرح، جو ڈاکٹر کی جگہ بیٹھا ہو، ایک ہی طرح کی گولیاں تھما دیتا جو ہر بیماری میں تیر بہدف ثابت ہوتیں۔ فیکے کے پاس بھی ایسی ہی ایک گولی تھی، ''سدا سکھی رہو۔ سب دلِدّر دور ہو جائیں گے۔ سب چکر ہے قسمت کا۔ اچھے دن آئیں گے۔ اس کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔'' یہ ایسا دلاسہ تھا، اور ایسے معصومانہ اعتماد کے ساتھ دیا جاتا کہ آنے والی عورتوں کی زندگیاں بدل کر رکھ دیتا۔ ان کی قسمت کے پھیر کا رخ تبدیل کر دیتا۔ ان ہی عورتوں میں ایک میری دوسری ماں بھی تھی۔

عجیب بات ہے مجھے کبھی پتہ ہی نہیں چل سکا کہ وہ اس ڈیرے پر منتیں ماننے آتی تھی۔ شاید اپنی دائمی بیماریوں کے علاج یا پھر کیا معلوم کس لیے۔ میں ذرا فاصلے پر فٹ پاتھ پر ہی ایک کھوکھے کے باہر بنچ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ وہ چوک کے پرلی طرف رکشے سے اتری۔ پھر سڑک پار کر کے سیدھی فیکے پہلوان کے پاس گئی۔ فیکے پہلوان نے معصومیت کے ساتھ، جیسا کہ وہ ہمیشہ ایسے موقعوں پر کرتا تھا، اپنا سر جھکا لیا اور آنکھیں موند لیں اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ اسی سائل کے انتظار میں تھا کہ کب وہ آئے اور اس سے اپنا دکھڑا بیان کرے۔

جانے وہ اس سے کیا کہتی رہی۔ پھر شاپنگ بیگ میں لپٹی مٹھائی کی پوٹلی سی اپنی چادر میں سے نکال کر اس کی طرف بڑھائی جو اس نے ہاتھ بڑھا کر تھام لی۔ پھر جو کچھ ایسے موقعوں پر وہ اکثر کہا کرتا ہے' ایسی ہی تسلی کی کوئی بات اس نے میری ماں سے کہی ہوگی۔ جسے اس نے سر جھکا کر اور شاید آنکھیں موند کر، پورے انہاک سے سنا۔ وہ اٹھی تو میں بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کھوکھے کی اوٹ میں ہو گیا کہ اسے دکھائی نہ دوں۔ وہ چھتر کے قریب گئی۔ ایک دھاگہ، یا کپڑے کی پتلی کترن چھتر کے ایک کونے سے ٹنگے دھاگوں میں سے ایک کے ساتھ باندھ دی۔ چھتر ایسی رنگ برنگی کترنوں سے' جو ہوا کے دوش پر لہرا رہی تھیں' لدا پھندا تھا۔

میرا ایف۔اے میں داخلہ ہو گیا۔ تب میرا چھوٹا بھائی چھٹی میں تھا۔ بہن دوسری جماعت میں چڑھی تھی۔ ہم تینوں صبح سکول اور کالج چلے جاتے۔ کالج کی مصروفیت شروع ہونے سے میرا روز لوہاری اور بھاٹی گیٹ جانا چھوٹ گیا۔ صرف جمعے کا دن میں وہاں دوستوں کے ساتھ گزارتا۔ کبھی کالج سے چھٹی کے بعد بھی چلا جاتا۔ چھتر سائیں کے ڈیرے میں ایک طرف اینٹوں کی تین کچی پکی دیواریں کھڑی کر کے بغیر چھت کے کمرہ سا بنا دیا گیا جہاں مرادیں حاصل کر لینے والے سائل دیگیں لے کر آتے۔ ایک لنگر سا بن گیا جہاں تقریباً روز ہی کبھی میٹھے اور کبھی نمکین چاولوں کی دیگیں آ جاتی تھیں۔ جمعرات کی رات کو البتہ وہاں عام دنوں سے زیادہ رش ہوتا۔ اس لنگر خانے کی وجہ سے علاقے بھر میں رونق تو ہوئی' وہاں مفت کی روٹیاں توڑنے والے بھک منگوں اور نشئیوں کا ٹھٹھ رہنے لگا۔ وہ وہیں پڑے رہتے۔ کھانے کو مل گیا تو کھا لیا۔ ورنہ ایک طرف گندے نالے کے کنارے بیٹھ کر پنی لگائی یا چرس پی اور دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو کر پڑے رہے۔ کچھ خوانچہ فروش بھی وہاں فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ

آن بیٹھے۔ اچھا خاصا میلے کا ماحول بن گیا۔

اس تمام ہنگامے کا مرکز چھتر سائیں تھے۔ لیکن وہ اس بڑھتی رونق سے دن بدن زیادہ نالاں ہوتے گئے۔ اب ان کی گالیاں فٹ پاتھ پر چلتے لوگ بھی سنتے اور جب کبھی انہیں دورہ پڑتا تو اپنے چھتر کے ڈنڈے کو جو لوہے کا تھا' دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اکھاڑنے کو ہوتے۔ لوگ کہتے ہیں ایک بار انہوں نے زمین میں اندر تک گھڑے ڈنڈے کو باہر کھینچ ہی نکالا۔ جس کے بعد فیکے پہلوان نے ایسا انتظام کیا کہ اسے اکھاڑنا تو کجا، اپنی جگہ سے ہلانا بھی سائیں تو کیا کسی بھی انسان کے بس سے باہر ہو گیا۔ زمین میں گہرا گڑھا کھود کر اس میں پہلے اینٹوں کے چورے اور سیمنٹ بجری کی بھرتی ڈال کر اندر ڈنڈا گاڑا گیا۔ پھر زمین کے اوپر چھوٹا سا تھڑا بنا دیا گیا۔ سائیں شاید اس اہتمام کو سمجھ گئے تھے۔ لہذا چند ایک بار کوشش کی۔ پھر اسے نہ چھوا بلکہ اپنا غصہ فیکے پہلوان کو دو ہتھڑوں سے پیٹ کر نکالتے۔ وہ دیوہیکل آدمی اللہ کی گائے تھا۔ خاموشی سے مار کھاتا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں معصومیت کے ساتھ ساتھ مظلومیت کی سرخی بھر جاتی اور یوں معلوم ہوتا کہ وہ بس رو ہی دے گا۔ اوروں کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں، لیکن مجھے یہ منظر دیکھ کر طیش آ جاتا۔ سوچتا آخر وہ ایک ہاتھ اسے مار ہی کیوں نہیں دیتا۔ سنگل پسلی سائیں تو اس کا کڑ کا سہار نے جوگا بھی نہیں تھا۔ لیکن دنیا کے رنگ نرالے ہیں۔ فیکا پہلوان بھی ایسا ہی ایک نرالا کردار تھا جس کے لئے میں ہمیشہ متجسس رہا۔

بی۔کام کے بعد مجھے ایک جوتے بنانے والی کمپنی میں اکاؤنٹس کلرک کی نوکری مل گئی۔ اٹھارہ سو روپے تنخواہ مقرر ہوئی جو تب میرے جیسے اکیلے آدمی کے لئے تو بہت تھی۔ میری ماں کے لئے البتہ اس کی کیا حیثیت ممکن تھی۔ ستائیس سو روپے ماہوار تو وہ اپنے خانساماں کو دیتی۔ میں نے اسے اپنی نوکری کی بابت بتایا تو اس نے بڑے تحقیر آمیز لہجے میں مجھے محنت سے کام کرنے کی تلقین کی اور تاکید کرتے ہوئے کہا کہ دفتر میں اپنی روایتی کاہلی کا مظاہرہ نہ کروں۔ کیونکہ یہ صرف گھر میں ہی ممکن ہے کہ آدمی کچھ بھی نہ کرے اور پڑا بے کار کی مفت روٹیاں توڑتا رہے۔ دفتروں میں ایسا نہیں چلتا۔ مجھے اپنی کم تر حیثیت کا احساس دلانے، میری تحقیر کرنے اور میری سست طبیعت کو ہدف تنقید بنانے کا وہ کوئی موقع ضائع نہیں کرتی تھی۔ میرا بھائی البتہ ذرا مختلف طبیعت کا تھا۔ وہ اس کی بات نہ سنتا۔ آگے سے جواب تو نہ دیتا لیکن میری طرح تابعداری اور بے بسی سے سر جھکائے کھڑا بھی نہ رہتا۔ لڑکے کی آنکھوں میں چھپی بغاوت کی چمک ماں کو کچھ بھی کہتے ہوئے محتاط رہنے پر مجبور کرتی۔ یوں بھی وہ ذہین اور پر اعتماد لڑکا تھا۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ پھر پری انجینئرنگ میں داخلہ لیا۔ اپنی تمام تر خباثتوں کے باوجود ایک بات ہماری ماں میں اچھی تھی۔ ہماری تعلیم کا خرچہ وہ ذمہ داری کے ساتھ پورا کرتی۔ چاہتی تو ہمیں کب کا نکال باہر کرتی۔ ابو کی وفات کے بعد ہمارا اس پر حق ہی کیا بنتا تھا۔ لیکن شاید اس لئے کہ وہ خود بھی تنہا اور بیمار تھی، وہ ہم بہن بھائیوں کو ساتھ رکھنے پر مصر رہی۔ ہم سوتیلے ہی سہی لیکن وہ ہمیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تنہائی کی ماری ہوئی تھی۔

اس کے سبھی جاننے والے اس کی بدکلامی کی وجہ سے اس سے دور بھاگتے۔ اس کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں تھا۔ دور پار کا اگر کوئی عزیز تھا بھی تو وہ اس سے قطعی لاتعلق ہو چکا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی بھی اس کے پاس نہ ٹکا۔ ایف ایس سی کرنے کے بعد وہ کراچی یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی میں داخل ہوا۔ بس پھر کبھی لاہور واپس نہ آیا۔ کچھ عرصہ تو ماں سے خرچے کے لئے رقم منگواتا رہا۔ پھر شاید اس نے ٹیوشنیں وغیرہ پڑھانی شروع کر دیں اور اپنے خرچے کا بوجھ خود ہی اٹھانے لگا۔

مجھے نوکری کرتے چار سال ہو چکے تھے جب اس نے ہماری بہن کو جو میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی، اپنے پاس کراچی بلا لیا۔ مجھے بھی کہتا رہا کہ چلا آؤں۔ کہیں نہ کہیں وہ میری نوکری کا بندوبست کر دے گا۔ لیکن میں اپنے کینچلی میں دبکا رہنے والا آدمی ہوں۔ تجربات کرنے سے، رسک لینے سے ڈرتا ہوں۔ بس بیٹھا رہا۔ ماں کے گھر میں مجھے کرایہ دینے کی فکر تو نہیں تھی۔ وہ میرے ساتھ کیسی ہی بدسلوکی کرتی، مجھے گھر سے نکل جانے کو تو نہ کہتی۔ میرے لئے جیسا لاہور تھا، اس سے زیادہ غیر محفوظ اور اجنبی کراچی تھا۔ ایک دن ماں نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنے رشتہ داروں میں ایک لڑکی میرے لئے دیکھی تھی جس کے والدین سے اس نے میری شادی کی بات بھی پکی کر دی تھی۔ مجھے بس اس نے اطلاع دی۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات پر صاد کیا۔

منگنی کے وقت میں نے لڑکی کو دیکھا تو مجھ سے اپنی خوشی اور حیرت چھپائی نہ گئی۔ وہ میری توقع کے برعکس خوبصورت تھی۔ شاید یہ پہلا اور آخری فیصلہ تھا جو ماں نے میرے حق میں درست کیا۔ ادھر چھوٹے بھائی نے، جو کیمیکل انجینئرنگ کی ڈگری لینے کے بعد ایک کمپنی میں خاصی معقول تنخواہ پر ملازم ہو گیا تھا، پھر سے مجھے وہاں آنے پر اصرار کیا اور کہا کہ اس نے اپنی کمپنی میں ہی میرے لئے بات کر رکھی ہے۔ لیکن میں اپنا شہر، لوہاری گیٹ، فیکا پہلوان، چھتر سائیں اور اپنی سوتیلی ماں کا گھر کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ میرا سبھی کچھ یہیں تھا۔ میں کسی دوسری مٹی میں کیسے جڑیں پکڑ سکتا تھا۔ پھر مجھے اس کا خط ملا کہ وہ ایک جگہ بہن کی شادی کر رہا ہے۔ شادی پر میں بھی گیا۔ ماں کو اس نے بلایا، نہ وہ گئی۔ مجھے البتہ اس نے جانے دیا، پتہ نہیں کیوں۔ حالانکہ اسے چھوٹے بھائی کی رکھائی پر بڑا تاؤ آیا۔ خیر اس واقعہ کے کوئی چار ایک ماہ بعد ماں نے میری شادی بھی کر دی۔ اس نے میرے چھوٹے بھائی یا بہن کو نہیں بلایا۔ لیکن میں نے انہیں اطلاع کر دی اور وہ خود ہی چلے آئے۔

ماں نے اوپر کی منزل مجھے دے دی۔ وہاں الگ سے باورچی خانہ بھی تھا۔ لیکن کھانا نیچے اکٹھا ہی پکتا تھا۔ یہ دستور ہمیشہ قائم رہا۔ میری تنخواہ پینتیس سو ہو گئی۔ جبکہ ہمارا خانساماں تینتیس سو روپے لے رہا تھا۔ میرے اور میری بیوی کے خرچوں میں یہ رقم ختم ہو جاتی۔ ماں کو میں کیا دیتا۔ چند سو روپے دیتے ہوئے ویسے ہی شرم آتی تھی۔ اس نے خود ہی کہہ دیا کہ اپنے خرچے پورے کر لو تو یہی بہت ہے۔ اتنی تنخواہ میں تو ہمارا خانساماں بھی کہتا ہے کہ اس کی پوری نہیں پڑتی، تمہاری کیا پڑے گی۔ یہ بات جب وہ میری بیوی کے سامنے کہتی تو مجھے لگتا اس نے مجھے سر عام

ننگا کر دیا ہو۔ ایسا مجھے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا۔ یہی وہ تبدیلی تھی جو شادی کے بعد مجھ میں آئی۔ اب اس کی ذرا ذرا سی بات جو وہ میری بیوی کے سامنے مجھے کہتی، میرے دل پر چوٹ کرتی۔ مجھے طنز کے زہر میں ڈوبی ہوئی اور کسی نشتر سے زیادہ تیز لگتی۔ مجھے اپنا آپ اتنا حقیر محسوس ہوتا کہ میری زبان جیسے گنگ ہو جاتی۔ مجھ سے کوئی بات ہی نہ ہو پاتی۔

میری بیوی مجھ سے شکایت کرتی کہ آخر میں ایسی ذلت بھری زندگی کیوں گزار رہا ہوں۔ کہیں اور جا کر کیوں نہیں رہتا۔ لیکن میں پینتیس سو روپوں میں کہیں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ایک پرسکون ماحول کی عادت ہو گئی تھی۔ بڑا گھر، اٹیچ باتھ روم، اے سی، اچھا کھانا اور گھر کے بلوں اور دوسرے خرچوں کی ذمہ داری سے آزادی۔ ان آزادیوں کے ساتھ میں نے عمر کا بڑا حصہ اس گھر میں گزارہ تھا۔ جس قسم کے پورشن میں ہم میاں بیوی رہ رہے تھے، اگر ایسا ہی کرایے پر تلاش کریں تو پانچ چھ ہزار روپے سے کم کیا ہوگا۔ میں اپنی تنخواہ میں واجبی سا گھر نہیں لے سکتا، باقی خرچے کیسے اٹھاتا۔ میں نے بیوی کو یہ باتیں سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ سمجھ تو گئی، غریب گھر سے آئی تھی۔ ان باتوں کو سمجھتی تھی۔ لیکن میری ڈھٹائی اور تن آسانی اس سے ہضم نہ ہو پاتی۔ ماں جب کچھ زیادہ سخت سست کہتی تو کئی کئی دن میری بیوی کی چڑھی تیوری نہ اترتی۔ جس طرح ماں کا نزلہ مجھ پر گرتا۔ اسی طرح بہو کا سینڈ بیگ بھی میں ہی بنتا۔ وہ مجھی کو اپنی تمام تر بدبختی کا ذمہ دار ٹھہراتی۔

''تم کوئی اور اچھی نوکری کیوں نہیں تلاش کرتے۔ اپنے بھائی کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔ کراچی کوئی بری جگہ تو نہیں ہے رہنے کے لئے۔ کوئی پارٹ ٹائم کام ہی تلاش کر لو۔ یا مجھے کہیں نوکری دلوا دو۔ ہم پیسہ اکٹھا کر کے یہاں سے نکل جائیں گے۔''

میں خاموشی سے جیسے ماں کو سنتا، ویسے اسے بھی۔ ماں کو میں نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ اس سے میری زندگی کی آسائشیں جڑی تھیں۔ نہ بیوی سے علیحدہ ہونے کا سوچ سکتا تھا کہ اگر یہ نہ ہو تو پھر یہ آسائشیں کس کام کی۔ سو دونوں کی خاموشی سے سن لیتا۔ کسی ایک کو بھی ناراض کرنے کا یارا مجھ میں نہیں تھا۔ بہر حال پھر شاید اس لئے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ باہر کی دنیا میں میری دلچسپی کم ہو گئی تھی، میں گھر پر ہی رہتا۔ خاص طور پر بیٹے عمران کی پیدائش کے بعد مجھے لگا کہ جیسے میری زندگی میں سوائے عزت کے کسی بھی شے کی کمی نہیں رہی۔

وہ بوڑھی ملازمہ اپنے معمول کے مطابق دو ایک ماہ بعد اس سے ملنے چلی آتی۔ اکثر اس کا بیٹا بھی ساتھ ہوتا۔ جب تک وہ وہاں رہتی، وہ بھی بیٹھا رہتا۔ وہ کوئی آدھ ایک گھنٹہ بیٹھتے اور پھر رخصت ہوتے۔ میں دکھائی دے جاتا تو ماں کی ناراضگی کے خوف سے ملازمہ مجھ سے سلام بھی نہ لیتی۔ میں بھی اس سے کنی کتراتا۔ نیچے ہی نہ اترتا۔ یا پتہ ہوتا کہ اس وقت وہ دونوں ہوں گے تو گھر ہی نہ آتا۔ ادھر ادھر نکل جاتا۔ کسی دوست کے ہاں ٹھہر جاتا یا دفتر میں زیادہ دیر بیٹھا رہتا۔ وہ کبھی بھی ایک گھنٹے سے زیادہ وہاں نہ ٹھہرتے۔ دراصل جب سے شادی ہوئی تھی،

میری طبیعت بہت حساس اور کسی کنواری لڑکی کی عصمت کی طرح نازک ہوگئی تھی۔ میں ڈرتا کہ ان دونوں کے سامنے ماں کہیں مجھے جھڑک ہی نہ دے۔ کتنی سبکی والی بات ہوگی۔

چار سال بیت گئے۔ ماں کو شوگر ہوگئی تھی۔ ایک روز اس کی چیخیں سنائی دیں تو میں بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں گیا۔ اس کی ٹانگ بے جان ہو کر مڑی ہوئی تھی۔ اس پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ فوراً میں نے ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا۔ اس کے کہنے پر ہی میں ماں کو ہسپتال لے گیا۔ کوئی ہفتہ بھر وہ نیورو سرجیکل وارڈ میں رہی۔ پھر چلنے پھرنے جوگی ہوگئی تو ڈاکٹروں نے واپس بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ زیادہ تر اپنے بستر میں ہی لیٹی رہتی۔ چل پھر لیتی۔ لیکن زیادہ نہیں۔ بس شام کی واک کے لئے بیوی کے ساتھ دو گلیاں چھوڑ کر موجود پارک میں جاتی۔ میں گھر پر ہوتا تو مجھے ساتھ لے لیتی۔

وہ جتنی ہم میاں بیوی پر منحصر ہوگئی تھی، اس کے مزاج کی چڑ چڑاہٹ اور زبان کی کڑواہٹ میں بھی اسی قدر اضافہ ہوا۔ لیکن جیسے وقت نے مجھے زیادہ ڈھیٹ اور اپنی نظر میں زیادہ حقیر بنا دیا۔ سو یوں ہوا کہ وہ مجھے میری بیوی اور بچے کے سامنے بھی ڈانٹتی، لعنت ملامت کرتی، میں خاموشی سے سنتا اور بعد میں ذرا سی کوشش سے خود کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو جاتا کہ بیمار آدمی کی پھٹکار سے بھلا کیا ذلت، کیسی بے عزتی۔

بچے کو سکول میں داخل کیا تو فیس کا ذمہ اس نے اپنے سر لے لیا۔ مجھے اپنی بیوی کو سمجھانے کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ ہمیں ہر صورت میں خود کو یہ زندگی جینے پر مجبور کرنا چاہئے، ایک اچھے مستقبل کی امید میں جو ہم سب کا تھا، میرا، میری بیوی اور میرے بچے کا۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ یہ انتظار طویل سے طویل تر ہوتا جائے گا۔ صبر کے بعد میٹھا پھل تو ملتا ہے، لیکن جتنی کڑواہٹ انسان اس مٹھاس کی خواہش میں سہار جاتا ہے، اس کا تو کوئی بدل نہیں، اس کا تو کوئی مداوا نہیں۔ اور اگر اس انتظار کے بعد مٹھاس کو محسوس کرنے والی حس ہی مر چکی ہو تو وہ ایک الگ قصہ ہے۔

میری شادی کو کوئی گیارہ سال ہو گئے تھے جب ایک دن میں دفتر سے چھٹی کر کے کسی کام سے برانڈرتھ روڈ آیا۔ واپسی پر میں بھاٹی گیٹ گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے وہاں چھتر سائیں کے ڈیرے کی جون ہی بدلی ہوئی دیکھی۔ سائیں کا وصال ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ گڑھے کی جگہ اس کا چھوٹا مگر وجیہہ مزار ایستادہ تھا۔ آس پاس کچھ رقبے میں سنگ مرمر کے فرش والا کشادہ صحن تھا۔ ایک طرف چھوٹی سی گلی بنی تھی جس میں لنگر خانہ تھا۔ باہر فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ کتنی ہی دکانیں پھولوں، قرآن مجید اور سپاروں اور مذہبی کتابوں اور طرح طرح کے پتھروں والی انگوٹھیوں' اور حمدوں، نعتوں کی کیسٹوں وغیرہ کی کھل چکی تھیں' روشنیوں میں نہائی اور خوشبوؤں میں بسی ہوئیں۔ میں مزار کے بڑے دروازے سے، جس کی پیشانی پر ''حضرت علم دار حسین پیر چھتر سائیں سرکار رحمتہ اللہ علیہ'' جلی حروف میں لکھا تھا، اندر کشادہ احاطے میں داخل ہوا۔ ایک طرف مزار کا حجرہ تھا جس کے

دروازے کے باہر کچھ عورتیں اور مرد بیٹھے اور کھڑے تھے۔ اندر سبز چادر سے ڈھکی قبر دکھائی دیتی تھی۔ میں اس ارادے سے آگے بڑھا کہ فاتحہ پڑھوں کہ میری نظر بائیں جانب ایک چبوترے پر پڑی جو کافی کشادہ تھا اور جس پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ اس کے باوجود کہ لوگوں کی کافی تعداد اس احاطے میں موجود تھی' سارے میں تقدس بھری خاموشی کا راج تھا۔ چبوترے کے پرلے کنارے کے قریب میں نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا کہ فیکا پہلوان بیٹھا تھا۔

اس کے چہرے پر تو وقت نے کچھ اثرات نہیں چھوڑے تھے۔ لیکن اس کے سر کے گھنگھریالے بال سفید ہو گئے۔ سفید داڑھی میں کالے بالوں کی دھاریاں تھیں۔ لیکن بہت نمایاں فرق اس کے جسم میں آیا جو بے طرح پھیل گیا تھا۔ وہ چوکڑی مارے بیٹھا تھا اور اس کی گود میں خوب ابھری ہوئی توند ایسے دھری تھی جیسے یہاں پڑی ستا رہی ہو۔ فیکے کے چہرے پر ایسا سکون اور شانتی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ کم از کم فیکے کا یہ روپ میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ میں چلتا ہوا اس کے قریب گیا۔ لوگ آتے تھے اور سبز چوڑی چنری اوڑھے اس سادھو کے گھٹنوں کو چھوتے۔ تب میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں معصومیت اور طفلانہ حیرت تو بدستور موجود تھی لیکن ایک احساس اضافی اور بہت نمایاں تھا، کامیابی، افتخار اور اعتماد کا احساس۔ ایسا احساس جو زندگی بھر کی تپسیا کے بعد ملنے والی کامیابی سے انسان کی ذات میں ہویدا ہوتا ہے۔ اس احساس کی بڑی چکا چوند تھی جس نے میرے اندر بھی چانن بھر دیا۔ امید کا چانن۔ میں نے آگے بڑھ کر چھتر سائیں کے جانشین کے گھٹنے کو چھوا۔ وہ ایسی سرشاری اور ازخود رفتگی میں مست تھا کہ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کوئی آیا اور کسی نے اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ مسجد میں مغرب کی اذان بلند ہوئی۔ میں جا کر صحن میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے مزار کے گنبد پر، جو اس وقت سورج کی سرخ ہوتی روشنی میں دہک رہا تھا' کبوتروں اور چڑیوں کے غول بیٹھے دکھائی دیئے۔ مجھے اپنا جسم تھکاوٹ سے چور محسوس ہوا۔ میری آنکھیں تھکن کے بوجھ تلے بند ہونے لگی تھیں۔

اظہر الحق (دبئی)

کالی دھند

میں روز کی طرح بس اسٹاپ پر کھڑا اپنے روٹ کی خالی بس کا انتظار کر رہا تھا، بھری ہوئی بس میں چڑھنا اور پھر مرغا بن کر کھڑا ہونا کم از کم میرے بس میں نہیں ۔۔۔ ویسے بھی میری جاب ایسی ہے کہ ٹائم کی زیادہ پرواہ نہیں ہوتی، میں محکمہ صحت میں ہوں ۔۔۔

سولہ نمبر کی بس جھومتی ہوئی نظر آئی، اس وقت کیونکہ سارے شہر کا ٹریفک سڑک پر ہوتا ہے تو فضا میں دھوئیں اور پٹرول کی بو رچی بسی ہوتی ہے، اور دھوئیں کی وجہ سے گاڑیاں ایسے نمودار ہوتیں ہیں جیسے دھند میں سے ۔۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ دھند سفید نہیں کالی ہوتی ہے

میں بس میں سوار ہو چکا تھا، اور اتفاق سے کھڑکی کے پاس والی سیٹ مل گئی، میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ پاس سے ایک دوسری بس پورے شور کے ساتھ گذری اور دھوئیں کا ایک مرغولہ جیسے بس کے اندر گھس آیا، میں نے کچھ پل کیلیئے سانس روک لیا، ایسے موقعے کیلیئے میں نے کافی پریکٹس کی تھی مگر میرے ساتھ والے صاحب جنھوں نے کلف لگے سفید کپڑے پہن رکھے تھے [جواب سفید نہیں رہے تھے] کھانس رہے تھے، شاید دھواں انکے سانس کے ساتھ اندر چلا گیا تھا، پھر وہ سیٹ کے ساتھ سر لگا کر ٹک گئے، انکا سانس اکھڑ رہا تھا، ہماری بس نے سپیڈ پکڑ لی تھی، شاید ڈرئیور کسی کے ساتھ ریس لگا رہا تھا، میں نے ان صاحب کو پوچھا، آپ ٹھیک تو ہیں، وہ کچھ بول نہ پائے، انکی سانس اکھڑ رہی تھی، بڑی مشکل سے انہوں نے کہا کہ وہ، دمہ کے مریض ہیں، میں نے پوچھا آپکے پاس انھیلر ہے، وہ جیب سے انہیلر نکالنے لگے، ابھی انہوں نے اسکا ڈھکنا اتارا ہی تھا، کہ بس نے بریک لگائی اور کنڈیکٹر کی آواز آئی جلدی جلدی ۔۔۔ اور پھر ایک جم غفیر جیسے بس میں گھس آیا ہو ۔۔۔ اور بس ایک جھٹکے سے چل پڑی، میرا دھیان تھوڑا ابٹ گیا تھا، مگر جب میں نے ان صاحب کو دیکھا تو وہ بہت ہی تکلیف میں نظر آئے، انہیلر انکے ہاتھ سے گر چکا تھا، وہ بس کے فرش کی طرف اشارہ کر رہے تھے، میں نے جھک کر انہیلر اٹھانہ چاہا تو بس نے پھر

ایک بریک ماری اور میرا سر اگلی سیٹ سے جا ٹکرایا، مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا، اور میں نے دیکھا کہ انہیلر جھٹکے کی وجہ سے ایک سیٹ پیچھے چلا گیا ہے، میں نے پھر کوشش کی اور پچھلی سیٹ والے کو کہا کہ پلیز یہ انہیلر اٹھا دیں، ابھی وہ صاحب اٹھانے کے لیئے جھکے ہی تھے کہ ایک بھاری پاؤں اس پر پڑا اور چٹک کی آواز آئی، دیکھ کر نہیں چلتے، وہ صاحب جھنجھلا کر بولے، تم نیچے کیا جھک مار رہے ہو، بھاری پاؤں والے نے کہا، میرا دھیان پھر بٹ گیا، مگر جب ساتھ والی سیٹ پر دیکھا تو وہ صاحب جھکے ہوئے تھے، میں نے کہا، جناب میں اٹھا دیتا ہوں آپ سیدھے ہو کر بیٹھیے، مگر کوئی رسپانس نہیں دیا، میں نے جھک کر دیکھا ، میرا سانس جیسے اٹک گیا، میں نے انہیں سیدھا کیا، مگر انکے چہرے پر اذیت ہی اذیت تھی ، میں نے حالات کی نزاکت بھانپ لی ، اور چیخ اٹھا بس روکو بس روکو، باقی لوگوں کو بھی احساس ہو گیا تھا، وہ بھی چیخ پڑے، مگر شاید، ان کا وقت ختم ہو چکا تھا، بس رکی ، اور ہم لوگوں نے ان صاحب کو اٹھا کر باہر نکالا ، اور فٹ پاتھ پر ایک درخت کے نیچے لٹا دیا، ہمارے پاس سے گاڑیاں دھواں اڑاتی گذر رہیں تھیں، پھر ایک صاحب کی آواز آئی جو نبض چیک کر رہے تھے، یہ تو ۔۔۔ یہ تو ۔۔۔ پھر سب خاموش ہو گئے، ہمارے ارد گرد گاڑیوں کی آوازیں تھیں، اور ہم کالی دھند میں گھرے کھڑے تھے ۔۔۔۔۔۔۔

ڈاکٹر وزیر آغا (سرگودھا)

اسرار

تری آنکھوں کے اندر کوئی شے ہے
جسے میں نے کبھی دیکھا نہیں ہے
تری پلکیں جسے چھونے کی خاطر
سدا سے مضطرب ہیں
انھیں لیکن خبر شاید نہیں ہے
اسے چھونے کی خواہش بھی کریں تو
سمٹ جاتی ہے وہ اپنے ہی اندر
وہ اندر جس میں سمتوں کی کمی ہے
نہ گہرائی کی کوئی انتہا ہے
مجھے لیکن پتا ہے۔۔وہ
لپک کر آنے والی ہے
مری پھیلی ہتھیلی پر
اگر میں اس کی خواہش میں نہ یوں پاگل بنوں
آنسو بھری ان اپنی آنکھوں سے
اسے میں دیکھنے کی بات بھی دل میں نہ لاؤں
مگر کیسے نہ لاؤں وہ مجھے آرام کرنے ہی نہیں دیتی
مرے سارے بدن میں ناچتی پھرتی ہے وہ ہر دم!!

ڈاکٹر وزیر آغا

ہوا ناراض تھی شاید!

ہوا ناراض تھی شاید
نہ اس نے بات کی ہم سے
نہ اپنے ساتھ چلنے کو کہا،
اندھی گلی کے موڑ پر رُک کر
ہمیں بس اک نظر دیکھا
مگر پھر موڑ کاٹا اور بہت سے
راستوں سے ایک رَستہ
چُن لیا اُس نے
جو قصبے کے دھواں آلود
گہرے حاشیے کی سمت جاتا تھا
جہاں اک ریل گاڑی
منتظر تھی اس کے آنے کی!

ہوا ناراض تھی شاید
بہت جلدی تھی اُس کو
ریل کا پلّو پکڑ کر
دُور جانے کی
دمادَم پیچھے ہٹتی پٹڑیوں میں
جذب ہونے کی!

پروفیسر آفاق صدیقی (کراچی)

امن عالم

وہ جو گل گوں سی اک روشنی
ذہن و دل کے دریچوں کا پندار تھی
آج حسرت کشیدہ شب و روز کا
پیکر درد ہے
نیم جاں فاختہ
جانے کب تک یونہی
شاخ زیتون کی
اپنے کام و دہن میں سجائے ہوئے
امن عالم کے خوابوں میں کھوئی رہے
جانے کب تک چھٹے
بے یقینی کی چاروں طرف
یہ جو چھائی ہوئی گرد ہی گرد ہے
خوف و دہشت سے
مہر و وفا کا لہو سرد ہے
شاخ زیتون بھی زرد ہے

رؤف خیر (حیدرآباد دکن)

دو نظمیں

(۱)

تمھیں لکھنا تو آتا ہے
مگر جس روز تم میری طرح لکھنے لگو گے
میرے لکھنے کی ضرورت کیا رہے گی

(۲)

وارث

مِرے چراغ نے دیکھی نہ وہ کفِ روشن
میں جس میں نقش رہا صورتِ خطِ بیضا
مگر یہ میری تمنا ہے اپنی آنکھوں سے
میں اپنے گھر میں چراغوں کا سلسلہ دیکھوں

خورشید ناظر (بھاولپور)

اعادہ

کوئی قصہ، کہانی، داستاں
پھر سے سنا ڈالو
سرابوں میں اترنے والی چھاؤں کی ہر اک تصویر
اب خود ہی مٹا ڈالو
مرے ہونٹوں پہ لفظوں کی نئی زنجیر کہتی ہے
صدا کی ایک پیلی نہر اب سڑکوں پہ بہتی ہے
ہر اک تتلی تماشا جان لیوا بنتا جاتا ہے
سبھی سانسوں پہ اک آسیب کی اب حکمرانی ہے
لہو میری محبت ہے
عجب میری کہانی ہے
کہانی گو پرانی ہے مگر سب کو سنانی ہے

☆

ہوا اب کے برس بھی شہزادوں پر قیامت ہے
سبھی اشجار پراسرار روحوں کی کمیں گا ہیں
سلگتی ہیں سبھی راہیں
حسیں چہرے ہیں لیکن آنکھ سے شعلے ٹپکتے ہیں
خموشی کا حسیں جنگل ہے جس میں چلنے والوں کا
قدم دھرتی پہ پڑتا ہے تو پتے تھرتھراتے ہیں
بظاہر لفظ خوشبو ہیں
مگر آنکھوں میں آنسوں ہیں
مناظر درد سہتے ہیں
دبے لفظوں میں کہتے ہیں
ہوا اب کے برس بھی شہزادوں پر قیامت ہے
یہی تیری محبت ہے
یہی میری کہانی ہے
کہانی گو پرانی ہے مگر سب کو سنانی ہے

خورشید ناظر

ہوا پرندہ بنے تو لکھوں

تمہارے ہونٹوں کی تازگی کو
سلام پہنچے
سلام پہنچے مرے لبوں کا
تمہاری سانسوں کی نغمگی کو
سلام پہنچے
سلام پہنچے حسیں رتوں کا
تمہارے جذبوں کی روشنی کو
سلام پہنچے
سلام پہنچے صداقتوں کا
تمہاری سوچوں کی دل کشی کو
سلام پہنچے
سلام پہنچے رفاقتوں کا

تمہاری آنکھوں کی گہری جھیلوں میں میرے آنسو
کنول کی مانند جگمگائیں
مری محبت کے گیت ہر دم
تمہیں سنائیں
تمہارے ہاتھوں پہ میرا بوسہ
سوال بن کر یہ تم سے پوچھے
مری محبت میں کیا کمی ہے؟
تمہارا چہرہ
گلاب کی طرح سرخ ہو کر
یقیں دلائے
کہ تم میں جذبوں کی ساری خوشبو
صداقتوں کی جو روشنی ہے
مرے لیے تھی
مرے لیے ہے
مگر یہ خواہش
ہوا پرندہ بنے تو لکھوں

فرحت نواز شیخ (رحیم یار خان)

چار نظمیں

۱

لفظ کتابوں میں اور خواب
دل میں سجائے رکھو
دونوں
عملی زندگی میں
اتنے ہی بے کشش ہیں
جتنے جگنو
دن کی روشنی میں!

۲

لمبی نیندیں سو گیا بابل
ماں نے اوڑھا بے رنگ آنچل
وقت کی گردش ٹھہر گئی ہے
آنکھ میں منظر ------
ایک ہی منظر تیر رہا ہے
میں نے جتنے لفظ پڑھے تھے
ان کے جو معنی سمجھے تھے
آج وہ سارے بدل گئے ہیں
ماضی، حال اور مستقبل کے سارے لمحو!
مجھ کو کچھ بھی نہیں سمجھاؤ
میری طرح بس سوگ مناؤ ---چُپ ہو جاؤ!

۳

بھائیوں کی چُپ،
بہنوں کی خالی خالی نظریں
ماں کا بہت سفید دوپٹہ
اپنے سر کے اوپر سے
جب آسمان سرکتا دیکھوں
بابل تیری یاد آئے اور دل کٹتا ہی جائے!

۴

کتنے برسوں بعد
کڈز کارنر میں اچانک سامنا ہوا تو
ہم دونوں ایک دوسرے کا حال تک نہ پوچھ سکے
میری نظریں اس کی نظروں سے ٹکرا کر
اس کی توند پہ جا کر ٹھہر گئیں
اور اس کی نظریں
میرے تازہ رنگے ہوئے بالوں میں جیسے اٹک گئیں
وہ اپنے بیٹے کے لئے جو سوئیٹر خرید رہا تھا
اسے چھوڑ کر چلا گیا
اور میں اپنی بیٹی کے لئے
جو جیکٹ خرید کر لائی
وہ بڑے سائز کی نکلی۔

داؤد رضوان (راولپنڈی)

آئندہ کے طاقچے میں ٹنگی ایک تصویر

رات کے ٹوٹے ہوئے پر
کھڑکیوں میں
اور دریچوں میں پڑے ہیں
کون آتا اور جاتا
بچپنے کی عمر تو رخصت ہوئی
نیلے، اودے، کالے، پیلے
دودھیا پر
کاپیوں میں
اور کتابوں میں سجانے کا سمے رخصت ہوا

جاتی عمروں کے یہ پل ہیں
اور راتوں کے شکستہ پر
اکٹھے کرتے کرتے
نیند وادی میں اتر جانے کی خواہش
روح کے اندر ہمکتی ہے مسلسل

داؤد رضوان

کائی زدہ پانیوں میں عکس دیکھنے کی تمنا

وہی سلسلے ہیں خیال کے
وہی جستجو انہیں گم شدہ خد و خال کی
جنہیں رہنما کیا مدتوں
کئی قرن بیت گئے سوال و جواب میں
رہی ہر گھڑی
مری تشنگی مرے ساتھ ہی
نہیں حل ہوئیں مری الجھنیں
کہ میں ہوں گمان و یقین کے کہیں درمیاں
کسی اضطراب میں مدتوں سے گھرا ہوا
مرے پانیوں کی روانیاں
ہوئیں منجمد
مری آنکھ صدیوں کی ریت سے ہے اٹی ہوئی

کسی شاہراہ خیال پر
تھا مرا جنوں مرا راہبر
کہوں کیا مگر

اسی شاہراہ خیال پر
کہیں سرخ وسبز کے درمیان جو زرد ہے
وہی روشنی مرے اعتبار کا قتل ہے

یہی بیش وکم یہی پیچ وخم
مری بے بسی کا سبب ہوئے
مرے قافلے رہے گامزن اسی سمت میں
کہ جہاں سراب ہیں خیمہ زن
کہ جہاں بگولے ہیں رقص میں
میں جو کائنات کے کم ترین حصار میں ہوں کہیں قیام
پذیر
میرا قدم اٹھے بھی کہاں تلک
کہ نہیں ہے میرے وجود میں
کسی اختیار کے پل کی کوئی نمود تک
نہ لکیر ہے مرے ہاتھ میں
کسی خوابناک وصال کی

میں جو کٹ گیا ہوں خود اپنی ذات سے
(اس کا کس کو ملال ہو)
مری سوچ کے سبھی آئنے
ہوئے زنگ خوردہ (تو کیا ہوا)
کہ ہر اک زمانے کی دھول سے ہوں اٹا ہوا

یہ غبار میرا وبال ہے
سو اسے مجھی کو ہے کاٹنا

گو مرے لیے ہے حریم وقت کا در کھلا
پہ سکوت میں ہوں گھرا ہوا
یہ سکوت ٹوٹ سکے اگر
تو کھلیں کسی نئے آسمان کی کھڑکیاں
بنے کوئی منظر تازہ آنکھ کے کورے کاغذوں پر کبھی

داؤد رضوان

نارسا لمحوں کی بات

ہزار دکھ اک خوشی کے پردے میں رو پڑے ہیں
جنم جنم کی مسافتوں کے
طویل رستوں کی داستاں ہے
کئی یبوست زدہ دنوں کی کہانیاں
چشم تر پہ لکھی ہوئی ہیں
(عنوان مانگتی ہیں)
کسے بتائیں
کہ خواب اترے
تو آنکھ میں رتجگوں کے کنکر جڑے ہوئے تھے
بجھے ہوئے سورجوں نے تھک کر
شبوں کی آغوش میں پناہ لی
تپش میں بھیگی ہوئی شبوں میں

بساط بھر جستجو سے شل بازوؤں پہ
کیسی تھکن لکھی تھی

نگر نگر کی سیاحتوں میں
ہوا بھی رستہ بھٹک چکی تھی
کٹے پھٹے منظروں میں گم کردہ راستوں پر
غبار سا تھا

نخیل سرسبز پر
کسی زرد رت کا سایہ
عذاب بن کر کھلا ہوا تھا
اڑان بھولے ہوئے پرندوں نے
ریت پر
(پانیوں کے دھوکے میں پر سمیٹے)
تو لوٹ کر آ نہیں سکے تھے
بسے ہوئے گھونسلوں میں امید
پیاس بن کر سسک رہی تھی

ہمی تھے وہ بھی
جنہیں سیہ شب کی ناف سے
عطر صبح روشن
کشید کرنے کا اذن تھا
(جن کے ذہن تتلی گھروں کے رکھوالے
بن گئے تھے)

سعید احمد (راولپنڈی)

نیند میں چلتے خواب

دھند میں سوئے ہوئے دن
کہر میں جاگی ہوئی راتیں
سفر کی خواب ہیں

خواب ہیں جن میں
کسی سورج، کسی بھی چاند کی
مبہم سی کوئی آس تک روتی نہیں
آسماں کی دائمی نیلاہٹوں کے وصل کی
خواہش کبھی ہوتی نہیں

خواب ہیں ٹوٹی ہوئی ہر دائرے کی گردشیں
دیوار سے دیوار تک ساری حدیں

خواب ہیں کچھ راستے
[آسودگی کی گھاس میں لپٹے ہوئے
آہستہ رو قدموں
کے ہلکے لمس کی سرشاریوں کے منتظر]
اور ہم تم۔۔۔۔۔۔۔
بے خودی کی لہر میں گم
وقت کے اڑتے پرندے کو
گرہ میں باندھ کر چلتے رہیں

-------چلتے رہیں

-------چلتے رہیں

سعید احمد

ہوا کی قبر میں زیاں کے ورق پر تحریر احساس

اداسی ہمکتی رہے دل کی آغوش میں
ہمالہ کی چوٹی پہ خیمے میں جلتی ہوئی آگ کی
قربتوں سے
خنک نارسائی تلک
فاصلہ ایک پل سے زیادہ نہیں---

مگر---وہ----!
ابھی تک جو میری صراحی کا بادہ نہیں
اُسے کون سے لفظ کی لکنتوں کی گرہ کھول کر
ایک بے نام سے نام ہی سے پکاروں---
مگر-----!
یہ اندیشۂ عمرِ لا انتہا کے گذشتہ کی سل----
[وراثت میں آئی جو معلوم شجرے سے پہلے کہیں]
غار کے منہ سے ہٹتی نہیں

گئے عہد کی نیکیاں---؟

یاد کی شاخ سے جھڑ چکیں
ورنہ یوں ہی دعائیں
فقط رائگانی کا سندیس لے کر
فلک سے پلٹتی نہیں-------

تابش کمال (چکوال)

کربِ آگہی

سوال ہونٹوں پہ کانپتے تھے
کلاس میں کوئی سوچ ابھرتی تو ماسٹر کی چھڑی اچانک
ہی سنسناتی
ہم ایک دُوجے کو چٹکیاں کاٹ کر اُٹھاتے
کبھی تو سانسوں کا غیر ہموار سلسلہ بات کا توازن بگاڑ
دیتا
کبھی حروف ایک دم خیالوں کو قطع کرتے
جو فقرہ فقرہ الجھ رہے تھے
ہمیں ان الفاظ کو پکڑنا بہت ہی دشوار ہو گیا تھا
ہماری سانسوں میں رعشہ
ٹانگوں میں لرزہ
آنکھوں میں تیرگی تھی

اور اب جو ہم لفظ جانتے ہیں
اسی طرح سے نہ ہونے ہونے کے درمیاں ہیں
سوال ہونٹوں پہ کانپتے ہیں

طاہر مجید (جرمنی)

تجدید

آؤ ہم تم
پھر سے گلے لگائیں اک دوجے کو
بھول کے سب ماضی کی نفرت
پھر سے پیار کریں ہم ایسا
جیسے ہم تم بچھڑے تھے
پر اک دوجے کو بھولے کب تھے!

آؤ
ساری نفرت کی دیواریں
اپنے ہاتھ سے توڑیں
پھر سے پیار کا رشتہ جوڑیں
ماضی کا وہ سارا عرصہ
جیسے ایک بھیانک سپنا تھا
اس سپنے کو توڑیں
پھر سے پیار کا رشتہ جوڑیں

آؤ ہم تم
اک دوجے کو
پھر سے گلے لگائیں!

شمسہ اختر ضیاءؔ (خانپور)

دعائیں تحریر کر رہی ہوں

میں خون دل میں قلم ڈبو کر
دعائیں تحریر کر رہی ہوں
ضیاءؔ نہ جانے میں کس کی خاطر
وفائیں تحریر کر رہی ہوں
میں اپنی چاہت کی روشنی سے
میں اپنے جذبوں کی چاندنی سے
میں ان تمناؤں کے لہو سے
خلوص دل سے
صدائیں تحریر کر رہی ہوں
وفائیں تحریر کر رہی ہوں
نہ جانے میں آج کس کی خاطر
دعائیں تحریر کر رہی ہوں

شمسہ اختر ضیاء

ایک نظم

کتنے خوش فہم تھے کبھی ہم بھی
ہم نے راہوں کو بے خطر سمجھا
چاند تاروں کو ہم سفر سمجھا
زندگی کے گلاب لمحوں کو
اپنے دامن میں ڈالنا چاہا
دوستی کے حسین پردے میں
دشمن جاں کو بارہا چاہا!
کہکشاں کے حسیں ستاروں کو
اپنے آنچل میں ٹانکنا چاہا
زندگی کی حسین راہوں پر
بے خطر ہم نے گھومنا چاہا
اور ارض وسما کی وسعت میں
اپنی ہستی کو ڈھونڈنا چاہا
خواب کے پرکشش جزیروں میں
کی تخیل سے اپنے ضو ہم نے
چاند اترے ہمارے آنگن میں
کی تصور میں آرزو ہم نے
پھول مہکیں ہمارے دامن میں
کی بہاروں کی جستجو ہم نے

باد سحری کو راز داں جانا
کی صبا سے بھی گفتگو ہم نے
زیست کو کس قدر حسیں سمجھا
ساز فطرت کا دلنشیں سمجھا
کتنے خوش فہم تھے کبھی ہم بھی
بعد مدت یہ بھید پایا ہے
دھوکہ ہر اک قدم پہ کھایا ہے
دوست سمجھا جسے وہ دشمن تھا
راہبر ہی ہمارا رہزن تھا
جھوٹی باتوں پہ اعتبار کیا
بے وفاؤں پہ دل نثار کیا
پھول مانگے تو خار پائے ہیں
ایک تاریک شب کے سائے ہیں
زندگی ایک زرد صحرا ہے
جس میں اب حسرتوں کا ڈیرا ہے

جستجو کی خلوص کی جب بھی
ہم کو زخموں کی چاندنی ہی ملی
چاند تاروں کی آرزو کی تھی
اور بہاروں کی آرزو کی تھی
وہ تو سب اک سراب تھا جیسے!

پروفیسر نذر خلیق (خانپور)

اھدنا الصراط المستقیم

جہاں میں کھڑا ہوں
وہاں ہر طرف نفرتوں ذلتوں کے
سیہ ماتمی سے
تھرکتے ہوئے سائے ہی دیکھتا ہوں
کسی ماتمی دھن کی لے پر
تھرکتے ہوئے سائے اپنا مقدر بنے ہیں
خدایا!
کہیں سے کوئی روشنی کہ جو
گھرے اندھیروں سے ہم کو چھڑا دے
ہمارے مسائل کا حل بھی بتا دے
خدایا ہمیں سیدھا رستہ دکھا دے!

ترنم ریاض (دہلی) کی پانچ نظمیں

یا سمیع الدعا

(۱)

خالقِ دو جہاں
میں ہوں واحد وہ تخلیق تیری
جہاں کے بہشت بریں پر
جو مخلوق اشرف کے پھلنے کا مُوجب بنی

یا علیم السمیع!
جس کی پسلی سے کی تھی مری ساخت
اُس کی رفاقت کی خاطر
کہ تنہا نہ ہو
زیست کی راہ نو پر کہ میں نے بھی تو
دیکھ بن کر زمیں
بخش ڈالا اسے آسمانوں کا رتبہ
اور اپنی مطیع قوتِ صبر پر

یا عظیم القوی
اس کے ہی زورِ بازو کو ترجیح دی
کر کے ہر نرم جذبے میں اپنے اسے حصہ دار

اس کی ہی چاہ کو خود پہ حاوی کیا

یا حفیظ الغنی

رنگ اس کے رنگی

زندگی اس کی جی

قادر المقتدر، مالکِ بحر و بر

آج تک اسکا گھر

گھر اسی کا رہا

درد میں نے سہے

نام اس کا ہوا

(۲)

یا نصیر الوفی!

میں نے بچپن سے ہی

گود میں کھیل کر

شفقتِ پدرانہ کی تشفی کی

اس کی خدمت، اطاعت

صبح و شام کر کے

سنبھالا سنوارا جو گھر میں نے تھا

وہ میرا گھر بھی میرا نہیں اور میں

دوسروں کی امانت پکاری گئی

یا متین البدیع!

خواہرانہ محبت سے مغلوب ہو کر

میں اس پر ہر اک شے لٹاتی گئی

گر تھا چھوٹا تو ماں کی طرح خواہشیں

اس پہ قربان کر کے مناتی خوشی

پھر بھی دل میں جگہ مجھ کو اس نے دی

یا مُمیت المُحیی!

جنم جس کو دیا کتنے ارمان سے

خود کو ٹکڑے کیا بُوجھ کر جان کے

مجھ کو ان رت جگوں کا ملے کچھ صلہ

ٹوٹ جائے نہ الفت کا یہ سلسلہ

ہے یہی ایک جذبہ کسی طرح قائم

اسی ایک رشتے پہ ہے کچھ یقیں

یا تواب الولی!

تیرا تبدیل ہوتا ہوا یہ جہاں

یوں نہ ہو جائے اس کو بدل دے کہیں

خوں نہ ہو جائے جذبات کا دیکھنا

آس تیرے کرم کی میں کھو دوں؟ نہیں!

یا رب العالمیں یا رب العالمیں

یا سمیع الدعا یا سمیع الدعا

نامحرم

اُس کے ہر مُو سے لپٹا ہو گا اک سانپ

دل کش آنکھیں اس کی، داغی جائیں گی

جدید ادب

انگاروں پر ہو گا اس کا نرم بدن

ایسے جرم کے بعد...

رحم کی کیا ہو گی امید اُسے!

حالانکہ ہر دل کا مالک اللہ ہے

اس کے جان اور جسم کا ہے مختار

کوئی محرم اس کا...

اُس کو اک نامحرم اچھا لگتا ہے!

چپکے چپکے رویا جائے

شام بجھی سی

پنچھی چپ

سینے کے اندر سناٹا

اور، روح میں نغمے پھیکے سے

ان دل کے زخموں کو

اشکوں سے دھویا جائے

اب کچھ دیر کو

چپکے چپکے رویا جائے

پلکوں میں

تیری ہاکی، کمپیوٹر

خاموش ہیں تیرے کمرے میں

بستر پر اک سلوٹ بھی نہیں

پڑھنے کی میز ہے سجی ہوئی

اک کونے میں

دونوں چپلیں، چپ چاپ سی ہیں

تیرے مستقبل کی خاطر

رکھ کر اس سینے پر پتھر

اپنے سے تجھ کو دور کیا!

زخمی نظریں، یہ تنہا دل

اُس دن سے بچھا ہے رستے میں

کمرے کی ہر اک شے پھیلا دے

یا زور سے سُن موسیقی تو

آ گھر میں مگر موجود تو رہ!

پلکوں میں چھپا کر رکھوں گی

اب اک بھی بار نہ ڈانٹوں گی!

کاروبار

وہ آتا ہے، تو ویرانی پہ اپنی

اوڑھ لیتی ہوں میں اک مسکان

دل دہشت سے لگتا ہے دھڑکنے

پھر کہیں، یونہی گرج کر وہ

سکوں گھر کا نہ لُوٹے...

بانہہ پکڑے تو سراپا ہی خوشی بن جاؤں

جیسے اِک اسی پل کی تھی ہستی منتظر میری!

مجھے اس کی وجہ سے اپنا گھر بازار لگتا ہے

میں لٹتی جاؤں جس میں ایسا کاروبار لگتا ہے

تضمینِ غالب

صبا اکبر آبادی

(صبا اکبر آبادی نے ۱۹۲۸ سے ۱۹۳۸ کے درمیان مکمل دیوانِ غالب کی تضمین کی تھی۔ جو آج تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی ہے، اس بار غالب کی ایک غزل کی تضمین شائع کی جارہی ہے۔ **ریحانہ احمد**)

جل بُجھیں گے شبِ فرقت کی سحر ہونے تک　　دل لہو ہوگا مداوائے جگر ہونے تک
ہم تو مرجائیں گے الفت کی نظر ہونے تک　　آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

رفعتِ مرتبہ کے کیا کوئی آسان ہیں ڈھنگ　　دیکھنے پڑتے ہیں دنیا کے ہزاروں نیرنگ
کبھی موجوں سے لڑائی کبھی طوفان سے جنگ　　دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

امتحاں ہائے محبت کی نہ حد ہے نہ حساب　　طاقتِ ضبط کے آثار جگر میں کمیاب
کشمکش میں ہے گرفتار دلِ خانہ خراب　　عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

جانتے ہیں کہ جفا تم سے ہے اب ناممکن　　ہائے قاصد ہی نہیں نامہ بری کا ضامن
تم جب آؤ گے تو ہستی کے گزر جائینگے دن　　ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

حسرتِ لطف میں باقی ہے دلِ زار و دو نیم　　دل کی ہستی شبِ غم تک ہے زمانے میں مقیم
بادِ صرصر ہے مرے حق میں محبت کی نسیم　　پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

جیتے جی غم کی حکومت کبھی اندوہ کا راج　　فکر سر کی ہے کہیں اور کسی کو غمِ تاج
زندگانی میں صباؔ کس کا سنبھلتا ہے مزاج　　غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(غیر مطبوعہ)

اداریے پر ردِ عمل

مابعد جدیدیت اور عالمی صورتحال

ڈاکٹر وزیر آغا (لاہور)

آپ کا اداریہ خصوصی طور پر قابلِ تعریف ہے۔ اس میں آپ نے ایک ایسا نکتہ اٹھایا ہے جس کے حوالے سے مجھے اپنے مضامین میں بہت کچھ لکھنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ بالخصوص میری کتاب ''معنی اور تناظر'' کے مضامین میں۔۔۔اصل مسئلہ یہ تھا کہ ساختیات اور پس ساختیات نے ''مرکز'' یا Logo-Centrism کے تصور کی نفی کی تھی۔ یہ کام فرانس کے مفکرین نے آج سے کم و بیش چالیس برس پہلے کیا۔ امریکی مفکرین نے تو فقط فرانسیسی مفکرین کی خوشہ چینی کی ہے۔ ساختیات نے مرکز کے بجائے رشتوں کے جال یعنی web of relations کی بات کی اور یہ بات اصلاً جدید طبیعات سے مستعار تھی۔ مگر ساخت میں 'مرکز' کی نفی کرنے سے مرکز کی نفی نہ ہوسکی۔ یہ نکتہ میں نے اپنے مضامین میں پیش کیا ہے۔ کیونکہ ساختیات کی پیش کردہ ساخت میں 'مرکز' ساری ساخت کے اندر ہر مقام پر موجود دکھائی دیتا ہے، جو وحدت الوجودی تصور ہے۔ گویا ساختیات والوں نے پرچم تو الحاد کا تھاما مگر 'مرکز' کی نفی کرنے میں بری طرح ناکام ہوئے۔ یوں خود ان کی تھیوری کے اندر 'مرکز' کی ہمہ گیری کے تصور کی توثیق ہوگئی۔

ساختیات والوں کے بعد ساخت شکن مفکرین یعنی Deconstructionists نے ساختیات کے تصورِ ساخت کی بھی نفی کردی اور کہا کہ یہ کائنات ایک گنجلک یعنی Labyrinth ہے۔ اس کے جواب میں، میں نے لکھا ہے کہ اس سے بھی خالق کی نفی نہیں ہوتی، جیسے کہ نیطشے نے کوشش کی تھی۔ خود مشرقی دانش نے خالق کے انگنت اوصاف میں فہم سے ماورا ہونے کے وصف کی بھی نشاندہی کی ہے۔ حقیقتِ عظمیٰ کے تصور کو جو پردہ در پردہ اور حجاب اندر حجاب ہے انسان کا ذہن کیسے گرفت میں لے سکتا ہے!

میں نے اپنے مضامین میں اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ تخلیق کاری میں ''مصنف، متن اور قاری'' تینوں شریک ہوتے ہیں، گویا مصنف یا خالق کی حیثیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ بات کو سمیٹتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں ساختیات اور پس ساختیات کے مفکرین نے جو نظریات پیش کئے ہیں خود ان نظریات کے اندر اک صورت خرابی کی موجود ہے۔ یعنی انہوں نے اپنے تصورات کو خود ہی Deconstruct کردیا ہے۔

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

ناصر عباس نیر (جھنگ)

آپ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ 'تھیوری کی دنیا میں رہنے کے ساتھ اس کے عملی مظاہر کے تناظر میں بھی اس کا جائزہ لیا جائے' آپ کی اس تجویز کا محرک آپ کا یہ خیال ہے کہ تھیوری (ساختیات اور مابعد ساختیات) نہ صرف عالمی سیاسی مقاصد رکھتی ہے بلکہ افغانستان اور عراق پر امریکہ کی فوجی کارروائی کے ذریعے تھیوری کے یہ مقاصد حاصل بھی ہو چکے ہیں۔ گویا ان دو اسلامی ممالک میں جس بہیمیت کا امریکہ نے مظاہرہ کیا ہے اس کی ذمہ داری تھیوری پر ڈالی جاسکتی ہے اس ضمن میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ 'متن اور مصنف کا یکسر انکار کر کے قاری کی اہمیت کو اجاگر کرنا دراصل امریکی حلقوں کی طرف سے بعض مذہبی حلقوں کے خلاف اقدام کرنا ہے۔ کیونکہ اس بنیاد پر تمام آسمانی کتب کے متن اور خالق کی نفی ہو جاتی ہے۔'' معذرت کی ساتھ آپ کے ان خیالات میں اسی قسم کی سنسنی خیزی ہے جو صحافت (زرد صحافت) میں عام ہے اور آپ کے زاویہ نظر پر ترقی پسندوں کے روائتی فارمولے کا سایہ بھی محسوس ہو رہا ہے جو ہر ادبی تھیوری کے ڈانڈے سیاست سے جوڑتے ہیں۔ اداریئے میں آپ نے تھیوری کی صورت حال کو ترقی پسند تحریک کے مماثل ٹھہرایا بھی ہے۔ یہاں بعض وضاحتیں ضروری ہیں۔

میرے لیے یہ بات عظیم انکشاف کا درجہ رکھتی ہے کہ تھیوری کے بل بوتے پر بڑی بڑی جنگیں لڑی جاسکتی ہیں۔ کاش ادبی نظریات اس قدر طاقت ور ہوتے کہ وہ عالمی سیاسی معاملات کا رخ موڑ سکتے اور متعین کر سکتے۔ یہ بات تو مانی جاسکتی ہے کہ جنگ اور بربریت کو جائز ثابت کرنے کے لیے نظریات وضع کیے جاسکتے ہیں مگر تھیوری میں کسی بھی نظریے یا ڈسکورس یا متن کو Deconstruct کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے یعنی تھیوری نظریے یا متن میں مضمر ہر قسم کی حکمت عملیوں کو منکشف کر سکتی ہے۔ فوکو کی ڈسکورس کی تھیوری ہو یا نئی تاریخیت یا نسائی تنقید یا پھر نو مارکسیت اس طرح تھیوری اپنی اصل کی روح سے مقتدر طبقوں کے ساتھ نہیں پامال اور نظر انداز کردہ طبقوں کے ساتھ ہے۔ تھیوری کمزور طبقات کی اس حمایت کے باوجود اگر ان کی حالت زار میں انقلابی تبدیلی نہیں لاسکی تو اس کا باعث فقط یہ ہے کہ تھیوری میں بم کی طرح طاقت نہیں ہوتی کہ فی الفور اور پوری شدت سے ظاہر ہو تھیوری کا تعلق فکری تبدیلی سے ہے جو رفتہ رفتہ رونما ہو رہی ہے۔ اور جہاں تک متن اور مصنف کے انکار کا سوال ہے تو اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ مصنف کا انکار تو کیا گیا ہے متن کا ہرگز نہیں مصنف کا انکار کر کے دراصل متن اور اس کی قرات کو مرکزی رول دیا گیا ہے اور مصنف کے انکار میں بھی کوئی سیاسی ہتھکنڈا مضمر نہیں مصنف کا انکار ایک خاص علمی اور فکری پس منظر میں کیا گیا ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے

کی گنجائش نہیں فقط اتنا عرض ہے کہ مصنف کی موجودگی پر سوالیہ نشان ساختیات نے لگایا۔ ساختیات جس مطالعاتی نہج کی داعی ہے وہ کلیت پسندانہ ہے۔ یہ اس سسٹم کی جستجو کرتی ہے جس کی وجہ سے اور جس کے تحت کوئی مظہر معنی کا حامل ہوتا ہے لہٰذا اصل اہمیت مظہر کے معنی کو نہیں۔ اس کو پیدا کرنے والے نظام کو حاصل ہے۔ معنی تو پراڈکٹ ہے۔ اس زاویے سے فرد بھی ایک پراڈکٹ اور سوشل کنسٹرکشن ہے۔ سوسائٹی کا معنیاتی نظام (Signifying system) افراد اور متون کے ذریعے اپنا اظہار کرتا ہے۔ مصنف بھی لہٰذا خالق کے بجائے اس نظام کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ گویا مصنف ادبی روایت یا شعریات کو خلق نہیں کرتا یہ شعریات مصنف کو وسیلہ بنا کر اپنا اظہار کرتی ہے یہ باتیں ہمارے لیے اصطلاحات کی حد تک نئی ہیں مگر اپنے مطالب کے اعتبار سے اجنبی نہیں ہیں۔ مثلاً ہم سب روایت کو بے حد اہمیت دیتے ہیں اور کسی فن پارے کی قدر کے تعین کے لیے روایت سے استناد کرتے ہیں اسی طرح کسی فن پارے کے معنی کے کھوج میں ہم منشائے مصنف کو بالائے طاق رکھنے کے عادی ہیں۔ غالب کے اشعار کو غالب کے منشا سے ہٹ کر پڑھا جاتا رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے غالب کو بڑا شاعر بھی قرار دیا جاتا رہا ہے کہ اس کے اشعار میں معنی کی کثرت ہے۔ اگر مصنف یا اس کے منشاء کو ملحوظ رکھیں تو فن پارے کی معنی خیزی کا عمل نہایت محدود اور یک رخا ہو جائے گا۔ اس اعتبار سے قرات کے وقت مصنف سے صرف نظر کرنا ہی مناسب ہے۔ مصنف کی نفی قرات کو آزاد اور معنی خیز بنانے کی خاطر کی گئی ہے۔ بایں ہمہ مصنف کی انفرادیت کی نفی ممکن نہیں (تفصیل کا یہ محل نہیں راقم کے اس موضوع پر مقالات ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں) آپ نے مصنف کے انکار کو امریکی حلقوں سے منسوب کیا ہے۔ اس پر حیرت ہوئی ہے۔ مصنف کی موت کا سنسنی خیز اعلان تو فرنسیسی نقاد رولاں بارت نے کیا تھا۔ ساختیات و پس ساختیات کی جنم بھومی بھی فرانس ہے۔ اور فرانس نے عراق پر امریکی حملے کی مخالفت کی تھی۔ اور حق تو یہ ہے کہ غالباً فرانس ایسا ملک ہے جہاں تھیوری کو فروغ مل سکتا ہے (اور ملا ہے) وگرنہ دوسرے ممالک میں اس پر شبہات کا ہی اظہار کیا گیا ہے۔ امریکہ کے فریڈرک جمی سن بھی تھیوری کے نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ باقی آئندہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

حیدر قریشی (ناصر عباس نیر کے جواب میں)

برادرم ناصر عباس نیر اداریے پر ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے تھوڑے سے جذباتی ہو گئے ہیں۔ میں نے ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دنوں میں اس کے مخالفین کی جانب سے کی جانے والی الزام تراشی کی نشاندہی بھی کی ہے اور ساتھ ہی مابعد جدیدیت مباحث کے آغاز کے وقت کی جانے والی الزام تراشی کی ہلکی سی نشاندہی کی ہے۔ بلکہ میں نے بہت سے سخت الفاظ کو دہرانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مثلاً ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے ثقہ نقاد اور دانشور نے تو اسے یہودیوں کی سازش قرار دیا تھا۔ ان مباحث کی ایک سطح یقیناً ادب کی حد تک ہے اور اسے وہیں رکھنا مناسب ہے

لیکن جب پیش آمدہ صورتحال کو ان الزامات کی روشنی میں دیکھا جائے تو پھر ایسے ادبی مباحث کے بارے میں شکوک کا پیدا ہونا فطری بات ہے۔ یہ الزام نائن الیون کے سانحہ سے بہت پہلے کا ہے کہ مصنف کی نفی اور متن کے من چاہے معانی اخذ کرنے سے امریکی دانشوروں کو سہولت ہوگی جو پہلے ہی سے بعض مذہبی عناصر کی بنیاد پرستی کے خلاف ہیں۔ بہت سیدھی سی بات ہے اس تصور کی بنیاد پر آسمانی کتب کے خالق کی نفی ہوتی ہے یوں یہ بات نیطشے کے اعلان کی ہی بازگشت بن جاتی ہے۔ میں نیطشے کے اعلان کا صرف اشارا دے رہا ہوں۔ کھول کر نہیں لکھ رہا۔ سو جب بہت پہلے سے مابعد جدیدیت اور امریکی عزائم کے تعلق سے چند امور کے بارے میں کھل کر شکوک کا اظہار کیا جا رہا تھا اور بعد میں وقت ان کو سچ ہوتا بھی دکھا تا ہے تو کیا ان ہولنا کیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے امریکی دانش سے جوڑ کر دیکھنے کی کاوش کرنا کوئی جرم ہے؟ اگر آپ کے نزدیک یہ زرد صحافت ہے تو میں سوائے شرمندگی کے اظہار کے اور کیا کر سکتا ہوں!

جہاں تک متن کی نفی نہ کرنے کی آپ کی وضاحت کا تعلق ہے، اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ مابعد جدیدیت نے قاری کو جو اہمیت دی ہے اس کے بعد فیض احمد فیض کی ایک نظم اور دھوبی کے بل یا منڈیوں کے بھاؤ میں سے کوئی فی ذاتہ عظیم یا کمتر نہیں رہتا۔ جب صورتحال ایسے مقام تک آ جائے تو پھر متن کی کیا اہمیت رہ گئی؟

ناصر عباس نیر نے ایک جگہ لکھا ہے: **کاش ادبی نظریات اس قدر طاقت ور ہوتے کہ وہ عالمی سیاسی معاملات کا رخ موڑ سکتے اور متعین کر سکتے**۔ میرا خیال ہے کہ بھائی ناصر عباس نیر وقتی غصہ کی روانی میں ایسا لکھ گئے ہیں وگرنہ مغرب والوں کے سارے بڑے انقلابات اور تبدیلیوں کے عقب میں نظریات کی ہی کارفرمائی غالب رہی ہے۔ طولِ کلام سے بچنے کے لئے اپنے اور ناصر عباس نیر صاحب کے مشترکہ ادبی بزرگ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک مختصر سا حوالہ پیش کئے دیتا ہوں۔

''مغرب میں بقائے بہترین کے تصور (نیطشے۔ ناقل) نے نہ صرف افراد بلکہ قوموں کو بھی ''سپر'' بن جانے کی ترغیب دی جس کے نتیجے میں بیسویں صدی کے سپر مین یعنی ہٹلر اور مسولینی اور سٹالن پیدا ہوئے۔ عالمی جنگیں لڑی گئیں جن میں سپر مین کے ساتھ سپر نسل (Super Race) اور سپر قوم (Super nation) کے تصورات کو بھی مہمیز لگی۔ پھر سپر بلاک کا تصور بھی بیدار ہو گیا جیسے امریکی بلاک اور روسی بلاک'' (دستک اس دروازے پر ص ۱۷)

کیا اس تجزیہ سے ظاہر نہیں ہوتا کہ مغرب میں ادبی نظریات اور وہاں کی سیاسی و سماجی تبدیلیوں کا آپس میں کتنا گہرا تعلق ہے؟

اب دیکھئے جنرل تھیوری کا جو تصور پیش کیا گیا ہے بظاہر بڑا خوشنما ہے۔ سارے دنیا کے انسانوں کے لئے ایک ہی تھیوری (حالانکہ مختلف ثقافتی تضادات خود ایسی عالمگیریت کی نفی کرتے ہیں) لیکن اس عالمگیریت کا اقتصادی اور سیاسی شاخسانہ کیا نکلا ہے؟ اس کے لئے ڈبلیو ٹی او کی صورت میں امیر ممالک اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے عزائم کو دیکھ

لیجئے اور اس کے خلاف خود مغربی ممالک کے عوام کا شدید ردعمل بھی دیکھ لیجئے۔ جنرل تھیوری کی عالمگیریت اور ڈبلیو ٹی او کی عالمگیریت میں کوئی اندرونی ربط ہے یا نہیں؟ اس پر غور کر لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔

فرانس سے ساختیاتی تصورات کی ابتدا بے شک ہوئی لیکن یہ سلسلہ امریکی دانشوروں کو ہی راس آیا۔ فرانس میں اس کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں ملی۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے تاریخ کی موت کا اعلان فرانس سے ہوا لیکن یہ بھی امریکی دانشوروں کو راس آیا کہ ان کی اپنی نجات تاریخ سے فرار اختیار کرنے میں تھی۔ امریکہ کی ذہانت کی داد دینی چاہئے کہ وہاں **سیاسی** (لمبی منصوبہ بندی)، **سماجی** (الیکٹرانک میڈیا) اور **ادبی** (یونیورسٹی لیول پر نظریات کا پرچار) ہر سطح پر پہلے سے ہوم ورک کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ Huntington نے ۱۹۹۷ء میں ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' لکھ دی تھی۔ اس پر عملدرآمد آج ہو رہا ہے۔ صرف عمل درآمد ہی نہیں ہو رہا بلکہ Huntington بہ نفسِ نفیس امریکی میڈیا پر آ کر اپنے موقف کو مزید واضح کر رہا ہے۔ چنانچہ حالیہ دنوں میں اس نے بڑے واضح الفاظ میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میرے نزدیک بنیاد پرست مسلمان اور لبرل مسلمان میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ سارے مسلمان ہی ایک جیسے ہیں اور ان کا قلع قمع ہونا چاہئے۔ یہ ان کا ریڈیائی انٹرویو تھا جو امریکی حملوں کے دوران دیا گیا۔ اس لئے آپ امریکی دانشوروں کے ایسے بیانات اور ایسی ترغیبات کو اتنی سادگی سے نہ لیں۔ ان کے اندر تک جانے کی کوشش کریں۔

مابعد جدیدیت کے مثبت ادبی ثمرات کو ضرور سامنے لانا چاہئے، ویسے ہی جیسے ترقی پسند تحریک کے مثبت ثمرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، تاہم جیسے اُس تحریک کے پس پشت سیاسی قوتوں کو مطعون کیا گیا تھا ویسے ہی اس ڈسپلن کے پس پشت مخصوص مقاصد کے تحت کام کرنے والے امریکی ذرائع کے وجود یا عدم وجود پر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر واقعی ایسا کچھ ہے تو اسے سامنے آنا چاہئے، اگر ایسا کچھ نہیں ہے تو غلط فہمی دور ہونی چاہئے۔ اس لئے اس موضوع پر کھل کر گفتگو ہو جانی چاہئے۔ اس پر ناراض نہیں ہونا چاہئے۔

میں امید کرتا ہوں کہ اس موضوع کو کسی کی ذاتی انا یا عناد کا باعث نہیں بنایا جائے گا۔ اور یہ جنل اہلِ علم کسی کیمپ میں ہوں قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ سکہ بند سرکاری دانشوروں سے ہٹ کر ناصر عباس نیر حقیقتاً ہمارے ایک اہم دانشور ہیں۔ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پیش آمدہ صورتحال اور زیر بحث مسئلہ کو ایک بار زاویہ تبدیل کر کے دیکھنے کی کوشش ضرور کریں گے۔

''پس ساختیاتی مباحث میں مصنف پوری طرح مسترد ہوا ہے، تصنیف بھی محض Signifiers کا رقص متصور ہوئی ہے اور قاری کا کام فقط Text کو کھولنا اور بے نقاب کرنا قرار پایا ہے'' **ڈاکٹر وزیر آغا** کے مضمون ''اکیسویں صدی میں میں اردو ادب کے امکانات'' سے اقتباس مطبوعہ **مجلہ** میلینیم اردو کانفرنس ۲۰۰۰ء لندن۔ صفحہ نمبر ۲۲)

پلوشہ مومند (پشاور) / حیدر قریشی (جرمنی)

ماہیے پر مکالمہ

(لوک گیت سے ادبی صنف تک)

(یہ انٹرنیٹ کی دنیا بھی بہت عجیب ہے۔انٹرنیٹ پر پہلے میرا کینیڈا کی ریحانہ احمد سے رابطہ ہوا۔ان کی ادب دوستی کے باعث رابطہ اتنا بڑھا کہ ''جدید ادب'' کے اجراء کا پروگرام بن گیا۔پھران کے ذریعے پشاور کی پلوشہ مومند سے رابطہ ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کرخوشی ہوئی کہ پلوشہ مومند اپنی سوچ کو متحرک رکھتی ہیں اوراس کے لئے اہم ادبی مسائل پر غور کرنے کے ساتھ ان پر سوالات بھی اٹھاتی رہتی ہیں۔ان کی اسی خوبی کے باعث ان کے ساتھ جو خط و کتابت ہوئی وہ یہاں شامل کی جا رہی ہے۔ماہیے کی بحث میں ابھی تک جتنے سوال سامنے آئے تھے،پلوشہ بی بی کا بنیادی سوال ان سب سے مختلف ہے۔اور یہ بڑی بات ہے۔امید ہے یہ سوال و جواب ماہیے سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مزید غور و فکر کا باعث بن سکیں گے۔**حیدر قریشی**)

سلام حیدر صاحب!

سب سے اول تو معذرت قبول کیجئے،میری گزشتہ میل آپ کے لئے زحمت کا باعث ہوئی تھی۔اس پہ میں شرمندہ ہوں۔اردو ادب کے بارے میں بات کرتے ہوئے مجھے یقیناً اردو میں ہی بات کرنی چاہئے تھی۔اس میل میں میں نے جو بات کی تھی اس کا خلاصہ یہ ہے۔

ا۔گو ماہیے کی تیکنیکی باریکیوں سے میں واقف نہیں لیکن اس کے بارے میں میرا گمان یہ ہے لوک ادب کی ایک صنف ہے اور لوک ادب میرے مشاہدے کے مطابق ہر معاشرے میں ہم عصر ادب سے الگ حیثیت رکھتا ہے۔لوک ادب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا مصنف ہونے کا دعویٰ کوئی نہیں کرتا بلکہ جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے اسے ساری کمیونٹی کا مشترکہ اثاثہ اور مشترکہ میراث سمجھا جاتا ہے۔اس ضمن میں،میں نے پشتو کی لوک شاعری کی اصناف کی مثالیں دیں تھیں کہ ان میں شاعری ہوتو رہی ہے لیکن ان کی آتھر شپ کلیم نہیں کی جاتی۔کیونکہ یہی لوک لٹریچر کی اصل سپرٹ ہے۔

۲۔اردو ادب میں لوک شاعری کی کوئی روایت موجود نہیں،اس لئے اردو شاعری میں ایک صنف کی حیثیت سے ماہیے کا تعارف کچھ آرٹیفیشل سی بات لگتی ہے۔

۳۔ماہیا شاید پنجابی لوک شاعری کی صنف ہے اس لئے اس کی خوبصورتی اور نزاکتوں کا احساس وہی لوگ زیادہ کر سکتے ہیں جن کی مادری زبان پنجابی ہے۔ایک پختون کی حیثیت میں،میں ان لوگوں کے احساسات کا احترام تو کر سکتی ہوں لیکن ماہیے کے ساتھ وہ وابستگی محسوس نہیں کرسکتی جو ان کو ہے۔آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔اللہ حافظ **پلوشہ** 28/ستمبر۲۰۰۳ء

پلوشہ بی بی سلام مسنون

آپ کی رومن اردو میں لکھی ای میل ملی۔شکریہ

ا۔آپ کی بات اصولاً درست ہے کہ لوک گیت پورے معاشرے کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں اوران پر کسی کی انفرادی تصنیف کا لیبل نہیں ہوتا۔یہ بھی درست ہے کہ لوک گیت اپنے معاشرے کے مزاج کے عکاس اور ترجمان ہوتے ہیں۔تاہم کسی لوک سرمائے کا تدریجی سفر کرتے ہوئے لوک روایت سے ادبی روایت میں ڈھلنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔اس کے لئے متعدد مثالیں مل سکتی ہیں۔اس وقت جو مثالیں بالکل سامنے ہیں ان میں سب سے پہلے ہندی دوہا کو لے لیجئے۔یہ ہندی کا لوک گیت تھا۔اس کی غنائیت کے جادو نے ممتاز شعراء کو اپنا اسیر بنایا تو دوہا ادبی صنف کے طور پر لکھا جانے لگا۔ہندی سے یہ اردو میں بھی آیا۔اگرچہ اردو میں بعض دوستوں نے کچھ بے خبری کے باعث اور کچھ بسرام پر گرفت کی مہارت نہ ہو پانے کے باعث ہم وزن اشعار کو(یا دو پدوں کو) دوہے کے نام سے لکھا ہے تاہم اس میں شک نہیں کہ ہندی کا یہ لوک گیت اردو میں اپنے اصل چھندوں کے مطابق بہت خوبصورتی سے لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔یہ برصغیر کے اندر کی بالکل سامنے کی مثال ہے کہ لوک گیت ادبی صنف بن گیا ہے۔بلکہ ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ برصغیر کے ہندی گیت بھی تو اصلاً لوک گیت ہی تھے۔صدیوں پہلے یہ صرف گائی جانے والی لوک شاعری تھی اوراس کے شعراء کا کوئی تعین نہ تھا۔آریائی اور دراوڑی تہذیبوں کے ٹکراؤ اور ملاپ سے جنم لینے والی یہ لوک شاعری برصغیر کی شاعری کی ابتدا تھی۔پھر اسی بے نام حوالے سے نام والے حوالے سامنے آنے لگے۔ہندی اور اردو گیت نگاروں کی ایک طویل فہرست بنائی جاسکتی ہے۔اسی طرح ماہیا جو پنجاب کی لوک شاعری تھی ایک عرصہ تک گایا جاتا رہا۔فلمی شاعری نے آ کر جب اس لوک گیت سے استفادہ کیا تو ایک طرح سے لوک شاعری اور ادب کے درمیان رابطے کا کام کر دیا۔ایسا کسی ادبی منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہوا۔

۱۹۳۶ء میں ساڑھے سولہ سال کے ایک لڑکے(ہمت رائے شرما) نے اپنے شہر امرتسر کے ایک ناکام عاشق کے

پنجابی ماہیے گانے سے متاثر ہوکر فلم خاموشی کے لئے اردو میں اسی طرز کو استعمال کرتے ہوئے ماہیے لکھ دیئے۔ پھر ایک لمبے وقفہ کے بعد قمر جلال آبادی، ساحر لدھیانوی اور قتیل شفائی نے بھی اردو فلمی گیتوں میں جان ڈالنے کے لئے ماہیے سے استفادہ کیا۔ فلم سے ہٹ کر اردو ادب میں اس کے تجربے وقفے وقفے سے ہوئے۔ اور دوہے کی طرح یہاں بھی یار لوگوں نے لوک روایت پر غور کئے بغیر اسے برابر مصرعوں میں بانٹ کر ''ماہیوں'' کے ڈھیر لگانے شروع کر دیئے۔ میں نے اور میرے دوستوں نے صرف یہ اصرار کیا ہے کہ اگر یہ لوک شاعری اردو میں جڑیں پکڑ رہی ہے تو اس کی لوک روایت کو برقرار رکھنا چاہئے۔ یہاں ایک اور وضاحت بھی کرتا چلوں کہ اردو کے ساتھ ساتھ بہت سے شعراء کرام ایک عرصہ سے پنجابی میں ماہیے کہہ رہے ہیں۔ پنجابی کے ادبی رسالوں میں ایسے شعرا کے ماہیے میں اپنے بچپن سے پڑھتا آرہا ہوں۔

۲۔ بے شک اپنی محدود عمر کے حساب سے اردو زبان کی اپنی لوک روایت نہیں ہے، لیکن اردو زبان نے جن زبانوں کی آمیزش سے جنم لیا ہے ان کی لوک روایات پر بھی اس کا اتنا ہی حق بنتا ہے جتنا ان کی لفظیات پر حق بن چکا ہے۔ جب عربی اور فارسی سے غزل، اور دوسری شعری اصناف لی جاسکتی ہیں، ہندی سے دوہا اور ہندی گیت لئے جاسکتے ہیں تو اس لحاظ سے پنجابی سے اردو نے جتنا لسانی استفادہ کیا ہے اس کے عین مطابق ماہیے سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا خیال ہے؟

۳۔ بے شک ماہیے کے مزاج کو پنجابی حضرات زیادہ بہتر طور پر پیش کر سکتے ہیں لیکن جب کوئی ادبی تجربہ آگے بڑھتا ہے تو اپنی روایت میں رہتے ہوئے اس میں بہت سے نئے تجربات بھی ہوتے ہیں۔ ان تجربات میں کہیں کچھ ''غلط سا'' بھی سرزد ہوسکتا ہے لیکن مجموعی طور پر اگر اس کے اثرات ادب کے لئے مفید ثابت ہوں تو پھر اس کی ادبی حیثیت خود بخود مستحکم ہوتی جائے گی۔ میں نے اپنے بعض مضامین میں مثالیں دے کر بتایا ہے کہ پنجاب کے بعض شعراء اپنے زعمِ پنجابیت میں کیسے کیسے کمزور اور بے رس ماہیے کہہ رہے ہیں اور ان کے مقابلہ میں مہاراشٹر، بنگال، راجستھان اور بہار کے صوبوں کے شعراء کے ماہیوں میں ماہیے کا بنیادی مزاج نسبتاً زیادہ عمدگی سے آ گیا ہے۔ یہ سارے حوالے میرے مضامین میں چھپ چکے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ ۱۹۹۲ء سے اب تک بمشکل گیارہ سال کے عرصہ میں اردو ماہیا کو تین سو شعراء نے تخلیقی طور پر آزمایا ہے۔ یہ کوئی معمولی پیش رفت نہیں ہے۔ ایسا محض پروپیگنڈے کے زور پر نہیں ہوتا بلکہ کسی زبان میں کسی صنف کی داخلی طلب ہی اس حد تک لاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مختصر شعری اصناف کے جتنے نئے تجربے گزشتہ پچاس سال کے دوران اردو میں ہوئے ہیں، اردو ماہیا اپنی متعدد خصوصیات کی بنا پر ان سارے تجربوں میں سب سے کم عمر ہوکر بھی سب سے زیادہ مقبول ہوا ہے۔ پنجابی ماہیے کی جس خوبصورتی اور نزاکت کا آپ نے حوالہ دیا ہے، میرے مضمون ''ماہیے کا جواز'' میں شامل میرے ماہیوں کو اسی زاویے سے پڑھئے۔۔۔ خدا کرے انہیں پڑھ کر آپ کا دل پسیج جائے۔

بہر حال آپ کے خط نے مجھے لوک اصناف اور ادبی اصناف کے درمیان فرق کے حوالے سے اور ان میں باہمی تعلق کے حوالے سے سوچنے کا موقعہ دیا ہے۔ ابھی تک کی سوچ یہاں تک لائی ہے۔ میں اب غزل کے عربی دور کی بھی کچھ معلومات حاصل کرتا ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ عربی غزل ایک زمانے میں 'اورل' رہی ہے۔ زبانی کلامی بولیں تو لوک کے قریب ہو جاتے ہیں لیکن خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الوقت آپ کے سوال کے تین پہلوؤں کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ اب مزے کی بات تب ہے کہ آپ ماہیے کہنا شروع کر دیں۔ ریحانہ صاحبہ کا شکریہ مجھ پر دہرے طور پر واجب ہو گیا ہے۔۔ ایک تو اس لئے کہ انہوں نے ''جدید ادب'' کی اشاعت کے خواب کو سچ کر دکھایا اور دوسرے اب اس لئے کہ ان کے توسط سے آپ کے ذریعے ماہیے کی بحث میں ایک سنجیدہ اور علمی نکتہ سامنے آیا اور مجھے اس پر غور کرنے کا نہ صرف موقعہ ملا بلکہ مزید تحقیق کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ چونکہ وہ میرے شکریہ کہنے پر مائنڈ کرتی ہیں سو ان کا بھی شکریہ اور آپ کا بھی شکریہ، دونوں شکریے آپ کو پہنچیں۔ اللہ آپ دونوں کو خوش رکھے۔

والسلام

نیک تمناؤں کے ساتھ

حیدر قریشی

۲۸ر ستمبر ۲۰۰۳ء

سلام حیدر صاحب آپ فوک اور نان فوک لٹریچر کے باہمی تعلق کے بارے میں تحقیق شروع کر کے یقیناً ایک بڑا کام کریں گے۔ میری طرف سے اس سلسلے میں پیشگی شکریہ قبول کیجئے۔ آپ کے خط میں ایک دو جملے ایسے تھے جن سے مجھے گمان گزرا کہ گویا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ماہیے کی صنفی حیثیت سے مجھے اختلاف ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ میں صرف یہ نہیں سمجھ پا رہی کہ فوک لٹریچر کی ایک genre نان فوک contemporary لٹریچر میں authership claims کے ساتھ کس طرح شامل ہوسکتی ہے۔ آپ نے ہندی دوہے اور فلموں میں پنجابی ماہیے سے استفادے کی بات لکھی ہے۔ میرے ذہن میں اس سے یہ سوال اٹھے ہیں۔

۱۔ لفظیات اور صوتیات کے حوالے سے اردو ہندی سے زیادہ قربت رکھتی ہے یا پنجابی سے؟

۲۔ اصناف سخن میں اپنی ساخت کے حوالے سے غزل، اور اقسام کے تنوع کے اعتبار سے نظم کو جو حیثیت حاصل ہے اس کو دیکھتے ہوئے لوک شاعری کی primitive قسم کی اصناف کا contemporary literature میں متعارف کروانا کس حد تک درست ہے؟۔ ''ماہیے کے جواز'' میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ کسی بھی ادبی صنف کا آغاز کسی

پلاننگ کے ساتھ نہیں ہوتا۔اس سے مجھے صد فیصد اتفاق ہے۔لیکن یہ معاملہ کسی نئی صنف کے آغاز کا نہیں بلکہ ادب کی ایک قسم کی صنف کوادب کی دوسری قسم میں بطور صنف متعارف کرانے کا ہے۔قصیدے سے غزل کے الگ ہونے اور داستانوں کی روایت کی موجودگی میں ناول اور افسانوں کے لکھے جانے کی مثال آپ نے دی ہے۔اس سلسلے میں بھی میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کہ غزل کے الگ ہوجانے اور ناول اور افسانے لکھنا شروع ہونے کے بعد قصیدوں اور داستانوں کوزیادہ اہمیت ملی یا پھران نئی اصناف کو؟اگرنئی اصناف کوزیادہ اہمیت ملی تو اس کی وجہ کیا تھی؟ کیا ایسانہیں کہ یہ نئی اصناف

intellectually زیادہ ترقی پانے والے ذہن سے مطابقت رکھتی ہیں؟آپ کے خیال میں غزل اور نظم کی موجودگی میں ماہیے کی کیا حیثیت ہے؟اور کتنے فیصد intellectually developed اذہان کے لئے یہ قابلِ قبول ہے؟

۳۔جہاں تک فلمز کا تعلق ہے تو دنیا کے جس خطے میں ہم رہ رہے ہیں وہاں کے مشاہدے کے مطابق تو میری رائے یہی ہے کہ یہاں فلم بین طبقہ دراصل انہیں لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کوفوک لورزیادہ اپیل کرتا ہے۔اسی لئے اگر ساحر جیسے بڑے شعراء ان کے لئے بننے والی اردو فلمز میں ان کی لوک شاعری کی کسی صنف کواستعمال کرتے ہیں تو یہ یقیناً معاشرے کے ایک حصے کی ذہنیت کوان کے بخوبی سمجھ لینے کی دلیل ہے۔فلمی شاعری کے تقاضے الگ ہوتے ہیں۔اس بات کا علم آپ کوبھی بخوبی ہے۔اگرایسا نہ ہوتا قتیل کی بجائے میر، غالب اور اقبال کی شاعری فلم میں زیادہ استعمال ہوتی۔کیا آپ فلمی شاعری کوغیرفلمی شاعری کے ساتھ یکساں درجے کا سمجھتے ہیں؟

ایک اورسوال میں صرف اپنی معلومات کے لئے کرنا چاہ رہی ہوں اور وہ یہ کہ پنجابی زبان میں غزل گوئی کا آغاز کب ہوا ہے اور سب سے بڑا غزل گوشاعر کسے مانا جاتا ہے؟ آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی۔

پلوشہ ۶/اکتوبر۲۰۰۳ء

پلوشہ بی بی سلام مسنون

آپ کے خط کا جواب خاصی تاخیر سے دے رہا ہوں۔ای میلز سے آپ کومیری مجبوریوں اور مصروفیات کا اندازہ ہو چکا ہے اس لئے ان کا ذکر یہاں کرنا مناسب نہیں ہے۔آپ اس تاخیر کی اجازت دے چکی ہیں۔لہٰذا بغیر کسی رسمی تمہید کے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ ایک بنیادی اوراصل سوال کے جواب کے اندر سے محض مزید سوال اٹھاتے چلے جانے سے بات نہیں بنے گی جب تک پہلے سوال کوکسی نتیجے تک نہ پہنچا دیا جائے۔ آپ کا بنیادی سوال یہ تھا کہ لوک شاعری کا کوئی مصنف نہیں ہوتا، یہ پورے معاشرے کی ترجمانی کرتی ہے۔اس لئے کوئی لوک شاعری کیونکرادبی صنف بن سکتی ہے کہ اس میں تو باقاعدہ مصنف ہوتا ہے۔میں نے اس سلسلے میں ہندی دوہا، ہندی گیت دواہم مثالیں دی ہیں

کہ یہ قدیم ہندوستان کے لوک گیت تھے اوراب ہندی اوراردو دونوں زبانوں کے ادب کا اہم حصہ ہیں۔دوہا اور گیت دونوں ادبی طور پر لکھے جارہے ہیں اوران کے شعراء کی ایک طویل فہرست ہے۔اس لئے ہمیں پہلے یہیں رُک کر طے کرنا چاہئے کہ کیا لوک گیت کا ادبی صنف میں ڈھلنا روا ہے یا نہیں ہے؟ یہ ایک اصولی بات طے ہوگی یا رد ہوگی۔رد ہونے کی صورت میں ہمیں اردواور ہندی کے سارے ادبی دوہوں اورادبی گیتوں سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا اور قبول ہوجانے کی صورت میں ماہیے کے ادبی صنف میں ڈھلنے کا ایک اور جواز سامنے آجائے گا۔لہٰذا پہلے اس نکتے پر رُکئے اور اسے واضح کیجئے کہ یہاں تک کیا طے ہوتا ہے۔ یہ آپ کا پیش کردہ بے حد اہم اور بنیادی نکتہ ہے۔

تاہم اس بنیادی نکتے پر اصل توجہ مرکوز رکھنے پر اصرار کے ساتھ میں یہاں آپ کے اٹھائے گئے نئے تین سوالات کے جواب میں بھی اپنی سوچ کے مطابق کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔

۱۔ آپ نے لکھا ہے:”**لفظیات اور صوتیات کے حوالے سے اردو ھندی سے زیادہ قربت رکھتی ھے یا پنجابی سے ؟**“آپ کے ذہن میں کیا بات ہے آپ کھل کر کہتیں تو میں زیادہ وضاحت کرسکتا تاہم جہاں تک میں اس حساب کتاب کی نوعیت سے اندازہ کر پایا ہوں اس کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں کہ جو ہندی بہت زیادہ سنسکرت آمیز ہے اس کے مقابلہ میں اردو زبان ۔۔پنجابی اور سرائیکی سے زیادہ قریب ہے۔اس کی مثال کے لئے صرف ولی دکنی کے دور میں ہی چلے جائیں تو اس دور کی شاعری سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس پر پنجابی اور سرائیکی طرز کی مقامی زبانوں کا کتنا گہرا اثر تھا۔تاہم زبانوں کے معاملہ میں کوئی ایسا نسخہ بنانا مشکل ہے کہ اس میں فلاں زبان اتنے ماشہ،فلاں زبان اتنے تولہ اور فلاں زبان اتنے گرام شامل ہے۔سومختلف اوقات میں ہندوستان کی مختلف مقامی زبانوں کے الفاظ اردو نے اپنے اندر جذب کئے ہیں۔شیرانی صاحب کی تحقیق کے مطابق تو اردو کا مولد ہی پنجاب تھا۔تاہم یہ سب اضافی باتیں ہیں۔میرے نزدیک ان کا آپ کے بنیادی سوال سے کچھ اتنا زیادہ تعلق نہیں ہے۔تاوقتیکہ آپ اس کی خود وضاحت کردیں کہ اس کا یہ تعلق ہے۔

۲۔ آپ کے دوسرے سوال میں بیک وقت دوالگ الگ سوال ہیں۔ایک سوال یا اعتراض یہ کہ:

”ماھیے کے جواز“میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ کسی بھی ادبی صنف کا آغاز کسی پلاننگ کے ساتھ نھیں ھوتا۔اس سے مجھے صد فیصد اتفاق ھے۔لیکن یہ معاملہ کسی نئی صنف کے آغاز کا نھیں بلکہ ادب کی ایک قسم کی صنف کوادب کی دوسری قسم میں بطور صنف متعارف کرانے کا ھے۔

جواباً عرض ہے کہ میرے مضمون ”ماہیے کا جواز“میں بات چل رہی تھی ان معترضین کی جو کہہ رہے تھے کہ ثلاثی اور

ہائیکو وغیرہ سہ مصرعی اصناف کے ہوتے ہوئے ماہیے کا نیا تجربہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔اور اسی تناظر میں ان کو جواب دیا جارہا تھا۔آپ کے سوال کے جواب میں تو بہت ہی سیدھی سی اور آسان سی دو مثالیں دے دی ہیں ہندی دوہے اور ہندی گیت کی جو بڑی کامیابی کے ساتھ لوک شاعری سے ادبی شاعری میں ڈھل گئے۔

آپ کے دوسرے سوال کے اندر کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ داستانوں کے ہوتے ہوئے ناول اور افسانے،اور قصیدے کے ہوتے ہوئے غزل ابھری۔غزل قصیدے سے اور ناول وافسانے داستانوں سے زیادہ مقبول ہوگئے۔۔۔سو وضاحتاً عرض ہے کہ غزل کے قصیدے سے الگ ہونے کے بعد بھی ایک عرصہ تک قصیدے کا بول بالا رہا۔غزل نے حضرت امیر خسرو کے دور سے سفر شروع کیا اور صدیوں پر محیط ایک عرصہ تک قصیدے کے سامنے کسمپرسی کے عالم میں رہی۔یہ تو کئی صدیوں کے بعد غزل نے جا کر طاقت پکڑی تھی۔غزل کے مقبول ہوجانے کے بعد بھی قصیدے کی روایت تب تک مضبوطی کے ساتھ قائم رہی جب تک برصغیر میں بادشاہت رہی۔اس لئے قصیدے کے غائب ہونے میں بادشاہت اور شاہی دربار کے غائب ہونے کی وجہ شامل ہے۔اسی طرح داستان تو بجائے خود ایک افسانوی مجموعہ ہوتی تھی۔جو کئی افسانوں کو الگ الگ بیان کرتی تھی اور پھر سارے افسانوں کو گویا غزل کے اشعار کی طرح پرو لیتی تھی۔یعنی داستان میں بیان کی گئی کہانیاں اپنی الگ اکائی بھی رکھتی تھیں اور پوری داستان کی مالا میں پروئی ہوئی بھی تھیں۔داستانیں بھی درحقیقت لوک گیت کی طرح سنائی جانے والی چیزیں تھیں۔وقت بدلنے کے ساتھ اور مختلف سیاسی وسماجی صورتحال کے اثر انداز ہونے کے نتیجہ میں وہی کہانیوں کی صنف افسانوں کا چولہ پہن کر خالصتاً ادبی چیز بن گئی۔میرا خیال ہے کہ کسی بھی اچھی ادبی صنف کی کسی دوسری اچھی ادبی صنف سے کوئی دشمنی یا مقابلہ بازی نہیں ہوتی۔ہر ایک کا اپنا اپنا دائرۂ کار ہوتا ہے۔اس لئے ماہیے کو کسی صنف کے مدمقابل لانے کا رویہ مناسب نہیں ہے۔اگر اس بنیاد پر بات کی جاتی تو غزل کو اپنی ابتدائی دو تین صدیوں کے بعد ہی مرجانا چاہئے تھا کیونکہ دو تین صدیوں تک تو وہ قصیدے کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔کسی شمار میں ہی نہیں تھی۔

تیسرے سوال میں آپ نے فلمی شاعری اور ادبی شاعری کے معیار اور فرق کا مسئلہ پیش کرتے ہوئے فلمی شاعری کو لوک شاعری سے قریب قرار دیا ہے۔لیکن میرا خیال ہے کہ آپ نے میرے پہلے جواب پر توجہ نہیں کی۔میں نے لکھا تھا:

ماھیا جو پنجاب کی لوک شاعری تھی ایک عرصہ تک گایا جاتا رھا۔فلمی شاعری نے آ کر جب اس لوک گیت سے استفادہ کیا تو ایک طرح سے لوک شاعری اور ادب کے درمیان رابطے کا کام کردیا۔ ایسا کسی ادبی منصوبہ بندی کے تحت نہیں ھوا۔

میں نے فلمی شاعری کو لوک شاعری اور ادب کے درمیان رابطے کی کڑی کے طور پر پیش کیا تھا۔میرے اس جملے پر آپ غور کریں تو آپ کو مزید وہ کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی جو آپ نے فلمی اور لوک شاعری کے حوالے سے لکھا ہے۔تاہم یہیں سے ہم پھر آپ کے اصل اور بنیادی سوال اور اس کے جواب کی طرف لوٹتے ہیں کہ کیا لوک گیت ادبی صنف میں ڈھل سکتا ہے؟اگر ایسا کسی مصنوعی طریقے سے نہیں بلکہ فطری انداز میں ہورہا ہے تو ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے،اب بھی ہوسکتا ہے اور آئندہ بھی ہوسکتا ہے۔

ابھی تک کی ساری گفتگو میں اٹھائے گئے آپ کے سوالوں کے جواب اپنی توفیق اور علم کے مطابق دے دیئے ہیں۔اب میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اس کے بعد جو کچھ لکھنا چاہیں،ایک خط اور سوالنامہ کی صورت میں نہیں بلکہ مضمون کی صورت میں لکھیں۔اس سے آپ کا نکتہ نظر بہتر طور پر کھل کر سامنے آسکے گا اور مجھے بھی آپ کے علمی نکات کو ان کے پورے تناظر میں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

پنجابی غزل کی ابتدا کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے۔اس کے بارے میں اس زمانے میں پڑھا تھا جب ایم اے پنجابی کرنے کا موڈ بنا تھا۔لیکن اب کچھ یاد نہیں ہے۔غزل کے شاعروں میں صوفی فقیر محمد فقیر کی غزل مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ان کے بعض شعر آج بھی یاد ہیں۔

امید ہے آپ اپنی جستجو کے اس سفر کو اب بڑی سطح پر جاری رکھیں گی اور اس سلسلہ میں باقاعدہ مضمون لکھیں گی۔میں آپ کے مضمون کا خیر مقدم کروں گا اور اسے ''جدید ادب'' میں شائع کروں گا۔اللہ آپ کو خوش رکھے۔

والسلام

دعا کے ساتھ

حیدر قریشی ۲۴/اکتوبر ۲۰۰۳ء

''ماہیے کے بارے میں کسی ''نظریہ ضرورت'' کی تلاش مناسب نہیں ہے۔ہاں امکانات پر ضرور غور کیا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر یہ بھی ایک امکانی بات ہے کہ ہائیکو اور ثلاثی کے تجربات اردو میں کسی سہ مصرعی صنف کی داخلی جستجو رہے ہوں لیکن ہائیکو اور ثلاثی ثقافتی سطح پر اردو میں جڑ نہیں پا رہے ہوں تب ماہیے نے چپکے سے اپنے ادبی اور ثقافتی وجود کا اظہار کردیا ہو۔ممکن ہے پنجابی اور اردو کی لسانی قربت اور برصغیر کے ایک بڑے علاقے میں اپنی ثقافتی جڑیں ہونے کے باعث ماہیا دوسری تمام سہ مصرعی اصناف کے مقابلے میں کہیں زیادہ زرخیز ثابت ہو۔''

(اقتباس از مضمون ''ماہیے کی کہانی'' از حیدر قریشی

مطبوعہ دوماہی ''گلبن''، احمد آباد ماہیا نمبر جنوری ۱۹۹۸ء)

نعتیہ ماہیے

یعقوب فردوسی (کوہاٹ)

ملنے کی بشارت ہو
ارضِ مدینہ کی
اک بار زیارت ہو

یہ عرش کا زینہ ہے
مدنی ماہی کا
جو شہر مدینہ ہے

جب خوشبو آتی ہے
روضۂ اقدس کی
مجھے یاد ستاتی ہے

فرمان اپناتے ہیں
ارضِ مدینہ میں
کینے کو مٹاتے ہیں

ہر سمت اُجالے ہیں
مدنی ماہی کے
اَن گنت حوالے ہیں

پنجاب رنگ

اب کب یہ ضروری ہے
سچ کہنا بھی تو
وقتی مجبوری ہے

گاؤں کے پنگھٹ میں
آگ مچے جیسے
گوری کے گونگھٹ میں

جُز فرقت سہتی ہے
کل سے ملنے کو
بے چین سی رہتی ہے

تانبے کا پیسا ہے
تب سے اَب تک تُو
ویسے کا ویسا ہے

نہ رہ سنّاٹے میں
قسم زمانے کی
انسان ہے گھاٹے میں

تابندہ سِتارہ ہوں
قدر کرو میری
میں وقت تمہارا ہوں

امین خیال

(گوجرانوالہ)

تاروں کی ٹولی ہے
چندا سنگ اُن کی
کیا آنکھ مچولی ہے

روٹی نہ روزی ہے
اب بیکاری سے
ہر سُو خودسوزی ہے

آئی جو مری باری
شومئ قسمت کہ
میٹھا بھی ہُوا کھاری

اشجار جلاؤ نہ
یہ انسان نہیں
اِن کو تو گراؤ نہ

دُکھ باہم سہتے ہیں
اچھے ہمسائے
سب مِل کر رہتے ہیں

دُکھ ہر دَم سہتے ہیں
ماں کی دُعاؤں سے
محروم جو رہتے ہیں

امین خیال

اِک بات تو یہ طے ہے
ساری دُنیا میں
انسان اہم شے ہے

سوہنی نے جَل پایا
سسّی کے حصّے
جلتا ہُوا تھل آیا

کب اِن سے جُدا ہُوں میں
لوگ ہیں سب میرے
سب لوگوں کا ہُوں میں

اِک فکر حسیں ہُوں میں
نفرت ہے شَر سے
چاہت کا امیں ہُوں میں

بھُولے کو بھلانا کیا
کر کر یاد اُسے
اب جی کو جلانا کیا

ایٹم ہیں دھماکے ہیں
تیسری دُنیا کے
ہر گھر میں فاقے ہیں

بجلی کا پلک ہووے
اپنے جیسوں کی
نگری ہی الگ ہووے

کب ایسا ویسا ہے
اپنا دُکھ بھی تو
اپنے ہی جیسا ہے

تُجھ بِن جو بیتے گی
گزرے گی لیکن
اچھی نہ گُزرے گی

جاناں تُم آ جانا
نظروں کے رستے
اِس دِل میں سما جانا

کیوں اِتنا ستاتے ہو
روز و شب پیہم
یاد آئے جاتے ہو

حاصل اسلُوب کرو
کرنا ہے کُچھ تو
تالیفِ قلُوب کرو

کیا اِس میں مضائقہ ہے
دودھی بھُٹے کا
اپنا ہی ذائقہ ہے

کب چھوڑا کرتے تھے
گنّے کھیتوں سے
جب توڑا کرتے تھے

تاروں کی پڑیاں ہیں
بیٹیاں یُوں جیسے
آنگن میں چڑیاں ہیں

آدم نہ فرشتہ ہے
رَب کے جیسا ہی
اِک باپ کا رِشتہ ہے

جنت کی چھاں کا ہے
بڑھ کر رِشتوں سے
اِک رِشتہ ماں کا ہے

کیکر کو پھُول پڑے
آج یہ آپ کہاں
اِس جانب بھُول پڑے

ماہیے
ترنم ریاض
(دہلی)

آنکھوں کی چمک روٹھی
یاد میں روتی رہی
ہونٹوں کی گئی سُرخی

گجرا ہے چنبیلی کا
تیرے بغیر لگے
جی کیسے اکیلی کا

دل درد نہ سہہ پائے
جینا بغیر ترے
کوئی آ کے سکھا جائے

تجھے دل میں سمویا ہے
نام ترا لکھ کر
لاکٹ میں پرویا ہے

اک جھلک کو ترسے جی
حال جُدائی کا
اُسے جا کے کہے کوئی

ماہیے: سنجئے گوڑ بولے
(پونہ)

یہ کیسی کہانی ہے
سچ کا محافظ ہی
اب جھوٹ کا بانی ہے

کِس سوچ کا بندہ ہے
علم تو رکھتا ہے
پر عقل کا اندھا ہے

انصاف تو روٹھا ہے
ایسے لگا جیسے
رشوت سے چھوٹا ہے

بھیگی سی پھواروں کا
دل ہے مرا پیاسا
ساون کی بہاروں کا

کیا دن میں ہی خواب آیا
رات تو باقی ہے
خوابوں میں جواب آیا

خوابوں کو چراتے ہو
نیند میں تم آ کر
نیندوں سے جگاتے ہو

چھوڑا ابھی نہیں جاتا
کیسا ترنم ہے
گایا بھی نہیں جاتا

خوش رکّھے خدا تجھ کو
ٹوٹے ہوئے دل سے
دیتا ہوں دعا تجھ کو

دل میں تیری تصویریں
خواب ہے تو ایسا
جس کی نہیں تعبیریں

کیا رنگ دِکھاتی ہے
مار جدائی کی
عاشق کو رلاتی ہے

ماہیے
احمد کمال حشمی
(کانکنارا۔مغربی بنگال)

زخموں پہ نمک رکھ دے
درد لگے پیارا
اس دل میں کسک رکھ دے

کب پیار نہیں کرتا
حسن ہے شرمیلا
اظہار نہیں کرتا

دل ہار کے بیٹھا ہوں
تیری محبت میں
من مار کے بیٹھا ہوں

پردیس میں ہے ساجن
فون، نہ خط ایا
گھبرانے لگا ہے من

ماہیے: ارشاد ہاشمی (جرمنی)

سپنوں میں ہوتے ہیں
جان کے دشمن تو
اپنوں میں ہوتے ہیں

شہروں میں بستے ہیں
سانپ نہیں انساں
انساں کو ڈستے ہیں

غم بھر گیا سینے میں
نشہ عجیب ہوا
اشکوں کو پینے میں

ہم آ گئے گھیرے میں
چھوڑ کے اجیارے
بیٹھے ہیں اندھیرے میں

☆

تقدیر بدلنا ہے
رستہ کھو گئے ہم
منزل کو چلنا ہے

ہو تیری عطا کوئی
وقت بدلنے میں
لگتا ہے پتہ کوئی

جانے پہچانے ہیں
جتنی عمر مری
غم اُتنے پرانے ہیں

منہ موڑ کے مت جانا
دل ہے شیشے کا
یہ توڑ کے مت جانا

ہر قول نبھاؤں گا
اب کے چھٹیوں میں
تیرے پاس میں آؤں گا

ماہیے
گلشن کھنہ (لندن)

ست رنگی دھنک دیکھی
گوری کی آنکھوں
میں ہیروں سی چمک دیکھی

وہ سپنوں میں آتے ہیں
برہا کی راتوں میں
رہ رہ کے رُلاتے ہیں

ساون کے نظارے ہیں
پھول ہیں جتنے بھی
سب تم پہ وارے ہیں

ہے آگ ہواؤں میں
ڈھونڈوں تجھے سجنی
لندن کی فضاؤں میں

خود کو بہلاتے ہیں
لوگ جلائیں دیئے
ہم دل کو جلاتے ہیں

ماہیے: ریحانہ احمد
(کینیڈا)

ساحل پہ مچھیرے ہیں
جان بلکتی ہے
یہ غم مجھے گھیرے ہیں

روتے ہیں، رُلاتے ہیں
ہجر کے موسم میں
بادل جب آتے ہیں

اک بار تو ملنا ہے
زخم میرے دل کا
ترے ہاتھوں سِلنا ہے

ہیرا ہے نہ موتی ہے
اتنا ہی جانوں، وہ
میری آنکھ کی جوتی ہے

سینے میں ہوک اُٹھے
گھر کے بغیچے میں
کوئل جب کُوک اُٹھے

دل جب تیرا بھر جائے
اتنا ہی کہہ دینا
اے کاش تو مر جائے

چڑھ آئی ندیاں ہیں
ہجر کے ہر پَل میں
گُزری کئی صدیاں ہیں

جھولا کوئی جھولے
زلفیں لہرائیں
رُخسار کو لٹ چھولے

کیا چڑھتی پتنگ جائے
ڈور ہلانے سے
چوڑی بھی کھنک جائے

کیوں مجھ کو ستاتے ہو
کون ہے وہ آخر
جسے اپنا بتاتے ہو

ماہیے
مرتضیٰ اشعر (ملتان)

تھے پھول تپائی پر
سائن کرنے ہیں
اشکوں سے جدائی پر

کیوں آس رَکھی برسوں
آئے نہ پردیسی
اب سوکھ گئی سرسوں

دل ڈول گیا اس کا
غصے سے ساجن
کچھ بول گیا اس کا

بجلی تھی کہیں کڑکی
خوف سے کانپ گئی
نازک سی اک لڑکی

قسمت میں سزا تھی جب
مل کے بچھڑنا تھا
کیا نیر بہائیں اب

ماہیے
نذر خلیق (خانپور)

کب اس کو تھا اندازہ
زخم مرے دل کا
اب تک ہے تر و تازہ

وہ عدل کٹہرے تھے
بولنے کو چھوڑیں
سوچوں تک پہرے تھے

سب صدق حوالے ہیں
دور بھی جانا ہے
اور پاؤں میں چھالے ہیں

جس کو دل سے چاہا
اس نے ہمیں دل سے
بالکل ہی بھلا ڈالا

اس حسن کا منظر ہے
عشق سبق سارا
ہم کو بھی ازبر ہے

ماہیے: نمازِ عشق
حیدر قریشی

☆اک ”فجر“ آغاز ہوئی
درد میں ڈوبے ہوئے
اس دِل کی نماز ہوئی
☆پھر بعد زوال ہمیں
”ظہر“ نے بخشی ہے
اُمیدِ کمال ہمیں
☆جب ”عصر“ اشارہ ہوا
سُود میں ڈھلنے لگا
جتنا بھی خسارہ ہوا
☆یوں روشن جان ہوئی
دل میں کہیں جیسے
”مغرب“ کی اذان ہوئی
☆جب وقتِ ”عشاء“ آیا
یاد تری آئی
اور وقت دعا آیا
☆مومن تھا دلِ بد میں
جس نے جگا ڈالا
پھر وقتِ ”تہجد“ میں

کتاب گھر

کتابوں پر تبصرے

تبصرہ نگار: حیدر قریشی

جوگندر پال،ذکر، فکر ، فن

مرتب: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

صفحات: 544 **قیمت:** 300 **روپے**

تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔۹۔اے گولا مارکیٹ۔دریا گنج۔نئی دہلی

ترقی پسند تحریک کے بعد جو افسانہ نگار اور ناول نگار اردو فکشن کی دنیا میں ابھرے ان میں جوگندر پال ایک بہت ہی اہم نام ہے۔ان کے ہاں ادب کی کسی ایک لہر سے لپٹ رہنے کا رجحان نہیں ہے۔وہ ادب کی آتی جاتی تمام لہروں کو دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ان سے لطف اٹھاتے ہیں۔سوچ میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر سوچ اور تخلیق کے سنگم پر ان کی کہانیاں جنم لینے لگتی ہیں۔جوگندر پال نے ترقی پسند روایت کو رد نہیں کیا لیکن اس کی لکیر کے فقیر بھی نہیں بنے۔اسی طرح جدید افسانے کے نام پر انہوں نے نہ تو جدیدیت کی بے راہروی کو قبول کیا اور نہ ہی اس کے مثبت اثرات سے انکار کیا۔اس لحاظ سے ان کے ہاں کسی ایک اندازِ نظر کو تلاش کرنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ان کے افسانوں اور ناولوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ خالصتاً جوگندر پال کے باطن سے رچے ہوئے تخلیق ہوئے ہیں۔ان پر ان کی شخصیت کی ،اور ان کے مخصوص (اور ناقابلِ تقلید حد تک) منفرد اسلوب کی چھاپ گہری ہے۔جوگندر پال کے ہاں کہانیوں کی رنگا رنگی اور موضوعاتی تنوع کے باوجود ان کا اسلوب اتنا منفرد اور بے تکلفانہ ہے کہ اس کی تقلید کرنا ممکن ہی نہیں لگتا۔انہوں نے کہانی لکھنے کا ایسا ڈھنگ نکالا ہے کہ بہت سے لوگ ویسا لکھنے کی خواہش رکھتے ہیں لیکن انہیں مکمل طور پر ادراک ہے کہ ایسا بے ساختہ انداز ان کے ہاں آ ہی نہیں سکتا۔جوگندر پال اپنی اس خوبی سے آشنا ہیں۔اسی لئے اپنے مداح نئے لکھنے والوں کی اس محبت اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت کو مزے لے لے کر دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر ارتضٰی کریم نے جوگندر کی گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک کتاب مرتب کی ہے جس کا نام ہے ''جوگندر پال، ذکر، فکر، فن''۔۵۴۴ صفحات کی اس ضخیم کتاب میں جوگندر پال کے فن کی مختلف جہات کا متعدد زاویوں سے جائزہ لیا گیا ہے۔جوگندر پال کے بارے میں ڈاکٹر ارتضٰی کریم کے دو ابتدائی مضامین کے علاوہ یہ کتاب سات ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔پہلا باب ''ذکر: بقلم خود'' کے تحت جوگندر کے چار اہم مضامین ''شہر آرزو''۔''کتھا یاترا''۔''پل بھر زندگی'' اور ''خود وفاتیہ'' سے مزین ہے۔ان چاروں مضامین سے جوگندر پال کی

ذاتی زندگی روداد سامنے اتی ہے اور ان کے ادبی رویوں کی بنیاد کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔دوسرا باب ''ذکر: آئینہ'' کے تحت جوگندر پال کے فن کی مختلف جہات پر ان ادیبوں کے مضامین سے آراستہ ہے۔دیوندر ستیارتھی، کرشن چندر، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین ، رتن سنگھ، کرشنا پال، عتیق اللہ اور شہزاد منظر۔

کتاب کے تیسرے باب ''فکر: مکالمے'' میں جوگندر پال سے لئے گئے سکریتا پال، رنویر رانگڑہ، سنیل ترویدی اور ارتضٰی کریم کے چار انٹرویوز شامل ہیں۔ان انٹرویوز سے جوگندر پال کی تفہیم کے کئی نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔چوتھا باب ''فکر: مقالے'' کے زیر عنوان ہے۔اس میں جوگندر پال کے چھ تنقیدی و تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ان سے جوگندر پال کی تنقیدی بصیرت اور ان کے تنقیدی معیارات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پانچویں باب ''فن: افسانے/افسانچے'' میں ان کے افسانوں اور افسانچوں کے مختلف مجموعوں پر ان ادباء کے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔وہاب اشرفی، محمد علی صدیقی، قمر رئیس، صبا اکرام، شارب ردولوی، فردوس حیدر، انور سدید، شمیم احمد، وزیر آغا، حامدی کاشمیری، بشر نواز، فہیم اعظمی، اکبر حمیدی، رعنا حیدری، ابوظہیر ربانی، ممتاز احمد خان اور حیدر قریشی۔چھٹے باب ''فن: ناول/ناولٹ'' میں جوگندر پال کے ناولوں اور ناولٹس کے بارے میں ان ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔لطف الرحمٰن، وزیر آغا، عتیق اللہ، شفیق احمد شفیق، انور سدید، حیدر قریشی، پیغام آفاقی، ممتاز احمد خاں اور حمید سہروردی۔آخری اور ساتویں باب ''زبان تنقید'' میں محمود واجد اور مبین مرزا نے جوگندر پال کی کتاب ''بے اصطلاح'' کا جائزہ لیا ہے۔

جوگندر پال کے فن اور ان کی شخصیت کے بارے میں یہ کتاب ایک دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔جوگندر پال پر آنے والے وقت میں جو اہم کام ہوگا اس کے لئے یہ کتاب بہترین گائیڈ ثابت ہوگی۔

یاد خزانہ

مصنف: جمیل زبیری

صفحات: 400 **قیمت:** 125 **روپے**

ناشر: دہلی مکتبہ دانیال۔عبداللہ ہارون روڈ۔کراچی

جمیل زبیری اردو کے معروف سفر نامہ نگار اور افسانہ نگار ہیں۔آپ طویل عرصہ تک ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ریڈیو پاکستان بجائے خود ایک ایسا ادارہ ہے جہاں زندگی کے ہر شعبہ سے وابستہ افراد سے رابطہ رہتا ہے۔جمیل زبیری کی زندگی ادب اور ریڈیو کے دائروں میں پھیلی ہوئی تھی۔ریڈیو نے ان کے لئے مشاہدہ اور افراد کے مطالعہ کے اسباب فراہم کئے۔علمائے کرام اور مذہبی اسکالرز سے لے کر شاعروں، ادیبوں، فنکاروں، صحافیوں، سازندوں، کھلاڑیوں، افسروں، سائنسدانوں، سیاستدانوں، فوجیوں، دانشوروں تک ہزارہا قسم کے لوگوں سے ان کا واسطہ رہا۔کسی سے براہ راست پروگرام کرنے کی وجہ سے کسی کا انٹرویو کرنے کی وجہ سے کسی سے ریڈیو اسٹیشن پر

آمد کی وجہ سے۔ بہت سوں سے ان کا وقتی میل ہوا۔۔۔ بہت ساروں کے ساتھ طویل ساتھ رہا۔اپنی زندگی کی ان ساری یادوں کوانہوں نے ''یادخزانہ'' کے نام سے کتابی صورت میں یکجا کیا ہے۔ان یادوں کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

''میں نے جو کچھ لکھا ہے ایمان داری سے لکھا ہے۔ نہ مبالغے سے کام لیا ہے، نہ جھوٹ سے اور نہ میرا مقصد کسی کی دلآزاری ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ملازمت کے دوران مجھے اس کتاب کے لکھنے کا خیال ہی نہ آیا ورنہ میں ایک ڈائری بنالیتا اور چونکہ پوری کتاب صرف یادداشت پر لکھی ہے اس لئے کچھ واقعات اور کچھ لوگوں کے نام یقیناً رہ گئے ہوں گے جو ایک مجبوری ہے''

''یادخزانہ'' میں بہت سا معلوماتی مواد بھی ملتا ہے۔مثلاً پاکستان کا سب سے پہلا ریڈیو اسٹیشن جو ''سندھ گورنمنٹ براڈکاسٹنگ اسٹیشن'' کے نام سے شروع ہوا، اسے چند محبّ وطن پاکستانیوں نے محض اپنے جذبے اور لگن کے باعث شروع کیا۔۵ اگست ۱۹۴۷ء کو شروع ہونے والے اس ریڈیو اسٹیشن نے ۱۰ اگست کو باقاعدہ نشریات کا آغاز کیا۔۱۴/اگست کو پاکستان کے قیام اور قائداعظم کے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھانے کی کارروائی کا آنکھوں دیکھا حال نشر کیا۔۲۰ اگست کو وائرلیس ایکٹ کے تحت اسے بند کر دیا گیا۔ پھر ریڈیو پاکستان کے مختلف شعبوں کے بارے میں بھی اچھی خاصی معلومات فراہم کی گئی ہے۔تاہم اس کتاب کا بیشتر حصہ ریڈیو اور عام زندگی سے وابستہ دوستوں اور دیگر احباب کی یادوں پر ہی مشتمل ہے۔اس میں اوائل ہی سے پاکستان کے ''طبقۂ اشرافیہ'' کی عوام سے بےتعلقی ظاہر ہوتی ہے۔ایسے لوگوں کا ذکر بھی ہے جو بہت ترقی کر کے بھی سراپا انکسار رہے اور ایسے افراد کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو پوش علاقے میں چلے جانے کے بعد اپنے پرانے گھر کے کورنگی جیسے علاقے کو نہ صرف بھول گئے بلکہ اس سے بھی انکار کر گئے کہ وہ کبھی وہاں رہتے تھے۔جمیل زبیری کی ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت کے مختلف تجربے زندگی کے کئی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہاں جمیل زبیری کا بیان کردہ ایک شگفتہ سا واقعہ پیش ہے:

ریڈیو پاکستان کراچی سے ایک فنکار غالب کی غزل گا رہا تھا۔اس میں غالب کا مصرعہ ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

فنکار اسے یوں گا رہا تھا۔ قیدو حیات و بندو غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔۔۔زیڈ اے بخاری ڈائریکٹر جنرل ریڈیو سن رہے تھے۔انہوں نے فوراً ڈیوٹی آفیسر کو فون کیا۔قیدو حیات و بندو غم، دو کیسے؟ یہ تو چار ہوئے۔ڈیوٹی افسر نیا تھا اس نے کہا حضور ابھی ٹھیک کراتا ہوں۔ ذرا ہی دیر میں فنکار اس مصرعہ کو یوں گا رہا تھا۔

قیدو حیات و بندو غم اصل میں چاروں ایک ہیں

یادخزانہ میں جہاں زندگی کی بہت سی تلخ سچائیاں اور بےرحم حقائق ملتے ہیں وہیں ایسی ہلکی پھلکی شگفتہ باتیں بھی ساتھ ساتھ ملتی ہیں۔انہوں نے اپنی زندگی میں ملنے والے بہت سے لوگوں کو بڑی محبت کے ساتھ یاد کیا

ہے۔انہوں نے برملا اعتراف کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں چار افراد سے مل کر بےحد متاثر ہوئے تھے۔تین امریکی خلا باز نیل آرمسٹرانگ، ایڈون الڈرن اور مائیکل کولنز۔۔۔اور چوتھے پاکستانی سائنسدان پروفیسر عبدالسلام۔وہ پروفیسر عبدالسلام کو نوبل انعام ملنے سے بہت پہلے ملے تھے، اس کے باوجود وہ ان کی شخصیت سے بیحد متاثر اور مرعوب ہوئے۔انہوں نے اس کا اعتراف فخریہ طور پر کیا ہے۔

''یادخزانہ'' کا انداز بیان سادہ ہے۔جمیل زبیری کی سادہ نثر اپنی سادگی میں لفظوں کا جادو تو نہیں جگاتی لیکن ان کے بیان کردہ واقعات میں ایک مٹتے ہوئے عہد کی یادوں کا انوکھا جادو ضرور ہے۔

جست بھر زندگی (خودنوشت) **مصنف: اکبر حمیدی**

اکبر حمیدی ہمہ جہت شاعر اور ادیب ہیں۔شاعری، انشائیہ نگاری، خاکہ نگاری، کالم نگاری، کے مختلف مقامات سے کامیابی سے گزرنے کے بعد انہوں نے حال ہی میں اپنی خودنوشت سوانح ''جست بھر زندگی'' شائع کی ہے۔اس کتاب کے گیارہ ابواب ہیں۔اکبر حمیدی نے گوجرانوالہ کے ایک گاؤں سے شروع ہونے والے اپنی زندگی کے مہ و سال کا ایک گوشوارہ سا اس کتاب میں پیش کر دیا ہے۔اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر حمیدی نے کس ماحول میں آنکھ کھولی، کس طرح پلے بڑھے، تعلیم سے لے کر ملازمتوں تک کے احوال، عزیز و اقارب اور دوستوں، دشمنوں کے حالات۔ادبی زندگی آغاز سے اب تک کس طرح گزری۔غرض اس میں ہمارے ایک عہد کی کئی اہم جھلکیاں اس طرح دکھائی دیتی ہیں کہ ان کے ذریعے سے پورے عہد کے بارے میں واضح تاثر قائم کرنا آسان ہو جاتا ہے۔اکبر حمیدی چونکہ بنیادی طور پر شاعر اور ادیب ہیں اس لئے ان کی زندگی کا یہی رُخ اس کتاب کا سب سے اہم پہلو ہے۔اس زاویے سے اس کتاب کے توسط سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر حمیدی کو بعض غزلیں مکمل طور پر نہ صرف خواب میں ہوئیں بلکہ جاگنے کے بعد وہ غزلیں انہیں پوری یاد بھی رہیں۔اسے یقینی طور پر ان کی وجدانی قوت کا کرشمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔بعض غزلیں بروقت نوٹ نہ کرنے کے باعث بھول بھی گئیں۔

وجدان کے حوالے سے اکبر حمیدی کی زندگی میں ایک درویش کی درویشی کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔اسے اکبر حمیدی کے الفاظ میں دیکھتے ہیں: ''ایک اور درویش ہمارے گاؤں میں آیا۔راتوں کو گلیوں میں پھرتا۔علامہ اقبال کے اشعار بلند آواز میں گاتا پھرتا، اپنے آپ کو وقت کا قلندر کہتا۔گاؤں سے شمال کے قریبی قبرستان میں رہتا تھا بہت خوبصورت آدمی تھا۔پینتیس چالیس سال کا گورا چٹا بھرپور جوان۔کلین شیو، بہت چمکتا دمکتا۔ہم محلے کے نوجوان اس کے گرویدہ ہو گئے۔ایک روز اس نے سعید اختر کو جنوب کا اور مجھے شمال کا گورنر مقرر کیا۔اتفاق دیکھئے کہ سعید اختر سندھ میں جا بسا اور میں شمال میں اسلام آباد۔اس قلندر کے ساتھ ہم محلے کے لڑکے اکثر سردائی پیتے تھے۔''

اکبر حمیدی نے اپنی زندگی کی روداد لکھتے وقت جہاں زندگی کے بہت سے واقعات اور نشیب و فراز کو بیان کیا ہے

وہیں اپنے تاثرات کو بھی خاصی تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔کسی واقعہ کی نسبت سے کوئی تاثر ایک حد تک مناسب رہتا ہے بعض اوقات اس تاثر یا تشریح کی کسی حد تک ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن جب وہ تاثر تقریر یا خطبہ بننے لگے تو اس سے اسکی ادبی قدر و قیمت پر بہرحال فرق پڑتا ہے۔''جست بھر زندگی'' میں یہ مسئلہ بار بار سامنے آتا ہے کہ وہ کسی تاثر یا تصور پر خاصی تفصیلی اور تشریحی گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ممکن ہے اس کا کوئی مثبت رُخ ہو جو سردست میرے علم میں نہیں آ پایا۔اس خامی کے باوجود اس میں شک نہیں کہ بعض مقامات پر اکبر حمیدی کے تاثرات نے ''اقوالِ زرّیں'' کا مقام حاصل کر لیا ہے۔اس کی چند مثالیں کتاب سے پیش کرتا ہوں:

☆☆ زیادہ فرمانبرداری اور صورتحال سے مرعوبیت انسان کی شخصیت کو کمزور کر دیتی ہے۔انسان فرمانبرداری وہاں کرتا ہے جہاں اس کا چارہ نہیں چلتا۔۔۔فرمانبرداری اور چیز ہے، شکرگزاری اور بات۔فرمانبرداری میں اپنی ذات کی نفی ہے اور شکرگزاری میں اپنی ذات اور حیثیت کا اثبات''(ص ۶۱)

☆☆ میرا خیال ہے خواب ہماری نیندوں کے خیال ہیں اور خیال ہماری بیداری کے خواب۔(ص ۵۴)

☆☆ اعتقاد کی پختگی اکثر عقل کی خامی بن جاتی ہے۔(ص ۳۲۸)

مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے ادیبوں کو عموماً دوستوں اور کرمفرماؤں سے اس قسم کی باتیں سننا پڑتی ہیں کہ اگر خود کو ایک دو اصناف تک محدود رکھتے تو زیادہ بہتر تھا۔اس سلسلے میں میرا موقف ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اچھا ادیب اپنی میلانِ طبع کے باعث جن اصناف میں بھی کچھ تخلیق کرتا ہے اس کا ایک کم از کم معیار ضرور دکھائی دے گا۔اور وہ اپنے اس کم از کم معیار سے نیچے جاتا دکھائی نہیں دے گا۔اس کے برعکس کمزور یا برا ادیب ایک ہی صنف میں جان مارتا رہے اس میں بھی وہ کمزور یا برا ہی لکھتا رہے گا۔چونکہ اکبر حمیدی بھی کئی میدانوں میں طبع آزمائی کر چکے ہیں اس لئے انہیں بھی اس اعتراض کا سامنا رہا لیکن انہوں نے اس کا بالواسطہ طور پر بہت عمدہ جواب دیا ہے۔ اس جواب میں ان کی زمینداری ان کے بہت کام آئی ہے۔

''ایک تخلیق کار زمین کی مانند ہے۔بنجر زمین تھوڑا اگلتی رہتی ہیں۔بعض زمینیں کسی ایک فصل کے لئے مخصوص ہو جاتی ہیں ان میں کچھ اور نہیں اگتا۔بعض زمینیں بہت سی فصلوں کے لئے موزوں ہوتی ہیں۔اب کسان کی ہمت ہے کہ وہ کیا کیا کاشت کرتا ہے اور کون کون سی فصلیں اٹھاتا ہے۔مجھے یاد ہے ہماری تحصیل گوجرانوالہ کی زمین چاول، گندم، گنا، کپاس، مکئی، باجرہ، برسیم غرض کئی فصلوں کے لئے موزوں ہے۔۔کچھ ایسا ہی حال زرخیز ذہن تخلیق کار کا ہے''(ص ۲۴۱)

اکبر حمیدی جیسے فعال اور زرخیز تخلیق کار کی یہ خود نوشت سوانح حیات ان کی زندگی کی روداد بھی ہے اور ان کے نظریۂ زندگی اور فن کے عقبی دیاروں کو سمجھنے کے لئے ایک معاون کتاب بھی ہے۔زندگی سے بھری ہوئی یہ کتاب موت کے بارے میں کچھ نہیں کہتی صرف زندگی کی بات کرتی ہے۔مثبت طور پر جینے کی بات کرتی ہے۔

کتاب میلہ　　تعارف نگار: ریحانہ احمد

پیغمبروں کی سرزمین (سفرنامہ)　　یعقوب نظامی

انگلینڈ میں مقیم یعقوب نظامی بنیادی طور پر صحافت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ادبی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔بلکہ یہاں مغربی ممالک میں مقیم بہت سے نمبر دو قسم کے شاعروں اور ادیبوں سے کہیں زیادہ ادبی شعور رکھتے ہیں۔ان کی زیر نظر کتاب ان کے اس سفر کی یادوں پر مشتمل ہے جو انہوں نے بلادِ عربیہ میں کئے تھے۔ان ممالک میں شام، عراق، اسرائیل، فلسطین اور اردن شامل ہیں۔یعقوب نظامی کا اندازِ بیان دلچسپ ہے۔اس سفر کے دوران ان کو جو کچھ پیش آیا اور جو کچھ ان کے محسوسات تھے انہوں نے اس سب کو سلیقے کے ساتھ بیان کیا ہے۔۲۹۶ صفحات کی اس کتاب کو ادارہ نگارشات لاہور نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

دیکھ دھنک پھیل گئی (نظمیں)　　وزیر آغا

نئی اردو نظم کے معتبر شاعروں میں وزیر آغا ایک اہم نام ہیں۔ان کی نظموں کا تازہ مجموعہ ''دیکھ دھنک پھیل گئی'' ہے۔اس میں ۳۵ نظمیں شامل ہیں۔وزیر آغا کی نظموں کے پہلے مجموعوں کو سامنے رکھ کر اس مجموعے کی نظموں کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔جدید نظم سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اس مجموعہ میں گہری دلچسپی لیں گے۔ انتساب ''فاختہ کے نام'' کیا گیا ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت عالمی امن کو جو خطرات لاحق ہیں، وہ ان کے لئے کتنی تشویش رکھتے ہیں۔نظم ''کبھی آسماں ایک صحرا تھا'' ان کی اسی تشویش کے اظہار اور دکھ کے بیان کی کیفیات کی ایک نمائندہ مثال ہے۔۸۰ صفحات پر مشتمل نظموں کا یہ مجموعہ سادگی اور سلیقے کے ساتھ ادارہ کاغذی پیرہن لاہور نے شائع کیا ہے۔

نئے موسموں کا پہلا دن (شعری مجموعہ)　　شاعر: سعید روشن

سعید روشن راجستھان (انڈیا) کے رہنے والے ہیں۔اب کویت میں مقیم ہیں۔''نئے موسموں کا پہلا دن'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو سعد پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا ہے۔کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر شاہد میر نے لکھا ہے۔پہلا مجموعہ ہونے کے حوالے سے اس میں ان امکانات کو دیکھا جا سکتا ہے جو ان کے آنے والے مجموعوں میں ملیں گے۔یہ مجموعہ ایک ایک حمد اور نعت، ۹ نظموں اور ۸۰ غزلیات پر مشتمل ہے اور اس سے سعید روشن کی شعری صلاحیتوں کے تیور اور انداز سامنے آتے ہیں۔امید ہے سعید روشن کے آنے والے شعری مجموعے ان کی شعری پیش رفت اور پیش قدمی کے غماز ہوں گے۔

غالبیات پر تین یادگار تقریریں   مرتب:سنجئے گوڑ بولے

۹۔۱۰؍اگست ۱۹۹۷ء کو پونہ میں غالب سیمینار ہوا تھا۔اس میں غالب پر متعدد مقالات پڑھے گئے۔تقاریر کی گئیں۔سنجئے گوڑ بولے نے اس سیمینار کی تین تقریروں کو منتخب کیا ہے اور انہیں کتابی صورت میں محفوظ کر دیا ہے۔علی سردار جعفری(''بنارس سے متعلق غالب کا نظریہ چراغِ دیر کی روشنی میں'')،کالی داس گپتا رضا(''چراغِ دیر میں بنارس کا بیان'')اور ڈاکٹر خلیق انجم(''غالب کے خطوط اور ان کی ادبی اہمیت'') کی یہ تقاریر آڈیو کیسٹ سے تحریری صورت میں محفوظ کی گئی ہیں۔غالبیات کے حوالے سے ان تقاریر کی ایک اہمیت بنتی ہے۔۷۶ صفحات کی یہ کتاب اسباق پبلی کیشنز پونہ نے اہتمام کے ساتھ شائع کی ہے۔

اندھا کنواں(ڈرامے)   مصنف: رشید نیروا

ماریشس میں اردو زبان کو تھوڑی بہت سرکاری سرپرستی حاصل ہے اس لئے وہاں اردو کے بہی خواہوں کے لئے اردو کے فروغ کے لئے کام کرنے میں کچھ آسانیاں ہو جاتی ہیں۔درسگاہوں میں اردو کی تدریس کے ساتھ ادبی طور پر اردو سے دلچسپی قائم رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں کے علاوہ تقریب کی ایک صورت اسٹیج ڈرامہ بھی ہے۔اس سلسلہ میں رشید نیروا وہاں کے ڈرامہ نگار کے طور پر خاصے نمایاں ہیں۔ان کے تحریر کردہ متعدد ڈرامے وہاں اسٹیج کئے جا چکے ہیں۔ان میں سے پندرہ ڈراموں کو انہوں نے کتابی صورت میں ترتیب دیا ہے۔یہ سارے ڈرامے یک بابی ہیں۔رشید نیروا اردو میں مقامی زبان کے بعض الفاظ کی آمیزش سے خود کو اپنے ناظرین کے بہت قریب کر لیتے ہیں۔۲۶۴ صفحات کی یہ خوبصورت کتاب ذی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ موریشس نے بہت اچھے طریقے سے شائع کی ہے۔

باغوں میں بہار آئی(ماہیے کا انتخاب)   مرتب: ارشد اقبال آرشؔ

ارشد اقبال آرشؔ اٹلی میں مقیم ہیں اور اپنی ہمت کے مطابق اردو کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔زیرِ نظر کتاب ان کا ترتیب دیا ہوا ماہیے کا انتخاب ہے۔اس میں ۱۰۳ ماہیا نگاروں کے ماہیے شامل کئے گئے ہیں۔ہر ماہیا نگار کا تعارف بھی ساتھ دیا گیا ہے۔ارشد اقبال آرش نے بلاشبہ اسے مرتب کرنے میں بہت محنت کی ہے لیکن کتابت کی اتنی زیادہ غلطیاں ہیں کہ کتاب اتنی اہم ہونے کے باوجود اپنا وہ تاثر قائم نہیں کر پاتی جو حقیقتاً قائم ہونا چاہئے تھا۔اگر پروف ریڈنگ میں احتیاط کی جاتی تو اس انتخاب کا تاثر بہت زیادہ بنتا۔۱۹۸ صفحات کی اس کتاب کو عالمی تحریک فروغ ادب وثقافت اٹلی نے اچھے گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

یادوں کی بارش(ماہیے)   ماہیا نگار:ناصر نظامی

ہالینڈ میں قیام پذیر ناصر نظامی اردو ماہیا نگاروں میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے ماہیوں کا مجموعہ''یادوں کی بارش''اردو ماہیے کی نظم ونثر میں اب تک کا سب سے ضخیم مجموعہ ہے۔۵۲۸ صفحات پر مشتمل''یادوں کی بارش'' حقیقتاً اردو ماہیے کی موسلا دھار بارش ہے۔ناصر نظامی نے ہر طرح کے اور تقریباً ہر موضوع پر ماہیے لکھے ہیں اور بے تحاشہ لکھے ہیں۔ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ گیت نگاری کرتے ہیں۔ان کے گیتوں کی آڈیو کیسٹس اور سی ڈی بھی جاری ہو چکی ہیں۔اسی لئے ان کے ماہیے کسی عروضی گھیرے سے زیادہ ماہیے کی لے کی پابندی کرتے ہیں۔ماہیوں کا یہ ضخیم اور خوبصورت مجموعہ نظامیہ آرٹ اکیڈمی ایمسٹرڈیم ہالینڈ کے زیر اہتمام شائع کیا گیا ہے۔

ذرا انتظار کر(غزلیں)   شاعر:فراغ روہوی

فراغ روہوی مغربی بنگال میں مقیم اردو کے معروف شاعر ہیں۔ان کے ماہیوں کا مجموعہ''چھیاں چھیاں'' شائع ہو چکا ہے۔کلکتہ سے''ترکش'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ بھی جاری کر رکھا ہے۔اب ان کی غزلوں کا مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔اس میں ایک حمد،ایک نعت اور ایک دعائیہ''حرفِ دعا''اور ۱۰۸ غزلیں شامل ہیں۔ویسے حمد،نعت اور دعائیہ کا لہجہ بھی غزلیہ ہے۔سید حسن نے''صاحبِ کتاب'' کے عنوان سے فراغ روہوی کا انوکھے انداز میں تعارف کرایا ہے۔''ذرا انتظار کر'' کی غزلیں فراغ روہوی کی غزل کے انداز کو مناسب طور پر اجاگر کرتی ہیں۔۱۶۰ صفحات کی اس کتاب کو گلستاں پبلی کیشنز کلکتہ نے خوبصورت طریقے سے شائع کیا ہے۔

ایک شام کا قصہ(افسانے)   مصنف: سلطان جمیل نسیم

بیک وقت کراچی اور کینیڈا میں مقیم سلطان جمیل نسیم اردو کے معروف اور ممتاز افسانہ نگار ہیں۔''ایک شام کا قصہ''ان کے 14 افسانوں پر مشتمل ہے۔ان افسانوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب کراچی اور حیدرآباد کے فسادات کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔اس سلسلے میں سلطان جمیل نسیم لکھتے ہیں:

''وہ عرصہ جو''ایک شام کا قصہ'' کے افسانوں میں سمٹا ہوا ہے وطنِ عزیز کے میرے دو شہروں،کراچی اور حیدرآباد کے لئے بالخصوص اور میرے صوبے سندھ کے لئے بالعموم کرب اور ابتلا کا عرصہ تھا۔دہشت گردی حکومت کی جانب سے ہو،سیاسی جماعتوں،مذہبی تنظیموں،لسانی گروہوں یا علاقائی تحریکوں کی طرف سے،اس کا اجتماعی اثر پوری قوم اور ملک پر ہوتا ہے۔''

اس زاویے سے سلطان جمیل نسیم کا یہ افسانوی مجموعہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر صدیق شبلی (اسلام آباد)

اپنا گریباں چاک

اپنا گریباں چاک' اردو میں شائع ہونے والی شاید پہلی باتصویر خودنوشت ہے۔ اسے باتصویر کہنے سے بھی حق ادا نہیں ہوتا کیونکہ باتصویر کتابوں میں کہیں کہیں کوئی فوٹوگراف بھی آجاتا ہے۔ لیکن اس کتاب میں جس اہتمام کے ساتھ تصاویر شامل کی گئی ہیں اس کے پیشِ نظر اسے ڈاکٹر جاوید اقبال کی تحریری و تصویری خودنوشت سوانح عمری کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کتاب کل تیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ اور خودکلامی ان کے علاوہ ہیں۔ کتاب کے آخر میں سو سے زیادہ تصاویر یکجا کر دی گئی ہیں اور انہیں زمانی عتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ تصویریں ڈاکٹر صاحب کی جسمانی و ذہنی نشوونما کے ساتھ ساتھ ان کے اشواق واذواق پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جس انداز سے سوانح عمری میں خود کو پیش کرنا چاہتے تھے وہ ان تصویروں کو شامل کیے بغیر ممکن نہیں تھا اس لیے کتاب کے اس حصے کو اس کا چودھواں باب کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اردو شاعری میں دامن و گریبان کا چاک ہونا معمول کی بات ہے اور یہ اکثر چاک ہوتے رہتے ہیں لیکن کسی سوانح عمری میں یہ اتفاق شاید پہلی بار ہوا ہے۔

؎ پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے

مرزا غالب اس عمل کو حالات کے جبر کے خلاف ردعمل قرار دیتے ہیں، وضع احتیاط سے ان کا دم رکنے لگتا ہے تو انہیں گریبان چاک کرنے کا خیال آتا ہے۔ دوسری طرف علامہ اقبال اپنی فعالیت اور اپنے جنون کی ہمہ گیری میں اپنے گریبان کے ساتھ ساتھ دامنِ یزداں چاک کرنے کا بھی حوصلہ رکھتے ہیں لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال صرف اپنے گریبان تک محدود رہے ہیں۔ ''اپنا گریبان چاک'' کسی سوانح عمری کے لیے خاصا چونکا دینے والا عنوان ہے اور یہ قاری کی بہت سی توقعات کو جگاتا ہے۔ مگر اس کتاب میں سنسنی خیز انکشافات ہیں نہ عبرت انگیز اعترافات، معمولی نوعیت کے چند بے ضرر اور معصوم سے اعترافات کی طرف اشاروں سے قاری نہیں چونکتا، اپنا گریباں چاک کرتے ہوئے بھی مصنف نے وضع احتیاط کی پاس داری کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ اردو میں خودنوشت سوانح عمری کی روایت اس لیے پروان نہیں چڑھی کیوں کہ یہاں خوئے غلامی میں پختہ لوگوں میں خاکساری اور فدویت بہت زیادہ ہے اور یہ صنف خودنمائی کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لیے یہ خاکساروں اور فدویوں کے بس کا روگ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خیال سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے کیوں کہ خودنوشت کے محرکات میں خودنمائی تنہا محرک نہیں ہے۔ اردو کا دامن آپ بیتیوں بلکہ ایسی آپ بیتیوں سے خالی نہیں ہے جن میں خودنمائی اور خود عظمتی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ جوش صاحب نے ''یادوں کی بارات'' میں اپنی خاندانی وجاہت کا خوب خوب ڈھنڈورا پیٹا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے سوانحی ناول ''کار جہاں دراز ہے'' میں اپنے خاندان کی تجلیل میں سارا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ اور اس کے لیے خاندان سے باہر کی بعض شخصیتوں کی تضحیک سے بھی دریغ نہیں کیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کو خودنمائی اور خودستائی کی ضرورت پڑی اور نہ انہوں نے اس کی کوشش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اعزازات و کمالات کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن شہرت کی ان بلندیوں پر پہنچ کر اپنی عظمت کا صور نہیں پھونکا۔ ڈاکٹر صاحب نے ادب کا مطالعہ بھی کیا اور وہ ادب کی تخلیق میں بھی مصروف رہے ہیں۔ اس زمانے میں ان کی توجہ ڈرامہ نگاری کی طرف رہی لیکن وہ صرف ادیب نہیں ہیں۔ انہیں نظری و عملی سیاست سے دلچسپی ہے۔ وہ قانون کے پیشے سے کئی حیثیتوں سے وابستہ رہے ہیں۔ فلسفہ ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ اقبالیات بھی بوجوہ ان کا ایک اہم موضوع مطالعہ ہے۔ ان سب کی جھلک ان کی آپ بیتی میں موجود ہے۔ انہوں نے آپ بیتی کے حدود کو بڑی وسعت بخشی ہے،

لیکن اس سے ان کی خودنوشت کی گرانباری میں اضافہ ہوا ہے کیونکہ آپ بیتی علمی مباحث کی عموماً متحمل نہیں ہو سکتی۔ مصنف نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ مختلف ممالک میں ہونے والی کانفرنسوں' کانگرسوں' سیمیناروں اور اجلاسوں میں صرف کیا ہے۔ کوئی سال شاید ہی ایسا ہو جس میں وہ بیرونی سفر پر نہ گئے ہوں۔ انہوں نے تو ایک سال میں چار چار ممالک میں پاکستان کی نمائندگی کی ہے۔ بین الاقوامی قوانین، انسانی حقوق، اسلام، اسلامی دنیا اور اسے درپیش مسائل اور اقبالیات کے موضوعات پر انہیں لیکچر دینے یا مقالہ پیش کرنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان اجلاسوں میں اپنے بحرِ علمی اور بلند پایہ افکار سے حاضرین کو متاثر کیا اور انہیں بین الاقوامی سطح پر بڑی پزیرائی ملی۔ اسطرح انہوں نے پاکستان کے غیر رسمی ثقافتی سفیر کے طور پر ملک کا نام روشن کیا لیکن جب حکومت نے یہ عہدہ باضابطہ طور پر پیش کیا تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے معذرت کر لی اس کے باوجود وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے ہیں البتہ اب انہیں بڑھاپے اور کمزور صحت کا احساس ہونے لگا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کو سیاحت کا شوق شروع سے رہا۔ نئی گاڑیوں کی خریداری بھی ان کے اسی شوق کی مظہر ہے۔ ان کے پائے کا جہاں گرد پاکستان میں شاید ہی ملے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں پانچ سال انگلستان میں مقیم

رہے۔انہوں نے اسی دوران یورپ کے اکثر مما لک کی سیر کی۔اس کے بعد کانفرنسوں میں شرکت کے لیے انہوں نے طویل مسافتیں طے کیں۔انہوں نے بے شمار سفر کیے لیکن سفر نامہ لکھنے کی طرف توجہ نہیں دی۔آپ بیتی میں ان سفروں کی روداد بڑے سرسری انداز میں بیان کی ہے۔

علامہ اقبال قرطبہ گئے۔انہوں نے مسجدِ قرطبہ دیکھی اور اپنے احساسات و تاثرات کو مسجدِ قرطبہ جیسی لازوال نظم کی صورت میں پیش کر دیا۔کلامِ اقبال کے عربی مترجم اور پاکستان میں مصر کے ایک سابق سفیر ڈاکٹر عزام بے نے ایک جگہ لکھا ہے۔''علامہ اقبال کا مسجدِ قرطبہ میں جانا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔عالمِ اسلام کو ایک ایسے شاعر کا انتظار ہے جو مسجدِ قرطبہ میں اقبال کے دل و دماغ کی جملہ کیفیتوں کو اپنے توانا تخیل کی مدد سے گرفت میں لا کر ایک شاہکار تخلیق کرے۔''اقبال کی پیروی میں ڈاکٹر جاوید اقبال کو قرطبہ جانے کا اتفاق ہوا لیکن انہوں نے مسجد میں اپنی حاضری کی کیفیت کو آپ بیتی میں چند سطروں میں نبٹا دیا۔قونیہ میں مولانا روم کے مزار کی زیارت کا ذکر بھی ایسے ہی کیا گیا ہے،ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو بیانیہ سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ان کے اصل جوہر تجزیے میں کھلتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اقتدار کے ایوانوں کے ہمیشہ مہمانِ عزیز رہے ہیں۔اکثر اہم موقعوں پر انہیں وہاں مدعو کیا جاتا رہا ہے۔حکومت سول ہو یا فوجی،مسلم لیگ کی ہو یا پیپلز پارٹی کی،سب نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی قدر افزائی کی اور ان کی دلداری کی کوشش کی۔انہیں سرکاری تقریبات میں عزت دی،حکومتی وفود میں مندوب کی حیثیت سے شامل کیا۔ڈاکٹر صاحب نے عملی زندگی کا آغاز وکالت سے کیا۔وہ قانون کی تدریس بھی کرتے رہے۔لاہور ہائی کورٹ کے جج اور اسی اعلیٰ عدالت کے چیف جسٹس بھی مقرر ہوئے اور سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔انہوں نے آپ بیتی میں عدالتی نظام اور اس کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔وہ اپنی عدالتی خدمات سے بڑی حد تک مطمئن نظر آتے ہیں۔

جاوید اقبال سیاست کے ذریعے قوم کی خدمت کا عزم لے کر عملی زندگی میں آئے تھے لیکن اس میں انہیں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی،اگرچہ ان کے زائچہ ساز منجم نے ان کے کسی ریاست کے وزیرِ اعظم ہونے کی پیش گوئی کی تھی لیکن ان کا نام صرف ایک بار نگران وزیرِ اعظم کے عہدے پر صرف زیرِ غور آیا اور وہ اس منصب پر فائز نہیں ہو سکے البتہ وہ سینیٹ کے رکن ضرور منتخب ہوئے لیکن پارٹی پالیٹکس کی وجہ سے وہ سیاست میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کر سکے۔انہیں اس بات کا افسوس ہے کہ ان کے مشوروں کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھا گیا۔دراصل جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ ماحول میں ہمارے ہاں وہ سیاسی کلچر ہی فروغ نہیں پا سکا جس میں کوئی ذہین اور پڑھا لکھا شخص اپنا مقام بنا سکے۔سیاست کے معاملے میں جاوید اقبال دل گیر ہی رہے۔

ڈاکٹر صاحب کو دکھ ہے کہ ساری دنیا میں وہ اپنی ذات کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔لیکن پاکستان میں فرزند

ِ اقبال کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔وہ کہتے ہیں لڑکپن میں اس نسبت اور اس کی اہمیت کا احساس نہیں تھا،جوانی میں وہ اپنے پدرم سلطان کے جذبے سے قبول کرتے رہے لیکن اب وہ صرف اس حوالے کے ذریعے پہچانے جانے پر آمادہ نہیں ہیں وہ اپنی شناخت اپنے حوالے سے چاہتے ہیں۔

ارادت مندوں کا کہنا ہے کہ جہاں اس صورتِ حال کو انہوں نے اتنی مدت تک گوارہ کیا ہے تو اب اس کے خلاف ردِ عمل کی کیا ضرورت تھی ،وہ جاوید اقبال کے سلسلے میں اقبال کی محبت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں،لیکن یہ معاملہ اتنا سادہ بھی نہیں ہے۔یہ ایک جینئس کا ذاتی مسئلہ ہے اور وہی اس کا احساس کر سکتا ہے۔عام لوگ تو اس مسئلے اور اس کی نزاکت کا شاید ہی ادراک کر سکتے ہوں۔ایک شخص جس کے مقام و مرتبے کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا ہو اور جسے خودی کا درس ورثے میں ملا ہو وہ اپنی خودی سے دستبردار ہو کر صرف فرزندِ اقبال ہونے پر کیسے راضی ہو سکتا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ میں نے اقبال جیسے تناور درخت کے سائے سے نکل کر اپنا مقام بنانے کی کوشش کی ہے۔ہر عظیم شخصیت کی اولاد اس مسئلے سے دوچار ہوتی ہے لیکن اس اعلان واظہار کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

علامہ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک آزاد وطن کے حصول اور یہاں ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کے لیے ذہنی طور تیار کیا۔جدو جہد کا دور جوش و خروش کا زمانہ ہوتا ہے۔اس میں بعض مسائل کی سنگینی کا احساس نہیں ہوتا،جب یہ دور ختم ہو جاتا ہے تو اصل مسائل اپنی پوری شدت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے آپ بیتی میں جو باب ''دوسرے خط'' کے عنوان سے لکھا ہے اس میں فکرِ اقبال کے حوالے سے بعض ایسے مسائل اور انکے مضمرات پر دوبارہ نظر ڈالی ہے اور نئی صورتِ حال میں ان کا تجزیہ کیا ہے۔ان میں دو قومی نظریہ،اسلامی ریاست،اس کا سیاسی اور قانونی ڈھانچہ اور اس میں نفاذِ اسلام،اجتہاد،اسلامی جمہوریت اور روحانی جمہوریت جیسے موضوعات شامل ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے بعض ذہنی تحفظات کا اظہار بھی کیا ہے۔بعض ارادت مندوں نے اسے اقبال سے ڈاکٹر جاوید اقبال کے اختلاف پر محمول کیا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے یہ سوال اٹھا کر دعوتِ فکر دی ہے۔انہوں نے اپنی توضیحات کے ذریعے علامہ اقبال کے نقطہء نظر کو تقویت پہنچائی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اندھی عقیدت بھی تفہیمِ اقبال کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے اس لیے دیدن دیگر آموز کی ضرورت ہے۔

''اپنا گریبان چاک'' ایک منفرد نوعیت کی خودنوشت ہے۔یہ دلچسپ سے زیادہ فکر انگیز ہے۔یہ ہمارے فکری رویوں اور ارادتوں کے بارے کئی معنی خیز سوال اٹھاتی ہے۔ڈاکٹر صاحب نے لوگوں کی ناراضگی کا خطرہ مول لے کر بھی وہ بات کہنے کی کوشش کی ہے جسے وہ حق سمجھتے ہیں۔اردو میں ایسی سوانح عمری کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد (بھاولپور)

’’ہر قدم روشنی‘‘......ایک جائزہ

ادباء و شعراء میں سے جتنے لوگوں کو حج کی سعادت ملتی ہے اُن میں سے دس پندرہ فیصد لوگ سفر نامہ حج ضرور لکھتے ہیں۔ ان سفر نامہ ہائے حج میں سے ہر سفر نامہ نگار اپنے مزاج اور اپنی دلچسپی کے مطابق سفر نامہ لکھتا ہے۔ کسی کی توجہ جغرافیائی معلومات پر ہوتی ہے اور کسی کی تاریخی واقعات و حالات پر۔ کسی سفر نامے میں حج کے فرائض اور واجبات کو اہمیت دی جاتی ہے اور کسی سفر نامے میں خود سفر نامہ نگار اہم ہو جاتا ہے جبکہ ’’ہر قدم روشنی‘‘ ایک ایسا سفر نامہ ہائے حج ہے جس کا ایک ایک لفظ عقیدت اور محبتِ خدا اور سول میں ڈوبا ہوا ہے۔

’’ہر قدم روشنی‘‘ ہمارے بزرگ دوست خورشید احمد ناظر کا لکھا ہوا سفر نامہ ہے۔ خورشید صاحب 1998ء میں حج پر گئے تھے اور غالباً یہاں سے روانہ ہوتے ہوئے بھی اُن کے ذہن میں سفر نامہ لکھنے کا خیال موجود تھا۔ میں سمجھتا ہوں اور کوئی سفر نامہ لکھا جائے یا نہ لکھا جائے لیکن سفر نامہ حج وقتاً فوقتاً لکھے جاتے رہنے چاہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ اگر اِس طرح کے سفر نامے ہمارے سامنے موجود ہوں تو ہم سرزمینِ حجاز خاص طور پر مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کی بدلتی ہوئی کیفیات سے روشناس ہو سکتے ہیں۔ مثلاً میں ایک دو چیزوں کی طرف بطور خاص توجہ مبذول کرانا چاہوں گا خورشید احمد ناظر صاحب نے اپنے سفر نامے کے صفحہ نمبر 29 پر لکھا ہے۔

’’ان معلومات اور مطالعے نے مجھے یہ فیصلہ کرنے میں مدد دی تھی کہ میں حج، ریگولر سکیم کی بجائے سپانسر شپ سکیم کے تحت کروں اور رہائش کے لیے سرکار کے انتظام کے انتخاب کی بجائے اپنی رہائش کیلئے نجی طور پر انتظام کروں‘‘

ظاہر ہے کہ اُس وقت یہ بات ممکن تھی لیکن اب 2003ء کے انتظاماتِ حج میں یہ بات ممکن نہیں رہی تھی۔ اِس لیے کہ اس بار جتنے لوگوں نے سپانسر شپ سکیم کے تحت درخواستیں دی تھیں وہ سب مسترد ہو گئیں اور ہزاروں لوگ فریضۂ حج کی سعادت سے محروم ہو گئے، اِسی طرح خورشید ناظر نے صاحب اپنے ساتھ ادویات لے جانے کا ذکر بھی کیا ہے۔ اُن کا جملہ ہے۔

’’ہنگامی صورتِ حال کے لیے میں نے کچھ ادویات اپنے ساتھ رکھ لی تھیں‘‘

(2) ص 53,52

لیکن اب حجاج کو ڈاکٹر کے نسخے کے بغیر کوئی دوا ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی بلکہ نسخے کے مطابق ادویات بھی حاجی کیمپ کے ڈاکٹر سے سیل بند کرانا پڑتی تھیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے، صورتِ حال میں بھی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں مثلاً ایک زمانہ تھا جب خانہ کعبہ میں ’’بابِ فہد‘‘ نہیں تھا۔ اِسی طرح مدینہ منورہ میں مسجد نبوی آج کے مقابلے میں بہت چھوٹی مسجد تھی جبکہ آج آنحضرتؐ کے زمانے کا سارا مدینہ مسجد نبوی میں سما گیا ہے۔ اِس بات کو واضح کرنے کے لیے ایک مثال اور بھی دی جا سکتی ہے اور وہ یوں کہ ایک زمانہ تھا کہ جب مسجد نبوی میں آبِ زم زم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہوگا لیکن آج مسجدِ نبوی کا ہر حصہ آبِ زم زم کے کولروں سے معمور نظر آتا ہے یعنی اگر کوئی شخص مختلف زمانوں میں لکھے گے سفر نامہ ہائے حج کا مطالعہ کرے تو اُسے اِن تمام مقدس مقامات کی تفاصیل مِل سکتی ہیں۔

خورشید ناظر صاحب سے میری ملاقات 1978ء میں ہوئی تھی۔ دو چار ملاقاتوں ہی میں اندازہ ہونے لگا کہ وہ صاحبِ مطالعہ اور سلیقے سے گفتگو کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ پھر بیس سال بعد اچانک پتا چلا کہ وہ حج پر جا رہے ہیں گویا نماز روزے کے فرائض کے علاوہ دین سے اُن کی اِس قدر دلچسپی میرے نزدیک ایک نئی بات تھی۔ لیکن پھر ایک اور نئی بات سامنے آئی اور وہ یہ کہ وہ آنحضرتؐ کا اسم گرامی لیتے ہی رونے لگتے ہیں۔ یہ اُن کی صاحبِ ایمان ہونے کی نشانی تھی۔ یہ تو گزشتہ سال اُن کے سفر نامہ حج کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ اُن پر اللہ تعالیٰ کی بہت سی مہربانیاں ہیں۔ اِس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ انہوں نے ٹی وی پر ایک نعت سُنی نعت سُنتے ہی رونے لگے اور اپنی زندگی کی پہلی نعت لکھی اور پھر انہیں زیارتِ رسولؐ کی سعادت حاصل ہوئی گویا جس خورشید ناظر کو ہم برس ہا برس سے ایک عام انسان کے طور پر جانتے تھے اُس کی پہچان یہ تھی کہ اِس دنیا کی سب سے بڑی ہستیؐ اُن پر مہربان تھی، خدا کرے ہم سب کا نصیبہ اسی طرح جاگ جائے۔

ایسے میں خورشید ناظر نے حج کیا تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُن کی کیفیت کیا ہوگی؟ بدقسمتی سے ہمارے ہاں حج کرنے کی بھی کسی صورتیں اور کئی وجہیں ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ اِس لیے بھی حج پر جاتے رہتے ہیں کہ وہ آتے جاتے ممنوع اشیاء یعنی ہیروئین وغیرہ کا کاروبار کر سکیں، اِس کے علاوہ جدہ یا کراچی ائیر پورٹ پر کسی واپس آنے والی فلائیٹ کا مشاہدہ کریں تو پتا چلے گا کہ تقریباً ننانوے فیصد لوگ پی آئی اے کی طرف سے مجوزہ وزن سے کہیں زیادہ سامان لیے بیٹھے اور پریشان نظر آتے ہیں۔ میں حیران ہوا کہ ایک شخص تو مکہ معظّمہ سے عام واٹر کولر بھی لے کر آیا تھا۔ ایسے حجاج بہت ہی کم ہوتے ہیں جو اِس سفر کو صرف اللہ کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ خورشید ناظر صاحب نے یہ سفر خریداری کے لیے نہیں بلکہ صرف اور صرف اللہ کے لیے اختیار کیا تھا۔ اِس حوالے سے بیگم کے ساتھ اُن کی طے شدہ شرط دیکھیے۔

’’آپ مکہ معظّمہ یا مدینہ منورہ میں کسی شے کی خریداری نہیں کریں گی، ہم وہاں

سے صرف کھجوریں، آبِ زم زم اور تسبیحات لائیں گے۔'' ص7

میں نے کئی لوگوں کو دیکھا کہ وہ حج کے لیے مکہ معظّمہ پہنچے لیکن انہیں فوراً ہی Home Sickness نے آلیا۔ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو بہت صحت مند ہونے کے باوجود ایک عمرہ بھی نہیں کرسکا تھا۔ ایک کے بارے میں سنا کہ وہ مکہ معظّمہ میں اپنی رہائش پر پڑا بیوی بچوں کو یاد کرتا اور انہیں اپنے پاس بلانے کی سعئینا کام میں مصروف تھا جبکہ یہ سفر صرف اور صرف ایک شوق اور ایک تڑپ کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خورشید ناظر اسے کبھی خوشبو بھرے سفر اور کبھی خوشیوں بھرے سفر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں اِس سفر کی پہلی نماز، اِس سفر کا پہلا جمعہ اور اسی طرح دیگر تمام معاملات ایک عقیدت سے معمور عمل کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ مثلاً مکہ معظّمہ پہنچتے ہی وہ اپنی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میں نے اپنے اردگرد کے منظر پر نظر ڈالی، ہر شے مختلف، ہر شے حسیں، مجھے فضا نور سے بھری اور ایمان کی خوشبو سے مہکی مہکی محسوس ہو رہی تھی۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج کی صبح میری اب تک کی زندگی کی سب سے خوبصورت صبح تھی ۔ص26''

اِسی طرح آگے چل کر لکھتے ہیں:

''آج کی نماز آج تک کی تمام نمازوں سے بالکل مختلف تھی کیونکہ آج کعبہ کالے کوسوں نہیں، صرف چند گز کے فاصلے پر بالکل میری نظروں کے سامنے تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر میں اپنی جگہ سے اُٹھنے کی بجائے بیت اللہ پر نظریں جمائے اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ ص36''

اِسی طرح مسجد نبویؐ میں اپنی نمازِ جمعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ مسجد نبویؐ میں نماز جمعہ کو اپنی اِس مسجد میں پہلی نماز کے طور پر عجیب کیف و سرور کے عالم میں ادا کیا ہے۔ میرے اردگرد ٹھاٹھیں مارتا ہوا انسانوں کا ایک پاکیزہ سمندر ہے جس میں، میں اپنے آپ کو ایک ننھی سی کشتی کی طرح تیرتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ ص66۔67''

اور واقعہ یہی ہے کہ یہ سفر اسی جذبے اور اسی شوق کے ساتھ ہو سکے تو کیا ہی بات ہے؟ میں غور کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص مجھ سے اِس سفرنامہ حج کی دو تین چیدہ چیدہ باتیں پوچھنا چاہے تو میرا پہلا جواب یہ ہوگا کہ اِس سفر نامے کو صرف پڑھا نہ جائے بلکہ اِسے اپنے لیے رہنما بنایا جائے۔ اِس لیے کہ اِس سفرنامے میں وہ تمام چیزیں آ گئی ہیں جن کی صاحبِ دل شخص کو ضرورت ہو سکتی ہے۔ مثلاً سفر کے تمام مراحل ایک ایک کر کے پڑھنے والوں کے

علم میں آجاتے ہیں اور اِس سفرنامے کو رہنما بنانے والا شخص کہیں غلطی نہیں کرسکتا مثلاً عام لوگوں کو تلبیہ تک معلوم نہیں ہوتا جبکہ خورشید ناظر صاحب نے تلبیہ کے ساتھ ساتھ ہر موقع کی دعائیں بھی لکھ دی ہیں۔ دعاؤں میں بھی عام مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ عربی دعائیں عام لوگ یاد نہیں کرسکتے اور ترجمہ انہیں معلوم نہیں ہوتا لہٰذا وہ جگہ جگہ مشکلات میں مبتلا رہتے ہیں جبکہ خورشید ناظر صاحب نے یہ مشکل بھی حل کر دی ہے۔ اِس سفرنامے کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں سفرِ حج میں پیش آنے والے اور مذکور فرائض و مقامات کی تاریخ بھی دے دی ہے۔ مثلاً کوئی آدمی حج پر جائے اور اُسے یہ معلوم ہی نہ ہو کہ حطیم کیا ہے اور اِس میں نوافل ادا کرنے کی کیا فضلیت ہے تو حج تو ہو جائے گا لیکن وہ شخص اِن فضیلتوں سے محروم رہے گا۔ اِسی طرح کسی کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ حج یا عمرہ کرنے کے بعد سر کے چند بال قینچی سے کاٹنا، مشین پھروانے یا سر پر اُسترا پھروانے کی کیا حیثیت ہے اور آنحضرتؐ کو کونسی چیز سب سے زیادہ پسند تھی تو وہ شخص غلطی کرسکتا ہے یا زیادہ ثواب سے محروم رہ سکتا ہے۔

''ہر قدم روشنی'' کی تیسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اِس کے ذریعے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں، صحابیوں، خلفاء، راشدین، امہات المومنین، اہلِ بیت اور خاندانِ رسولؐ کے زمانے کی تاریخ کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیمؑ اور خانہ کعبہ و مسجد نبوی کی بھی ساری تاریخ قاری کے علم میں آجاتی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ تاریخ کا کوئی بھی واقعہ ایسا نہیں ہے جو اِس سفرنامے کے بطن سے پھوٹتا نظر نہ آتا ہو یعنی یہ تمام واقعات سفرنامے کی وحدت کو نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ اِس حوالے سے مفید نظر آتے ہیں۔ یہاں پر ایک اور بات کہنا بھی ضروری ہے کہ خورشید ناظر صاحب نے اِس سفرنامے میں جہاں واقعات کی ایک سے زیادہ وجوہ موجود تھیں، اُن کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ مثلاً حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ کو خانہ کعبہ کے قریب چھوڑنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حضرت سارہؓ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ وہ ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کو کسی ویرانے میں چھوڑ آئیں۔ آپ اِن دونوں ماں بیٹے کو لے کر اِس ویرانے میں چھوڑ آئے جہاں اب بیت اللہ ہے لیکن بعض مفسرین نے اِس روایت سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم کی ساری زندگی آزمائش ہی میں گزری، جب حضرت اسماعیل پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کو ایک اور آزمائش میں ڈالا اور حکم ہوا، اسماعیل اور اُن کی والدہ کو عرب کے ریگستان کے کسی بے آب و گیاہ مقام پر تنہا چھوڑ آؤ''۔ص45''

''ہر قدم روشنی'' کی چوتھی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حج پر جانے والے لوگوں کو تقابل کے ذریعے سیرتِ نبویؐ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ہم اپنی عام زندگی میں چھوٹی چھوٹی مشکلات سے گھبرا کر ہاتھ اُٹھا اور شکایات کے پلندے جمع کر لیتے ہیں مثلاً آج کا حاجی مکہ سے مدینہ منورہ یا مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ آرام دہ ائیر کنڈیشنڈ بس میں سفر کرتا ہے

۔اس کے باوجوداُسے انتظامات کی شکایت ہوتی ہے اور یہ شکایت خودخورشید ناظرؔ صاحب نے بھی کئی جگہ کی ہے لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ تک کا پہلا سفرآنحضرتؐ اوراُن کے یارِؓغار کے لیے کس قدر پُرخطر،خوفناک اورمشکل تھا لیکن آپؐ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں گھبرائے اور نہ ہی خوفزدہ ہوئے۔

اگرچہ خورشید ناظرؔ صاحب کا لہجہ ملتان کے حاجی کیمپ، جدہ کے ائیر پورٹ کے ہال اور مکہ سے مدینہ کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے بھی تلخ ہے لیکن سعودی حکمرانوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کا لہجہ ہر جگہ تلخ تر ہو گیا ہے۔خاص طور پر خورشید ناظرؔ صاحب نے جنت البقیع والے حصے کا عنوان ہی درج ذیل رکھا ہے۔

عنوان ’’دل نے ہر گام کئی زخم نئے کھائے ہیں‘‘ اوراس میں کوئی شک بھی نہیں کہ جنت البقیع میں زائرین کو ریت ، گندم کے دانوں اور کبوتروں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا اور سعودی حکمرانوں نے تمام پاکیزہ شخصیات کی مبارک قبور کا نام ونشان تک مٹا دیا ہے۔خورشید ناظرؔ صاحب اِس حوالے سے ذکر کرتے ہوئے بہت تلخ ہو جاتے ہیں۔وہ کہتے ہیں۔

’’تم اگر اپنے عقیدے کو ہی درست سمجھتے ہو تو ضرور سمجھو۔مجھے اِس پر کوئی اعتراض نہیں۔تم اگر اِس کی اشاعت کرنا چاہتے ہو تو ضرور کرو لیکن لوگوں کو گردن سے پکڑ کر بزعمِ اختیار مجبور نہ کرو کہ وہ اِس پر عمل کریں۔تم صحابہ کرام، اہلِ بیت اور ہماری ماؤں کی قبور کو نشان کی حد تک تو باقی رہنے دو، وہاں بیشک اپنے مسلک کے مطابق تحریر کروا دو کہ فلاں عمل جائز اور فلاں بدعت ہے لیکن یوں نہ کرو کہ بنامِ بدعت تم نے انہیں جس طرح مٹا دیا ہے آہستہ آہستہ کسی کے علم میں ہی نہ رہے کہ یہاں کون کون دفن ہے اور ہاں ایک بات اور بھی یاد رکھو، دنیا اور یہاں کی ہر شے فانی ہے۔جس طرح تم سے پہلے کی حکومتیں نہیں رہیں، تمہیں بھی آج نہیں تو کل اختیار سے ہاتھ دھونے ہی ہوں گے۔ص111,110‘‘

اِس طرح کے مقامات پر ایک حاجی کی بجائے سیاست دان بولتا نظر آتا ہے اور یہ تو ہمارے علم میں ہے کہ خورشید ناظرؔ صاحب سرکاری ملازم تھے تو اپنی یونین کے صدر تھے اور ملازمت سے الگ ہوئے تو اپنے علاقے کے کونسلر ہو گئے۔گویا جگہ جگہ اُن کی لیڈری کی رگ پھڑکتی اور انہیں کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔یہاں میں اپنی رائے کا اظہار کرنے سے گریز کرتے ہوئے صرف یہ کتنا چاہوں گا کہ درحقیقت ان جملوں میں لیڈر کے ساتھ ساتھ ایک سنی عقیدہ شخص بولتا نظر آتا ہے۔البتہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ اِس تلخی میں بھی حکمت کی کئی باتیں چھپی ہوئی ہیں۔

’’ہر قدم روشنی‘‘ کا سب سے خوبصورت پہلو یہ ہے کہ ہر حاجی اپنے ایک سفر حج میں صرف ایک حج کرتا ہے

لیکن خورشید ناظر صاحب نے اپنے 1998ء والے ایک ہی حج میں دو حج کیے ہیں۔ایک وہ حج جس کے لیے وہ بہاول پور سے ملتان، ملتان سے کراچی، کراچی سے جدہ، جدہ سے مکہ، مکہ سے مدینہ، مدینہ سے پھر مکہ اور پھر منیٰ، عرفات، مزدلفہ اور مزدلفہ سے واپس منیٰ کا سفر کرتا ہے لیکن اُن کا اِس سے بھی بڑا سفر حج وہ ہے جو انہوں نے اپنی خیالی دنیا میں آنحضرتؐ کی معیت میں اختیار کیا ہے۔اِس سفر کی خصوصیت اول یہ ہے کہ یہ سفر آنحضرتؐ کے ساتھ اختیار کیا گیا اور دوسرا یہ کہ آنحضرتؐ کے ساتھ سفر کرنے والے صحابہؓ کرام کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی لیکن اَب اُس میں مزید ایک حاجی کا اضافہ ہو گیا۔میں نے اپنی زندگی میں جتنے سفر نامہ ہائے حج پڑھے ہیں ’’ہر قدم روشنی‘‘ اپنی اِسی خصوصیت کی بنا پر مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔

’’ہر قدم روشنی‘‘ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ باقی سارے سفر نامہ ہائے حج بیانیہ ٹیکنیک میں لکھے گئے ہیں جبکہ ’’ہر قدم روشنی‘‘ کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ تلازمۂ خیال یعنی Association Of Ideas کی ٹیکنیک میں لکھا گیا ہے۔مثلاً خورشید ناظرؔ صاحب کسی ایک جگہ تشریف فرما ہیں مثال کے طور پر جنت البقیع میں تو جنت البقیع میں پہنچتے ہی اُن کے ذہن پر جن خیالات کی یلغار ہوتی ہے وہ انہیں بے کم و کاست پیش کرتے چلے جاتے ہیں اور اِس ٹیکنیک کے ذریعے جنت البقیع کی اہم ترین مدفون شخصیات اور اُن کی زندگیاں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔یہ ٹیکنیک خورشید ناظرؔ صاحب نے کسی ایک جگہ نہیں برتی بلکہ سارا سفر نامہ اسی ٹیکنیک میں لکھا گیا ہے۔

جہاں تک ’’ہر قدم روشنی‘‘ کی لفظی خصوصیات کا ذکر ہے تو میں اولین بات یہ کہنا چاہوں گا کہ غالباً یہ واحد سفر نامہ حج ہے جس کے تمام عنوانات موزوں ہیں مثلاً چند ایک عنوانات دیکھیے :

1: جس پہ بیداری تصدق وہ مجھے نیند ملی

2: یہ زمین وہ ہے جہاں رحمت برستی ہے

3: عظیم تر ہے ترا شہر، تیرا گھر مولا۔

4: سجدۂ شوق کروں یا ترا جلوہ دیکھوں۔

5: درِاقدس پہ غلام ابن غلام آیا ہے۔

6: یہ وہ نگری جس میں روشن روشن چہرے رہتے ہیں، وغیرہ

ہم جانتے ہیں کہ خورشید ناظر صاحب نقاد ہی نہیں بلکہ شاعر بھی ہیں لہٰذا اِس سفر نامہ حج میں جگہ جگہ اُن کے نعتیہ اشعار اور ایک آدھ جگہ تضمین کی صورت بھی نظر آتی ہے۔اِس کے علاوہ خورشید ناظر صاحب کے ہاں جگہ جگہ تخلیقی جملے نظر آتے ہیں مثلاً خورشید ناظر صاحب سلیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

’’اُس کا خیال تھا کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں لیکن اُسے کیا معلوم کہ ہمیں سیدھا راستہ تو نظر ہی اب آیا ہے۔ص51‘‘

خورشید ناظرؔ، آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''اہل ایمان کے دِل کھل اُٹھے تھے جبکہ خدا اور اُس کے رسولؐ کے دشمنوں کے دلوں میں زخموں کی فصل کاشت ہوگئی تھی۔ص57''

اِسی طرح خورشید ناظر صاحب اپنی تحریروں میں جگہ جگہ تشبیہات، استعارات اور دیگر ضائع بدائع کا استعمال کرتے ہوئے اپنی تحریروں کو پُر اثر اور رنگین بناتے چلے جاتے ہیں مثلاً چند جملے دیکھیے۔

''مجھے یوں لگا جیسے میں ایک چھوٹی سی ندی ہوں جس کے آگے دنیا داری کا بند باندھ دیا گیا تھا اب یہ بند ٹوٹ گیا ہے اور میں ایک پُر کیف روانی کے ساتھ اپنے جیسی اور بہت سی ندیوں میں آن ملا ہوں جو ہم رنگ، ہم آہنگ، اور یک جا ہو کر ایک دریا کی شکل اختیار کر چکی ہیں اب یہ دریا ایک شان و شوکت کے ساتھ سمندر کی جانب بڑھ رہا ہے جو اُس کی منزلِ مقصود ہے۔'' ص13

''میں نے محسوس کیا کہ سیاہیوں میں ڈوبا ہوا میرے دِل کا آئینہ مزید صاف ہونے لگا'' ص14

''میرے رسولؐ نے آنکھ کھولی بچپن اور جوانی گزاری خوشیاں دیکھیں ان گنت دکھ اُٹھائے اور تاریکیوں کے صحرا میں روشنی کا وہ مینار تعمیر کیا جس نے پوری دنیا کو روشن کر دیا ہے'' ص21

''تیرے سینے پر مسجد نبوی کا چاند چمک رہا ہے جہاں ایک نماز کا ثواب ہزار نمازوں کے برابر ہے۔'' ص58

اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ ''ہر قدم روشنی'' ایک ایسا سفر نامہ ہے جو عقیدت میں ڈوبا ہوا اور ایک نئی ٹیکنیک میں لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ میری رائے میں حج پر جانے والے ہر خوش نصیب کو اس سفر نامہ حج کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسلؐ وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
وہ دین کہ ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
آج اس کی مجالس میں نہ بتی، نہ دیا ہے
(مولانا الطاف حسین حالیؔ)

سلیم آغا قزلباش (سرگودھا)

ست رنگے پرندے کے تعاقب میں

معاشی ومعاشرتی ناہمواریاں کس طرح فرد کو کھوکھلا کر دیتی ہیں اور نفسیاتی دباؤ فرد کے اندر جذباتی اور جنسی گھٹن کے عفریت کو کیسے بیدار کرتا ہے؟ ان تمام گوشوں اور زاویوں کو رشید امجد نے اپنے ابتدائی دور کے افسانوں میں ایک حسّاس افسانہ نگار کی حیثیت سے محسوس کیا اور انھیں افسانوں کے سانچے میں ڈھالا۔ رشید امجد کے فنِ افسانہ نگاری کی پہچان یہ ہے کہ انھوں نے کسی ادبی فیشن یا چلن کا تابع مہمل ہو کر افسانہ لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ فی الاصل انھوں نے اپنی افسانہ نگاری کی اطراف کو کھلا رکھا ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ فرد کی خارجی اور باطنی دنیاؤں کی سیاحت کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ورنہ اکثر افسانہ نویسوں کا فن افسانہ جلد یا بدیر کسی نہ کسی ''لفافے'' کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ جس کی صرف ایک ''طرف'' ہی کھلی ہوتی ہے۔ اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے (اور اکثر جلد ہی آ جاتا ہے) جب لفافے پر مرقوم عنوان کو پڑھتے ہی خط یعنی ''افسانے'' کا مضمون سمجھ میں آ جاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ جب افسانہ بنی بنائی کھائیوں میں سفر کرنے لگے تو اس عہد کا افسانہ ڈاک کے لفافے کی مانند ایک جیسی وضع قطع اختیار کر لیتا ہے۔ جس سے جمود کی صورتِ حال نمودار ہونے لگتی ہے۔ اور صنفِ افسانہ کا فطری بہاؤ یا ارتقاء تھم جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے میں خونِ تازہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ تاکہ خون کی کمی (جو دراصل سوچ کی تازگی کے فقدان کا موجب ہوتی ہے) پوری کی جا سکے۔ رشید امجد ان معدودے چند افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہیں، جنھوں نے اردو افسانے میں سوچ کے عُنصر کو معدوم نہیں ہونے دیا۔ نیز ان کا افسانہ فرد کے روحانی اور کشفی دیار میں داخل ہونے کی کامیاب کوشش بھی کرتا ہے۔ رشید امجد نے گزشتہ دس بارہ برس میں جو افسانے لکھے ہیں، ان کے مطالعے سے ہمیں بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے یہاں افقی پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ عمودی گہرائی کا پہلو مزید توانا ہوا ہے۔ مرشد اور شیخ کے کرداروں نے مردِ دانا کی صورت میں افسانے کے کرداروں کو بحرِ آسا کیفیات سے دو چار کیا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے جز وکل' حیات وممات' خیر وشر اور Being & Becoming جیسے سوالات اور زاویوں کو ابھار کر افسانے کو عمودی گہرائی بخشی ہے۔

۱۹۶۰ء کے عشرے میں علامتی وتجریدی افسانے نے مجموعی حوالے سے اردو افسانے کو جن توانائیوں اور امکانات سے متعارف کرایا تھا وہ بعد ازاں ماند پڑتے چلے گئے۔ وہ اس وجہ سے کہ ناآموز اور ناتجربہ کار افسانہ نگاروں نے اس طرز کے افسانے کو سستی شہرت حاصل کرنے کا ایک شارٹ کٹ راستہ سمجھ کر یا پھر روایت سے

بغاوت اور جدیدیت کے نام پر اس کی اندھا دھند تقلید شروع کر دی تھی۔اس کا نتیجہ وہی نکلا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔یعنی ایک جیسے افسانے دھڑا دھڑ سامنے آنے لگے۔اردو افسانے پر یہ بہت بھاری وقت تھا۔افسانے کا قاری اس سے بدظن ہوتا جا رہا تھا۔سنجیدہ ادب کے بجائے طرح طرح کے ڈائجسٹوں کی بھرمار ہونے لگی تھی۔اردو افسانے کے قارئین کا ایک بڑا طبقہ خصوصاً نوجوان طبقہ ان ڈائجسٹوں کے چنگل میں پھنس کر ادبی ذوق سے تہی ہوتا جا رہا تھا۔اس بحرانی دور میں ''صحافتی ادب'' نے بھی پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے اور قارئین ادب کو ایک ''نئے ذائقے'' سے روشناس کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔جس کے اچھے اور برے ثمرات آج ہمارے سامنے ہیں۔بہر کیف رشید امجد اور بعض دوسرے منجھے ہوئے جدید افسانہ نگار ناموافق ادبی صورتحال ،عدم قبولیت اور مخالفانہ ردعمل کے باوجود پامردی سے افسانے کی اس نئی ڈگر پر کاربند رہے اور یوں علامتی اور تجریدی افسانے کا ارتقائی سفر جاری رہا۔نتیجتاً اردو افسانہ اسلوب بیان ، زاویہ نگاہ، پیش کش اور بالخصوص سوچ کے عنصر کے حوالے سے تازہ دم ہو گیا۔دوسرے یہ کہ جدید افسانہ فقط NARAATION کے بل بوتے پر اپنا دائرہ مکمل نہیں کرتا بلکہ ''سوچ کی غذا'' بھی مہیا کرتا ہے۔اردو افسانے میں یہ ایک ایسا اضافہ ہے جسے بلا جھجک علامتی و تجریدی افسانے کی دین قرار دیا جا سکتا ہے۔رشید امجد کے افسانے نے اسی ''اضافے'' کو مستحکم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

جدید اردو افسانے کا ایک قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے بیان میں ایسے متعدد شگاف چھوڑ دیتا ہے جسے قاری اپنے تخیل یا سوچ کے ذریعے پر کرتا ہے۔اور یوں افسانہ کی معنی آفرینی یا علامتی جہات میں مزید ایک پرت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔رشید امجد کا افسانہ اس زاویئے سے بڑا زرخیز ہے۔بعض ناقدین علامتی و تجریدی افسانے کو صرف تکنیک کا افسانہ گردانتے رہے ہیں،جس کا کام روایت شکنی تک محدود ہے۔درآں حالیکہ روایت سے بغاوت، روایت کا شعور حاصل کئے بغیر کارِ عبث ہے۔اس حوالے سے رشید امجد کا افسانہ روایت سے با اندازِ دگر پوری طرح مربوط نظر آتا ہے۔اپنے متعدد افسانوں میں فرد کی سائیکی میں جھانکتے ہوئے انھوں نے اجتماعی سائیکی کو بھی چھوا ہے۔اور یوں اس میں مدفون ٹیکسلا، ہڑپّا اور موہنجو ڈارو کے آثار، روایت سے اٹوٹ ربط و انسلاک کی صورت میں اجاگر ہوئے ہیں۔دوسری طرف رشید امجد کے افسانوں میں دھند یا دھندلکا کا استعارہ بھی ایک خاص معنویت کا حامل ہے۔دھند میں لپٹا ہوا ماحول نہ صرف پراسرار دکھائی دیتا ہے بلکہ ہر چیز اپنے اصل چہرے یا وجود کے برعکس اس کے ہیولے یا نیگیٹو کو ظاہر کرنے لگتی ہے۔یہ دھند بعض اوقات غبار یا خواب ناک فضا کے روپ میں ایک ایسا مہین پردہ یا نقاب ہے۔جو سچ اور جھوٹ، موجود اور ناموجود، مرئی اور غیر مرئی کے درمیان حائل ہے۔حقیقت کو جاننے کے لئے دھند کے جنگل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔اور اس سفر میں بصارت سے زیادہ بصیرت یا اندر کی آنکھ راہنمائی کرتی ہے۔علاوہ ازیں یہ دھند ایک مقام پر پہنچ کر Mystical Experience کا روپ

بھی دھار لیتی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ ''ست رنگے پرندے کے تعاقب میں'' کے افسانے باطن کے کینوس پر پھیلے مختلف النوع رنگوں کو اجاگر کرنے کی مساعی ہے۔یہ ست رنگا پرندہ دھنک کا اشارہ بھی ہے۔جس میں یہ ساتوں رنگ کچھ یوں باہم آمیز ہو گئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے متمیز کرنا ممکن نہیں رہا۔باالفاظ دگر قوسِ قزح ایک ایسی نردبان کا روپ اختیار کر گئی ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان رشتہ استوار کرتی ہے۔بلکہ ایک دوسرے زاویے سے موجود کو ناموجود سے جوڑتی ہے۔اور یوں زمین بوجھ کو تیاگ کر ایک روحانی منزل کی جانب پیش قدمی کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔اس سے قطع نظر ''تعاقب'' کی معنویت داستانی ادب سے لے کر عہدِ جدید تک نشان زد کی جا سکتی ہے۔

''ست رنگے پرندے کے تعاقب میں'' کے افسانے پڑھتے ہوئے ہمیں رشید امجد کے ہاں تہہ دار شعور اور انکشافِ ذات کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ نظر آتا ہے۔جو ایک طرح سے the other self کی تلاش سے منسلک ہے۔تاہم ان کے افسانوں میں Know thyself کا پہلو بھی اہمیت کا حامل ہے۔خود کی تلاش، شناخت یا پہچان کا عمل اس صوفیانہ مسلک سے ربط قائم کرتا ہے' جس کی رو سے جس نے خود کو جانا اس نے گویا اپنے رب کو پہچانا۔

رشید امجد کے افسانوں کے متعدّد کردار کسی خاص وقت یا زمانے کے جالے میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرح نہیں ہیں۔بلکہ ابعادِ ثلاثہ میں بیک وقت محوِ سفر رہتے ہیں۔زمانِ مسلسل Duration ان کے افسانے کا ایک خصوصی امتیاز رہا ہے۔بعینہٖ ان کے افسانوں میں قبر کا استعارہ موت کا اعلامیہ ہونے کے ساتھ ساتھ جون بدلنے یا قلب ماہیت کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔علاوہ ازیں یہ tomb کی علامت بھی ہے، مراد یہ کہ قبر دھرتی کے بطن یا رحمِ مادر کے مماثل ہے اور یہاں پہنچ کر فرد کی زندگی کا ''دائرہ'' مکمل ہو جاتا ہے۔گویا خاکی وجود، خاک میں مل کر خاک ہو جاتا ہے یا پھر مجتمع عناصر دوبارہ قدرتی عناصر میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

رشید امجد کے فن افسانہ نویسی کے بارے میں اس بات کا ذکر بار بار ہوا ہے کہ ان کے افسانوں کا مرکزہ 'IDEA' پر مبنی ہے، اور پوری کہانی ایک خیال کے گرد گھومتی ہے۔جس کی بدولت ٹھوس یا واقعاتی پہلوؤں کے بجائے سیّال کیفیات زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا روایتی کہانی کا پلاٹ ایک خاکہ یا IDEA نہیں ہوتا! دراصل اس سلسلے میں بنیادی فرق طریق کار کا ہے۔روایتی افسانہ چونکہ ٹھوس خارجی مظاہر و حوادث پر زیادہ توجہ صرف کرتا ہے، لہٰذا اس میں ارتکاز، واقعات کے منطقی ربط ضبط پر ہوتا ہے۔مگر علامتی و تجریدی افسانہ ''Non Figurative'' آرٹ کا نمائندہ ہے، چنانچہ وہ تصویر کشی یا پیکر تراشی کے بجائے رنگوں کے سیّال پیٹرن سے ایسی پرچھائیاں ابھارتا ہے، جن میں معنی آفرینی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

رشید امجد نے دنیا یا سماج میں پھیلے دکھ، اذیت یا خواہش کے چرکوں کا مداوا ڈھونڈنے کے لئے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔اور اس سفر میں جب وہ ذات کے بن میں داخل ہوئے تو وہاں انھیں بھوک پیاس کے

ساتھ ساتھ ماراً کی بیٹیوں کی بھڑکائی ہوئی خواہش کی آگ کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔تاہم اس جوکھم میں سے گزرنے کے بعد آگہی یا پہچان کا جو کیمیا ان کے ہاتھ لگا وہ فقط تیاگ یا خواہش کی موت کا پروانہ نہیں تھا، بلکہ خواہش کی کشتی کے بادبان کھول کر زندگی کے بپھرے ہوئے دریا میں سفر کرنے کا درس دیتا تھا۔(مراد یہ کہ خواہش موجود بھی رہے اور فرد اس میں سرتاپا غرق ہونے سے محفوظ بھی رہ سکے۔) رشید امجد کے کم وبیش چالیس سال پر محیط ادبی سفر کو دیکھتے ہوئے یہ بات برملا کہی جاسکتی ہے کہ ان کا افسانہ ٹھہراؤ یا جمود کا شکار نہیں ہوا، بلکہ تہہ دار خصوصیات کے باعث ہمیشہ مائل بہ ارتقاء رہا ہے۔''ست رنگے پرندے کے تعاقب میں'' کے افسانے ان کے فنِ افسانہ نگاری کی اسی خاصیت کا واضح ثبوت ہیں۔

طاہر مجید (جرمنی)

دستِ دعا۔ایک مطالعہ

''دستِ دعا'' صبا اکبر آبادی کی قلبی عقیدتوں کا مجموعہ ہے۔اس میں انہوں نے حمد، قصیدے اور بہت ساری نعتیں شامل کی ہیں۔ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سلطان جمیل نسیم نے یہ مجموعہ شائع کرایا ہے۔صبا صاحب ایک زود گو شاعر تھے۔انہوں نے خود لکھا ہے کہ ان کے استاد ان سے روزانہ سو سو شعر لکھوا کر مشقِ سخن کرواتے تھے۔لیکن جو شعر انہوں نے اُس شاگردی کے دوران لکھے تھے وہ اپنے کسی مجموعے میں شامل نہیں کئے۔اس کے باوجود جب ۱۹۷۰ء میں ان کا پہلا مجموعۂ غزل ''اوراقِ گل'' شائع ہوا تو اس میں انہوں نے لکھا کہ غزل کی ایک لاکھ ابیات ان کے ذخیرۂ غزل میں موجود ہیں۔

صبا صاحب ادبی حیثیت کے علاوہ عملی زندگی میں بھی ایک سچے عاشقِ رسولؐ تھے۔ان کے اسی عشق رسولؐ نے ان سے نعتیں کہلوائیں۔

دارالاماں یہی ہے حریمِ خدا کے بعد　　　ہم کس کے در پہ جائیں درِ مصطفیٰؐ کے بعد
مجھ کو طلب نہیں ہے شرابِ طہور کی　　　تر ہے زبان مدحتِ خیرالوریٰؐ کے بعد
ہم عاشقانِ آلِ محمدؐ ہیں اے صبا　　　زندہ رہیں گے نام ہمارے فنا کے بعد

ان کے نعتیہ شعر عشقِ نبیؐ سے یوں معمور ہیں کہ پڑھتے ہوئے بھی وجد سا طاری ہونے لگتا ہے۔چند اشعار مزید ملاحظہ ہوں۔

چھڑ گیا بزمِ عقیدت میں بیانِ مصطفیٰؐ　　　وجد میں آنے لگے ہیں عاشقانِ مصطفیٰؐ

ایک اک دل میں محمدؐ جلوہ گر ہیں حشر تک　　　اس کو کہتے ہیں حیاتِ جاودانِ مصطفیٰؐ
ہیں ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ سب شریک　　　کس قدر پھیلا ہوا ہے خاندانِ مصطفیٰؐ
میں دیوانہ ہوں عشقِ مصطفیٰؐ میں　　　جنوں میرا کمالِ آگہی ہے
زمیں پر جب سے وہ تشریف لائے　　　فلک تک روشنی ہی روشنی ہے
محبت ساری دنیا کی مٹا دے　　　الٰہی دل کو عشقِ مصطفیٰؐ دے
خدا کے گھر میں کس شے کی کمی ہے　　　خدا کی راہ میں گھر بھر لٹا دے
کوئی ایسا بھی انساں دوست ہوگا　　　عدو کے واسطے جس نے دعا کی
درودِ مستقل بھیجو نبیؐ پر　　　مسلسل رحمتیں ہوں گی خدا کی
میرے لب پر حضورؐ کی باتیں　　　تیرگی میں ہیں نور کی باتیں
مئے حبّ رسول پی لی ہے　　　اب کروں گا سرور کی باتیں
عشق احمدؐ میں اے صباؔ ہم نے　　　دولتِ کائنات پائی ہے
محمدؐ جو تشریف لائے صباؔ　　　خدا کا ہمیں اعتبار آ گیا

ضبا کے اس مجموعہ کے کلام ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں اوّل سے آخر تک ایک احترام، ایک تقدس نظر آتا ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے وہ باوضو، دربارِ نبوی میں دست بستہ کھڑے ہیں اور نہایت ادب سے سرکارِ دو عالَمؐ سے شفاعت کے طلبگار ہیں۔ادب و احترام کا یہ عالَم ہے کہ نظریں ہمیشہ نیچی رہتی ہیں اور کسی بھی جگہ بے احتیاطی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

مدینے میں آداب ہیں گفتگو کے　　　میں خاموش رہتا ہوں دل بولتا ہے
مجھ کو قسمت نے بڑا منصب دیا ہے اے صباؔ　　　یعنی محبوبِ خدا کی مدح خوانی مل گئی

صبا کی خوبی یہ کہ انہوں نے نعت میں مدحت کے کمال باوجود شعری غلو سے خود کو بچائے رکھا ہے۔بہت سے نعت نگاروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا مبارک کو اپنا موضوع بنایا ہے مگر صبا اکبر آبادی نے زیادہ تر حضورؐ کے اخلاقِ مکارمہ کو مرکز بناتے ہوئے اپنے عشق کا اظہار کیا۔مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ اقبال نے اپنے دور میں مسلمانوں کی حالتِ زار کا جو دردناک نقشہ کھینچا تھا، آج کے عہد میں مسلمانوں کی کسمپرسی پر صبا ویسے ہی التجا کرتے ہوئے یوں فریاد بلب ہیں۔

گھِر رہا ہے پھر زمانہ تیرگیٔ کفر میں　　　روشنی پھر روشنی یا رحمۃ اللعالمینؐ
پھر عطا ہو جائے ہم کو بادۂ وحدت کا جام　　　دور کر دو تشنگی یا رحمۃ اللعالمینؐ
دل تڑپتا ہے آج سینے میں　　　پھر مدینے کی یاد آئی ہے

تیری امت پہ ظلم ہوتے ہیں　　میرے آقاؐ! تری دہائی ہے
فتنہ وشر کی زمانے میں ہوا چلتی ہے　　آج کل دشمنِ اسلام ہے دنیا ساری
وقتِ امداد ہے اے رحمتِ عالم اس دَم　　تم جو چاہو تو پلٹ جائے زمانے کی ہوا

صبا صاحب بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔ ادب کی کوئی بھی صنف ہو اس میں انہوں نے اس بات کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے اگر نظم لکھی تو اس میں کلاسیکی دریا کی روانی تھی، غزل کہی تو اس میں گہرائی تھی۔ مرثیہ لکھا تو یوں ڈوب کر لکھا کہ پڑھنے اور سننے والوں کا دامن آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ نعت لکھی تو اس عشق، محبت اور لگن سے کہ گویا ہر عاشقِ رسولؐ کی دل کی زبان بیان کر دی ہے۔ اور کیوں نہ ایسا ہوتا کہ ان کا وسیلہ ہی بڑا معتبر ہے۔

مجھ کو الفاظ پہ قابو نہ معانی پہ عبور　　منطق وفلسفہ سے واسطہ کیا ہے میرا
مجھ کو ملتی ہے کسی در سے مضامین کی بھیک　　کسی دربار سے ہوتے ہیں مجھے لفظ عطا

اسی معتبر وسیلے نے انہیں اس عہد کے نعت گو شعراء کی صفِ اول میں کھڑا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ (بیکانیر)

تاریخ وتذکرۂ فتح پور شیخاواٹی

نذیرؔ فتح پوری میدانِ شاعری، ناول نگاری اور مضمون نگاری میں اپنے قلم کی سحر طرازیاں دکھا چکے ہیں۔ اب انہوں نے تحقیق کی وادیٔ خارزار میں قدم رکھا ہے، جس کا عمدہ نمونہ زیرِ نظر تالیف ''تاریخ وتذکرۂ فتح پور شیخاواٹی'' کی صورت میں منظرِ عام پر آیا ہے۔

نذیرؔ فتح پوری نے تاریخ اور تذکرے کو ایک ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ہوسکتا ہے بعض حضرات کے نزدیک ان کا یہ عمل خلطِ مبحث کا درجہ قرار پائے۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے تذکرہ اور تاریخ کا امتزاج پیش کرنا ہی اپنے پیشِ نظر رکھا ہو۔ گو کہ تذکرہ اور تاریخ کو اب تک دوچند کر کے دیکھا گیا ہے کیونکہ تذکرہ نقشِ اوّل اور تاریخ نقش ثانی کی حیثیت رکھتی ہے۔

مؤلف نے ابتداً اس تالیف کو ''تذکرۂ شعرائے فتح پور'' کے نام سے مرتب کیا تھا لیکن کسی سبب سے یہ تذکرہ تاریخ کا حصّہ بھی بن گیا اس سلسلے میں نذیر فتح پوری نے واضح طور پر لکھا ہے:

''میں نے ۱۴؍اگست ۲۰۰۱ء کو ''تذکرہ شعرائے فتح پور'' کا پہلا صفحہ لکھا، اس کے بعد ایسی دُھن سوار ہوئی کہ ۱۴؍ستمبر

۲۰۰۱ء کو کتاب مکمل کر کے دستخط کر دیئے۔ پھر اس کی اشاعت کے لیے راجستھان اردو اکادمی جے پور کے سابق سکریٹری معظّم علی سے رابطہ قائم کیا، انہوں نے کہا پہلی فرصت میں مسوّدہ ارسال کر دیں، دراصل فتح پور سے لوٹتے وقت جے پور میں معظّم علی سے مل کر تذکرے کی اشاعت کے لئے انہیں آمادہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ہی ترتیب و تدوین کا کام شروع کیا تھا۔ جیسے ہی کام مکمل ہوا مسوّدہ اکادمی کو ارسال کر دیا۔ دو ماہ انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھا رہا، لیکن اکادمی کی جانب سے مسودے کی رسید بھی نہیں ملی....... جب میں نے متعدد خطوط لکھ کر معظّم علی سے صورتحال معلوم کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن فون پر انہوں نے جو صورت حال بتائی اس سے مجھے دُکھ پہنچا۔ اسی دوران جان کوی نعمت خان اور اکبر کی بیوی تاج کویتری کے تعلق سے کچھ اور انکشافات ہوئے۔ بابر کی فتح پور آمد کا مسئلہ بھی زیرِ قلم آیا۔ فخر التواریخ کا مسودہ بھی مطالعہ میں آیا۔ ان تمام چیزوں کی شمولیت کے بعد مساجد، کنویں اور حویلیوں کی تفصیل بھی شامل کر لی گئی۔ فتح پور کے میلے اور تہواروں کے ساتھ ہی موسم اور فصلوں کی نوعیت اور کیفیت کا احوال بھی شامل کیا گیا، پھر کتاب کا نام بھی تبدیل کر کے، تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاواٹی، طے پایا'' (۱)

نذیرؔ فتح پوری کی اکثر تالیفات میں یہ التزام دیکھا گیا ہے کہ وہ باضابطہ طور پر ابواب قائم کرنے کے بجائے چیدہ چیدہ موضوعات کے تحت اظہارِ خیال کرتے ہیں، زیرِ نظر تالیف میں بھی ایسا ہی ہوا ہے کہ انہوں نے تیس مستقل اور ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں، تذکرے سے قطع نظر تاریخ میں ادوار کی تقسیم اور ابواب کی ترتیب کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے زمان ومکاں کی قید کو بھی ضروری نہیں سمجھا، چنانچہ یہ کتاب فتح پور کی تاریخ سے متعلق بعض اہم حصّوں کو روشن کرتی ہے، منظّم تاریخ لکھنا شاید نذیر فتح پوری کا مقصد ومنشاء نہیں رہا۔ لیکن انہوں نے اپنے تئیں جو عنوانات قائم کیے ہیں ان میں اختصار ضرور ہے لیکن بڑی جامع اور معنی خیز معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

اس تالیف کو محض ادبی تذکرہ یا تاریخ پر محمول نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ اس میں ادب کے علاوہ، تہذیب، تمدّن، ثقافت، فنونِ لطیفہ کے علاوہ فتح پور کی سماجی اور سیاسی زندگی کو بھی معرضِ بحث میں لایا گیا ہے، تاہم اسے فتح پور کی ''ثقافتی اور تہذیبی تاریخ'' قرار دینا زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

''قائم خانی قوم کی ابتدا'' اور ''قائم خانی نوابوں کی خصوصیات'' ایک دوسرے سے مربوط موضوعات ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے قائم خانی بہادر اور سپاہی پیشہ قوم ہے، ہندوستان کی تاریخ میں اس قوم نے اپنی بیش بہا خدمات کے سبب روشن باب کا اضافہ کیا ہے۔

قائم خانی قوم کا وجود کس طرح عمل میں آیا اس سلسلے میں مؤرخین میں اتفاقِ رائے نہیں ہے۔ لیکن اس بابت جان کوی نعمت خان کی تصنیف ''قائم راسا'' کو بعض محققّوں اور مؤرخوں نے مستند مآخذ قرار دیا ہے، نذیرؔ

فتح پوری نے بھی ''قائم راسا'' کے بیانات کی روشنی میں اعتدال پسندانہ نتائج برآمد کیے ہیں۔

''قائم خانی نوابین کی خصوصیات'' کے تحت مؤلف نے ان کی انفرادی خصوصیات اور اوّلیات کے سہروں کا ذکر کیا ہے، اوّلیات کے سہروں کی فہرست طویل ہوسکتی تھی لیکن نذیرؔ فتح پوری نے صرف ۲۲ اعداد وشمار پر قناعت کی ہے، یہاں تمام تر تفصیلات درج کرنے کا محل نہیں اگر تفصیلات معلوم کرنا مطلوب ہو تو اس تالیف کا صفحہ ۳۳ تا ۳۴ ملاحظہ فرمائیں۔

مذکورہ موضوعات کے بعد شریکِ اشاعت کئے گئے موضوعات براہِ راست فتح پور سے متعلق ہیں جن میں ایک موضوع ''باشندگان فتح پور'' ہے جو محض ایک صفحے پر محیط ہے جس میں مؤلف نے یہ بتایا ہے کہ فتح پور میں کم وبیش اٹھائیں مسلم برادریاں موجود ہیں۔ اور ماضی میں تجارت پیشہ ہندو سیٹھ اور ساہوکار بھی یہاں کے باشندگان میں شامل تھے۔ مؤلف نے یہ بھی نشاندہی کی ہے کہ فتح پور کے باشندوں نے کسبِ معاش کے لیے ہندوستان کے مشہور شہروں اور بیرونِ ممالک میں بھی سکونت اختیار کی اور کامیابی وکامرانی کا پرچم لہرایا۔ اس سلسلے میں مؤلف نے کتنا سچ لکھا ہے کہ

''چونکہ عام طور پر راجستھانی محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں، ایماندار اور دیانت دار بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں'' (۲)

فتح پور کب آباد کیا گیا؟، یہ بھی ایک پیچیدہ اور تحقیق طلب موضوع ہے جسے نذیرؔ فتح پوری نے ''قیام فتح پور کے تاریخی تضادات'' کے زیرِ عنوان سلجھانے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے میں انہوں نے ہندی، راجستھانی اور اُردو کے بعض تاریخی مآخذات کی روشنی میں استنباط نتائج کی سعی کی جن میں محبوب علی خان کی تالیف ''قائم خانیوں کا شودھ پورن اتہاس'' اور نعمت خاں کی ''قائم راسا'' کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے، مؤلف نے فتح پور کے قیام کے سلسلے میں وکرم سمت ۱۸۰۸ مطابق ۱۴۵۱ عیسوی یعنی ۲۰ صفر ۸۵۷ ہجری سے اتفاق رائے کیا ہے۔

''مختصر تاریخ۔ فتحپور شہر کے نوابین'' میں نوابین کا ذکر اختصار سے کیا گیا ہے، جن نوابین کا تذکرہ آیا ہے اُن میں فتح خاں بہادر، نواب جلال خاں، نواب درِ دولت خاں، نواب ناہر خاں، نواب فدن خاں، نواب تاج خاں، نواب الف خاں، نواب دولت خاں دوئم، نواب سردار خاں، نواب دیندار خاں، نواب سردار خاں دوئم اور آخری نواب قائم خاں کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ مؤلف نے نوابین کی سخاوت، فیّاضی، شجاعت، علم وادب سے رغبت کے علاوہ مغلوں اور دیگر معاصر رجواڑوں سے باہمی تعلقات کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے، اس بابت جس قدر مطبوعہ وغیر مطبوعہ مصادر و مآخذ کی ضرورت تھی، مؤلف نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ فتح پور کے نوابین کے متعلق ان کا مندرجہ بیان حاصلِ مطالعہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

''فتح پور کے نواب غیر متعصّب تھے بلکہ مسلمانوں سے زیادہ انہوں نے ہندو رعایا کو اپنے قریب

رکھا۔ اُن دنوں فتح پور کی تجارتی منڈی پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ نوابوں کے دورِ اقتدار میں مندروں کی تعمیر کثرت سے ہوئی، مسجدیں کم بنیں۔ فتح پور کے سنت کوی سُندر داس کا نواب کے دربار میں بڑا احترام تھا۔ نوابوں کی بیگمات بھی ہندو گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ فتح پور کے کسی بھی نواب نے مذہبی بنیادوں پر کبھی جنگ نہیں لڑی۔ انہوں نے سادھو سنتوں کا ہمیشہ احترام کیا۔ فتح پور کے نوابین کے سیکولر کردار کی مثال نہیں ملتی''

''شہنشاہ بابر فتح پور میں'' کے زیرِ عنوان مغل بادشاہ بابر کی فتح پور میں آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''یہ تب کی بات ہے کہ جب دِلّی پر سکندر لودھی کی حکومت تھی۔ فتح پور میں اُس وقت نواب درِ دولت خاں کا راج تھا۔ اُس وقت بابر ایک قلندر کے بھیس میں ہندوستان آیا تھا۔ اپنے سفر کے دوران بابر نے فتح پور کا سفر بھی کیا تھا'' (۲) اس ذیل میں ''نگر نگراں فتح پور'' فخر التواریخ'' ''قائم خانیوں کا شودھ پورن اتہاس'' اور ''قایم راسا'' کے حوالے سے قلم اٹھایا گیا ہے۔ مؤلف نے اپنی محققانہ ذمّے داریوں کے پیشِ نظر حسب موقع مؤرخین کے بیانات سے اتفّاق واختلاف بھی کیا ہے۔ اور سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے کے بجائے اپنے فکر وتدبّر سے خاطر خواہ نتائج بھی نکالے ہیں۔ اس کی ایک مثال ان کے مندرجہ ذیل اختلافی بیان سے بھی فراہم ہوتی ہے:

''محبوب علی خاں نے معلوم نہیں کن بنیادوں پر لکھ دیا کہ سنت بابر نے فتح پور ہی میں قیام کیا۔ اُس کے انتقال کے بعد اُسے فتح پور کے مغربی حصّہ میں دفن کیا گیا جہاں اس کا مزار ''شیرِ سلطان'' کی درگاہ کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ جبکہ ''راسا'' ہمیں بتاتا ہے کہ بابر الور سے ہوتا ہوا کابل پہنچا۔ وہاں جا کر اُس نے جن تین ہندوستانی بہادروں کی تعریف کی ان میں ایک نام نواب درِ دولت خاں کا بھی ہے'' (۱)

جان کوی نعمت خاں کے متعلق اس تذکرے میں پانچ عناوین کے حوالے سے پُر از معلومات انکشافات کیے گیے ہیں۔ گو کہ جانؔ کوی کی تخلیقات ناگری رسم الخط میں ہمدست ہوتی ہیں لیکن مؤلف نے ان کی تخلیقات کے اندرونِ صفحات سے ایسی تحریریں تلاش کی ہیں جو فارسی اور اُردو سے قریب تر ہیں چنانچہ اس تناظر میں یہ نتیجہ اخذ کرنا شاید غلط نہ ہوگا کہ جانؔ کوی کو اِن دونوں زبانوں سے متعلق خاصی واقفیت رہی ہوگی، جان کوی فتح پور کے نواب دیوان الف خاں کے نورِ نظر تھے، انہوں نے میدانِ شاعری میں ہانسی کے ایک بزرگ شیخ محمد چشتی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ یوں تو جانؔ کوی نے مختلف اصناف کے ذریعہ اپنے احساسات وخیالات کا اظہار کیا لیکن دوہا اُن کی پسندیدہ صنف تھی۔ چنانچہ مختلف حادثات وواقعات کو انہوں نے اپنے دوہوں کا موضوع بنایا۔ نذیر فتح پوری نے جانؔ کوی کی ۷۵ عدد کتابوں کا ذکر کیا ہے یہ تمام کتابیں راجستھان اسٹیٹ آرکائیوز بیکانیر میں محفوظ ہیں اور بیشتر زیورِ طبع سے ہنوز محروم ہیں۔ اُن کتابوں میں ''قائم راسا'' کو شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ مؤلف نے راسا میں فارسی الفاظ کی فراوانی کی نشاندہی محققانہ انداز میں کی ہے۔ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق

ہے انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ:

''کسی نے راسا کی زبان کو 'سورٹھ مارو' بتایا ہے، کسی نے اسے 'مارو گرجر' لکھا ہے کسی نے مارواڑی اور گجراتی لکھا ہے۔ پرانے زمانے میں راجستھانی اور گجراتی دونوں زبانیں ایک ہی تھیں، مغلوں کی حکومت جب ہندوستان میں قائم ہوئی تب ان زبانوں میں دھیرے دھیرے دوری بڑھتی گئی اور آگے چل کر دونوں صوبوں کی زبانیں الگ الگ طور پر پہچانی جانے لگیں'' (۲)

ہندی کے بعض اہلِ قلم نے یہ افواہ پھیلادی تھی کہ جان کوی غیر مسلم تھے، واضح ہو کہ ایسی غلط بیانی اور خلفشار اکثر ایسے کویوں اور ادیبوں کے تعلق سے کیا جاتا رہا ہے جو مذہبِ اسلام سے متعلق تھے اور ہندی، برج یا راجستھانی میں ادب تخلیق کرتے تھے، چنانچہ ایسے شر پسندوں کو نذیر فتح پوری نے اِس طرح آڑے ہاتھوں لیا ہے:

''تعجب ہے کہ مِشرا (یعنی ڈاکٹر رتن لال مِشرا) اور مُنی (یعنی مُنی جن وجے) دونوں ہی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نام سے وہ مسلمان رہا ہو لیکن عقیدے اور روح کے اعتبار سے وہ ہندو تھا۔ حالانکہ جان نے متعدد جگہ اللہ اور رسول کا ذکر کیا ہے۔ ان بزرگوں کا ذکر کیا ہے جن کے ہاتھ پر اس نے بیعت کی تھی۔ ہندی کے محققوں اور ناقدوں نے اکبر کی بیوی تاج کویتری کو بھی ہندو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ ایک جگہ تو اسے کرشن بھگت بتایا گیا ہے'' (۱)

اس تذکرے میں ایک موضوع تاج بی بی کے متعلق بھی ہے، جو نواب دیوان فدّن خاں کی صاحب زادی تھیں اور جن کی شادی مغل بادشاہ اکبرِ اعظم سے ہوئی تھی۔ ہندی کی اکثر ادبی تاریخوں اور تذکروں میں بہ حیثیت ہندی کویتری اُن کا ذکر اہلِ قلم حضرات نے کیا ہے، غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ نذیر فتح پوری نے اُردو میں اُن کے متعلق خامہ فرسائی کی ہے۔ تاج بی بی نے منظومات، دوہے اور بعض مذہبی نوعیت کے گیت تخلیق کیے جن سے اُن کی علم وادب سے وابستگی اور شعری استعداد کا علم ہوتا ہے۔ مؤلف نے بھگت شِرومنی میرا بائی کے بعد تاج کویتری کو راجستھان کی اہم 'خاتونِ ادب' ثابت کیا ہے اور ان کے کلام سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ تاج بی بی کا رجحان طنز ومزاح کی طرف بھی تھا چنانچہ اس ذیل میں مؤلف رقم طراز ہیں کہ:

''تاج کی مشہور کتاب 'بیوی باندی کا جھگڑا' ہندی ادب کے ناقدین کے لئے موضوعِ بحث رہی ہے۔ اس کتاب میں عام انسانی زندگی کا احوال مزاحیہ پیرایۂ اظہار میں کیا گیا ہے۔ اس لیے اسے ایک سنجیدہ اور بھگتی رس میں ڈوبی ہوئی شاعرہ کا کلام نہیں کہا جاسکتا۔ بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ تخلیق تاج کی ابتدائی دنوں کی لکھی ہوئی ہے۔ جب وہ بھگتی کے رموز واسرار سے واقف نہیں تھی'' (۲)

فتح پور کے شیخاوت حکمرانوں کا تذکرہ بھی اس تالیف کا قابلِ قدر حصّہ ہے، گوکہ یہ تذکرہ محض سوا صفحے پر محیط ہے لیکن مؤلف نے یہ بتایا ہے کہ مسلم نوابین نے تقریباً ۲۸۰ برس تک فتح پور پر حکومت کی لیکن بعد ازاں یہ

علاقہ شیخاوت حکمرانوں کے زیرِ اقتدار آ گیا۔ جن حکمرانوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں راؤ شری شِو سنگھ، راؤ شری ناہر سنگھ، راؤ شری چاند سنگھ، راؤ شری دیوی سنگھ، راؤ شری لکشمن سنگھ، راؤ شری رام پرتاپ سنگھ، راؤ شری بھیرو سنگھ راؤ شری مادھو سنگھ اور شری کلیان سنگھ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ نذیر فتح پوری نے لکھا ہے کہ شیخاوتوں نے یہاں تقریباً ۲۱۶ برس حکومت کی یہ تمام حکمراں غیر متعصب تھے لیکن انہوں نے ''شہر کو خوبصورت بنانے کے لیے کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دیا، البتہ نوابوں کے بنائے محلوں اور دیگر عمارتوں کا تحفّظ ضرور کیا'' (۱)

فتح پور کو مسجدوں، کنوؤں اور حویلیوں کا شہر بھی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ محقّق طور پر نذیر فتح پوری نے یہاں کی مسجدوں، کنوؤں اور حویلیوں نیز جدید طرزِ تعمیر کے نمونوں کا ذکر کیا ہے۔ موضوع کو دلچسپ بنانے کی غرض سے بعض اہم تصاویر بھی جابہ جا چسپاں کی گئی ہیں تاکہ قاری کا تصوّر تعبیر کی صورت اختیار کر سکے۔

''چیدہ چیدہ'' موضوعات کے تحت چند اہم اقتباسات جن کی حیثیت ذیلی عنوانات کی سی ہے، پیش کیے گئے ہیں، یہ موضوعات، معلومات کے اعتبار سے بہت اہم ہیں اور ان کے بغیر فتح پور کی تاریخ بھی مکمل نہیں ہوسکتی، لہٰذا ان موضوعات کی شمولیت کو نذیر فتح پوری نے ناگزیر سمجھا، موضوعات یہ ہیں (۱) کچھ اور نوابوں کے بارے میں (۲) فخر التواریخ (۳) پاکستان میں فتح پور کا تذکرہ (۴) آستانۂ درِ دولت خاں (۵) فتح پور کی آبادی (۶) موسم اور فصلیں (۷) کاروبار (۸) سواریاں (۹) میلے اور تہوار (۱۰) تیج اور گنگور (۱۱) بُدھ گرو جی کا میلہ (۱۲) بھوری مِٹّی (۱۳) مِنسٹر گاڑی 'یعنی گدھا گاڑی' اور ترنم کے جادوگر۔ یہ تمام موضوعات تہذیبی وثقافتی اعتبار سے فتح پور کی چلتی پھرتی تاریخ کے آئینہ دار ہیں۔

شیخاواٹی میں پہلی تصنیف کے خالق کے بطور حضرت حاجی نجم الدین کا ذکرِ خیر مؤلف نے بعض ناقدوں اور محققوں کے بیانات سے اختلاف کرتے ہوئے کیا ہے۔ ایک بحث یہ بھی اٹھائی گئی ہے کہ بعض لوگوں نے نجم الدین نجم اور نجم الدین پروانہ کو الگ الگ شخص بتایا ہے، مؤلف کے نزدیک یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں، تحقیق چونکہ نہایت صبر آزما فن ہے اور عجلت پسندی آدابِ تحقیق میں جائز نہیں چنانچہ اِس بحث کو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھنا ہی بہتر ہے کیونکہ راقم الحروف اس موضوع پر پہلے ہی سے مصروفِ تحقیق ہے۔ مؤلف کا بیان ہے کہ نجم الدین صاحب نے اپنی ۵۲ برس کی عمر میں ۵۲ کتابیں تصنیف کیں اُن کا نام ابھی پردۂ اخفا میں ہے، میں مؤلف کے اس بیان سے بصد معذرت اختلاف کرتے ہوئے عرض کروں کہ ان کی دس پندرہ کتابیں میری نظر سے گزر چکی ہیں جو اجمیر کے دو ایک ذاتی کتب خانوں اور درگاہِ معلّیٰ حضرت غریب نواز کے دار العلوم عثمانیہ اجمیر القدس میں محفوظ ہیں۔ نجم الدین کے ساتھ اکثر کتابوں پر لفظ پروانہ تخلص کی علامت کے ساتھ موجود ہے۔ حضرت نجم الدین نے فارسی، اردو اور ہندی میں جو کتابیں تصنیف کیں ان میں چند نام اس طرح ہیں:

(۱) شجرۃ العارفین (حالات خواجگانِ چشت ومشائخ)

(۲) شجرۃ المسلمین (تاریخِ نوابین فتح پور شیخاواٹی)
(۳) شجرۃ الابرار (خواجہ صوفی حمیدالدین ناگوری کی سوانح)
(۴) مناقب الحبیب (احوالِ خواجہ معین الدین چشتیؒ)
(۵) مناقب التارکین (حالات خواجہ حمیدالدین ناگوری)
(۶) مناقب المحبوب (حالاتِ مشائخ سلسلۂ چشتیہ وملفوظات خواجہ سلیمان تونسوی)
(۷) راحت العاشقین (۸) تذکرۃ السلاطین (احوال بادشاہِ ہند)
(۹) گلزارِ وحدت (۱۰) احسن العقائد (۱۱) نجم الواعظین (۱۲) ہدایت نامہ
(۱۳) مقصود العارفین (شرح اورادِ شیخ نصیرالدین) (۱۴) نجم الہدایت (۱۵) خیالاتِ نجمی
(۱۶) دیوانِ نجمی فارسی (۱۷) احسن القصص (۱۸) نجم الآخرت (مسائل شریعہ)
(۱۹) فضیلۃ النکاح (مسائلِ شریعہ) (۲۰) حیات العاشیق (۲۱) بیان الاولیا (۲۲) تذکرۃ الواصلین
(۲۳) سِماع السّامعین (۲۴) ماحی الغیریت (۲۵) افضل الطّاعت (۲۶) دیوانِ نجم اُردو
(۲۷) پیرملانی غیر بھلانی (۲۸) پریم گنج (دوہوں کا مجموعہ)
(۲۹) یارہ ماہیہ نجم وغیرہ۔ مزید تصانیف کی تفصیل کے لیے ''سلطان التارکین'' مرتبہ احسان الحق فاروقی مطبع مشہور آفسیٹ پرنٹنگ پریس کراچی، ۱۹۶۳ء کا صفحہ نمبر ۳۸۸ تا ۳۹۰ اور دیگر صفحات ملاحظہ فرمائیں۔

عارفؔ فتح پوری کا استقبالیہ نغمہ جو اسلامیہ اسکول عیدگاہ کا دائمی ترجمان بن چکا ہے، بقولِ مؤلف یہ نغمہ سرزمینِ فتح پور میں تخلیقی ادب کا سنگ میل قرار دیا جانا چاہیے، اسی لیے زیرِ نظر تالیف میں اسے جگہ دی گئی ہے۔ جب بھی کوئی مہمان اسلامیہ اسکول عیدگاہ میں تشریف لاتا ہے تو اُس کے خیر مقدم میں یہ نغمہ گایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں فتح پور کی ادبی انجمنوں کا تعارف جن میں بزم شاہد، بزمِ احساسِ ادب اور انجمن ترقی اُردو کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی ذیل میں اب تک منعقد ہوئے مشاعروں اور ادبی نشستوں کی روداد بھی قابلِ ذکر ہے۔

'مہمان شعرا' کے عنوان کے تحت ان شعرائے کرام کا تذکرہ کیا گیا ہے جو مختلف تقریبات میں شرکت کی غرض سے فتح پور تشریف لاتے رہے شاید یہ پہلا تذکرہ ہوگا جس میں مہمان شعراء کی اس درجہ عزّت افزائی کی گئی ہے۔ فارسی اور اُردو کے اکثر تذکروں کا یہ ناقص پہلو رہا ہے کہ بیشتر تذکروں میں شعراء کے حالات چند لفظوں میں بیان کیے گیے ہیں اور کلام پر رائے زنی کرتے وقت اکثر تذکرہ نگاروں نے رٹے رٹائے اور نپے تُلے الفاظ استعمال کیے ہیں نیز انتخابِ کلام بھی دو ایک شعر تک محدود رہا۔ اور ستم یہ کہ بعض تذکروں میں صرف گناہ گارانِ تخلص اور متشاعروں کو بھی 'شاعر' ہونے کا اعزاز بخش دیا گیا۔ بحمد اللہ کہ نذیرؔ فتح پوری نے متشاعروں اور تخلص کے گناہگاروں کے ذکر سے تذکرے کو بوجھل نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ نذیرؔ فتح پوری ایماندار اور خدا پرست انسان

ہیں اُن کا ضمیر زندہ ہے، انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ کچھ لوگ اپنے ذاتی مفاد کے پیشِ نظر جاہل اور گنوار قسم کے لوگوں کو شعر لکھ لکھ کر دے رہے ہیں، وہ ایک طرف ادب میں تو غلاظت پھیلا ہی رہے ہیں دوسری طرف خود اپنی عاقبت بھی خراب کر رہے ہیں۔

نذیرؔ فتح پوری نے عام تذکروں کی روش سے انحراف کرتے ہوئے ادبی تواریخ کے نہج پر شعرائے فتح پور کے سوانح اور انتخابِ کلام پیش کیا ہے، انہوں نے بیک وقت مؤرخ، محقق اور ناقد ہونے کا حق بحسن وخوبی ادا کیا۔ اس ذیل میں فتح پور کے مرحومین اور موجودہ شعرا کے متعلق ان کی تحریریں قابلِ صد تحسین ہیں، جن مرحومین شعرا کا ذکر کیا گیا ہے ان میں آفتابِ شیخاواٹی حضرت نجم الدین نجمؔ، حاجی محمد نصیرالدین شاہ، نور احمد صاحب نور فتح پوری، مولانا محمد رمضان فاروقی، خواجہ غلام سرور فتح پوری، حافظ محمد عیسیٰؔ فتح پوری، خواجہ محمد حنیفؔ، محمد ابراہیم خیالؔ، غلام سَرور وفاؔ، ممدو آوارہؔ، منور علی منورؔ، محمد جیون حیاتؔ، قمرالدین خاں قمرؔ، ماسٹر اصغر علیؔ، حاجی محمد یاسینؔ اور موجودہ شعراء میں پیر محمد عارفؔ نجمی، عمر دین خاں صباؔ، عبدالکریم خاں کریمؔ، غلام جیلانی نجمیؔ، محمد اسماعیل عادلؔ، نثار احمد راہیؔ، نذیر فتح پوریؔ، منصور احمد نیرؔ، محمد الیاس قمرؔ، شبیر حسن فرازؔ، صلاح الدین عنبرؔ، شوکت علی گوہرؔ، لیاقت علی خاں وقارؔ، عبدالرب نشترؔ، پون کمار پروانہؔ، غلام دستگیر ضیاؔ، شمبھو پرساد پاریکھ، محمد حسین مدنی، محمد ناصرؔ، محمد رفیق رازؔ، یعقوب نازؔ، محمد اسماعیل غازیؔ، شوکت علی جذبیؔ، رفیق منظرؔ اور ادریس رازؔ چوروی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

اُردو کے نامور ناقدوں نے اکثر یہ شکوہ کیا ہے کہ ہمارے تذکرے اور ادبی تواریخ، واقعات کی کھتونی مرتب کرنے تک ہی محدود رہیں، ان میں رسمی بیانات پر توجہ صَرف کی جاتی رہی ہے افکار کی تاریخ پیش کرنا ان کا مقصد نہیں رہا لیکن نذیر فتح پور قابلِ مبارکباد ہیں کہ ان کا تذکرہ واقعات کی کھتونی ثابت نہ ہوا، افکار کی تاریخ مرتّب کرنا بھی ان کے پیشِ نظر رہا۔ ان کا زیرِ بحث تذکرہ ان تذکروں سے قدرے بہتر ہے جو ماضی قریب میں راجستھان کے مختلف علاقوں کے متعلق شایع ہوئے اِن آدھے ادھورے تذکروں کے نام نہاد مؤلفین نے چند ایسے لوگوں کا بھی تذکرہ کرڈالا جو اُردو سے ناواقف ہیں اور دیوناگری رسم الخط میں دوسروں کے اشعار پڑھتے ہیں، اِن تذکرہ نگاروں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاعری کے لیے اُردو یا اُردو رسم الخط سے واقفیت ضروری نہیں، دراصل یہ دونمبر کے لوگ ہماری تہذیب وتمدّن کے سخت دشمن ہیں، بہرحال نذیرؔ فتح پوری کی زیرِ بحث تالیف ''مثالی تذکرہ'' یا ''تاریخ'' کے زمرے میں آتی ہے۔

فتح پور میں چند ایسے تعلیمی ادارے بھی موجود ہیں جن میں تعلیم وتربیت حاصل کر کے طلباء نے اپنی زندگیوں کو سنوارا۔ کہا جاتا ہے کہ تعلیمی اور تربیتی اداروں کے ذکر کے بغیر کسی بھی خطّے کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ نذیر فتح پوری نے فتح پور کے چند تعلیمی اداروں کا ذکر کیا ہے جن میں پہلا ادارہ اسلامیہ اسکول عیدگاہ ہے جس کا قیام ۱۹۰۰ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس مدرسے میں پیر محمد حسین صاحب، قاضی نواب علی صاحب، طالب علی صاحب اور

پیر اصغر علی صاحب جیسے با کمال اساتذہ نے برسوں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے گو کہ اس ادارہ میں ادب یا ساہتیہ کی باضابطہ تعلیم نہیں دی جاتی رہی لیکن نصاب میں شامل شہ پاروں کو پڑھتے پڑھتے طلبا میں ادبی شعور پیدا ہوا، اور یہی وجہ ہے کہ نذیر فتح پوری جیسے عالمی شہرت یافتہ شاعر اور ادیب نے اس ادارے کا نام روشن کیا۔ اس ادارے نے بھی نذیر صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا چنانچہ ۲۰۰۰ء میں اُن کا اعزازی جشن منایا گیا۔ نذیر فتح پوری نے متعدد اشعار اور تحریری بیانات کے ذریعہ اس مدرسہ سے وابستگی پر فخر کیا ہے۔

فتح پور کا ایک اور اہم تعلیمی ادارہ آزاد سینئر سیکنڈری اسکول ہے، جو محلّہ بیوپاریان میں پچھلے ساٹھ برس سے رواں دواں ہے۔ یہ اسکول ابتداً دینی مدرسے کی صورت میں عمل میں آیا تھا لیکن ترقی کرتے کرتے سینئر سیکنڈری اسکول میں تبدیل ہو گیا۔ محلّہ بیوپاریان ہی میں ایک مدرسہ لڑکیوں کی تعلیم کی غرض سے قائم کیا گیا جو مدرسۃ البنات فاطمۃ الزہرہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مدرسے میں بقول مؤلف میٹرک تک تعلیم نسواں کا انتظام ہے۔ تعلیمی اداروں کے تذکرے کے بعد ریگستان کے جہاز یعنی اُونٹ کا ذکر مؤلف نے بڑے ہی اختصار سے کیا ہے اور اُونٹ کی جفاکشی اور وفاداری ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مشہور و معروف شخصیات سے قطع نظر غیر معروف اشخاص نے بھی تاریخ میں کارنامے انجام دئے ہیں، چنانچہ فتح پور میں بعض ایسے اشخاص بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اس خطّے کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے اپنی خدمات انجام دیں، ایسے حضرات میں بعض راہیِ ملک عدم ہو چکے ہیں اور کچھ بقیدِ حیات ہیں اور فتح پور میں روحِ رواں کا درجہ رکھتے ہیں۔ اکثر مؤرخین نے اس قسم کے غیر معروف اشخاص کے ذکر سے صرفِ نظر کی ہے لیکن نذیر فتح پوری بڑے ہی سعادت مند ہیں کہ انہوں نے ایسی شخصیات کا بہ نفسِ نفیس ذکر کیا جنہوں نے سماجی اور سیاسی طور پر فتح پور کی فلاح و بہبود کے لیے جی توڑ کوششیں کیں لہٰذا انہوں نے مرحوم عبدالغفار خاں پڑھیار، مرحوم اصغر علی غلام رسول خاں جوڑ، عبدالستار خاں پڑھیار، محمد فاروق قریشی، مرحوم حاجی وزیر صاحب دھوبی، حکیم عثمانی صاحب دھوبی، مرحوم عبدالغنی وکیل، مولوی عبدالسمیع، شہر قاضی رضا محمد، مرحوم حاجی حسین خاں جوڑ، مستان بابا، حاجی نور خاں بھوان، بہادر خاں لنگا، مرحوم یاسین خاں پڑھیار، مرحوم قاضی رحمت اللہ، مرحوم دین محمد جراح، مرحوم اصغر بھوان، محمد یونس بھوان، اصغر محمد خاں ٹھیکیدار، قاسم خاں موٹل، بابو پہلوان، محبوب خاں دیوڑا اور شوکت علی جوڑ کا تذکرہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ انہیں اپنی جائے پیدائش سے کتنی محبت ہے، صحیح معنوں میں، ایسا کر کے انہوں نے سرزمینِ فتح پور کا حق ادا کر دیا ہے۔

سخت ناانصافی ہوگی اگر نذیر فتح پوری کی محنت، لگن، تحقیق، تفتیش، تلاش، جستجو، اور تگ ودو کی داد نہ دی گئی، سنجے گوڈ بولے نے کتنا سچ لکھا ہے کہ:

"Tarikh wa Tazkira-e-Fatehpur Shekhawati" is associated with Five hundred

years Literary history of Fatehpur Shekhawati, Rajasthan. This is the first book in Urdu of its kind which is focussing poets of Fatehpur including Akbar's wife Taj Kawitri"

اس ذیل میں راقم الحروف بھی سنجے گوڈ بولے کا ہم خیال ہے۔

حوالہ جات:

(۱) "تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی" صفحہ ۹، نذیر فتح پوری، اسباق پبلی کیشنز، پونہ ۲۰۰۳ء

(۲) "تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی" صفحہ ۳۳

(۱) "تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی" صفحہ ۴۷

(۲) "تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی" صفحہ ۴۸

(۱) "تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی" صفحہ ۵۰، نذیر فتح پوری

(۲) "تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی" صفحہ ۵۶،۵۷، نذیر فتح پوری

(۱) "تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی" صفحہ ۵۸، نذیر فتح پوری

(۲) "تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی" صفحہ ۶۰، نذیر فتح پوری

(۱) "تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی" صفحہ ۶۱، نذیر فتح پوری

"تاج بی بی فتح پور کے پانچویں نواب دیوان فدن خان کی بیٹی تھی۔۔۔فدن خان نے اپنی بیٹی تاج بی بی کو اکبر (بادشاہ) سے بیاہ دیا۔۔۔تاج بی بی کو شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی، وہ خود بھی شعر کہتی تھی۔۔۔ڈاکٹر اودے شنکر شری واستو نے اپنی ہندی کتاب "مدھیہ یوگین ہندی کے صوفی مسلمان کوی" میں تاج کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے اور بابا فرید سے منسوب اس دوہے کو تاج کی تخلیق بتایا ہے۔

کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس   دو نیناں مت کھائیو، پیا دیکھن کی آس   صفحہ ۱۴۵

مَرنے سے پہلے تاج نے یہ دوہے کہے تھے۔

پریتم بسے پہاڑ پر، ہم جمنا کے تیر   اب کو ملنو کٹھن ہے، پائن پڑی زنجیر

نگر آگرہ میں رہے، گری پر بسے موناتھ   توروں زنجیر جو بھ سوں، میں پریتم کے ساتھ"

(**تاریخ و تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی** تصنیف وتالیف **نذیر فتح پوری**
صفحہ نمبر ۵۸،۵۹)

آپ کے خطوط اور ای میلز

☆☆ جدیدادب کا پہلا شمارہ مجھے مل گیا تھا۔اس بار آپ نے اسے بالکل نئے انداز میں مرتب کیا ہے اور بہت عمدہ تخلیقات شامل کی ہیں۔مبارکباد! **ڈاکٹر وزیر آغا**۔لاہور

☆☆ آج ۹ ستمبر کو رات ۹ بجے ارشد خالد صاحب نے آپ کا 'جدید ادب' مجھے دیا۔اس کے چھپنے کی خبر تو کئی ہفتے پہلے مل گئی تھی سو کئی ہفتے بعد پرچہ بھی مل گیا۔بہت خوب صورت اور خوب سیرت پرچہ ہے 'جدید ادب' کا یہ تیسرا دور ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ چوتھا دور نہیں آئے گا۔تیسرا دور اب جاری وساری رہے گا۔اس پرچے کا یہ اختصاص ہے کہ یہ بیک وقت پرنٹ میڈیا پر بھی ہے اور انٹرنیٹ پر بھی۔'ہر اک طرف سے' پر آپ کا تبصرہ بہت قابل قدر ہے اور شکریئے کا مستحق بھی مگر شاید ہم لوگ اب شکریئے کی رسومات سے آگے نکل آئے ہیں۔پرچہ امید ہے پوری اردو دنیا میں پڑھا جائے گا۔**اکبر حمیدی**۔اسلام آباد

☆☆(**بنام عمر کیرانوی**)''جدیدادب'' کا مرسلہ تازہ شمارہ بحفاظت پہنچا، خوب ہے، صوری اعتبار سے بھی اور مضامینِ نظم ونثر کی شمولیت کے لحاظ سے بھی۔حیدر قریشی صاحب علمی وادبی حیثیت سے عالمی شہرت ومقبولیت کے مالک ہیں، انہیں رشحاتِ قلم کی فراہمی کے لئے کوئی بھی زحمت اٹھانی نہیں پڑتی، چاروں اُور سے ان کے نام پہنچی ہوئیں فکری کاوشوں کا انبار سا لگ جاتا ہے، میں بھی توازن کے تازہ شمارہ کے ساتھ اپنا کلام بھیجنے ہی والا ہوں۔اطلاعاً عرض ہے۔خدا کرے آپ ہر طرح اچھے ہوں، آمین۔

عتیق احمد عتیقؔ (ایڈیٹر''توازن'' مالے گاؤں)

☆☆ 'جدیدادب' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔اس کرم گستری کے لئے ممنون ہوں۔ماریشس میں آپ سے مل کر جی خوش ہوا۔دیارِ غیر میں بیٹھ کر اردو زبان وادب کی خدمت کوہ کنی کے مترادف ہے اور یہ صبر آزما کام آپ نہایت جوش واستقلال اور سلیقہ مندی سے کیے جا رہے ہیں۔تازہ شمارے کے اکثر مشمولات معیاری اور آپ کے حسن انتخاب کے غماز ہیں۔محترم جوگندر پال کے دونوں افسانے حسب توقع اچھے ہیں۔مجھے یقین ہے کہ آپ کا یہ

چراغ ناموافق حالات کے باوجود یوں ہی تا دیر فروزاں رہے گا اور اردو زبان وادب کی خدمت کرتا رہے گا۔

پروفیسر الطاف احمد اعظمی

(ہیڈ) سینٹر فار ہسٹری آف میڈیسن اینڈ سائنس، ہمدرد یونیورسٹی ہمدرد نگر، نئی دہلی۔)

☆☆ بھائی خورشید اقبال کے توسط سے آپ کا رسالہ نظر نواز ہوا۔شکریہ۔اتنی ڈھیر ساری چیزیں مناسب ترتیب و تزئین کے ساتھ پڑھنے کو ملیں لطف آ گیا۔بہت عمدہ اور معیاری رسالہ ہے مبارک ہو۔تفصیلی خط اطمینان سے لکھوں گا انشاء اللہ۔ادھر 'آبشار' میں آپ کی تحریر ماریشس میں اردو کانفرنس پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔شستہ اور رواں دواں نثر اچھی لگی۔ایک شعر یاد آ گیا آپ بھی سنئے۔

وہ خوش کلام ہے ایسا کہ اس کے پاس ہمیں طویل رہنا بھی لگتا ہے مختصر رہنا

مشتاق انجم (ہوڑہ۔مغربی بنگال)

☆☆ جدیدادب کے دورِ نَو کا پہلا شمارہ ملا۔بہت بہت شکریہ۔اللہ مبارک کرے۔رسالہ آپ نے بہت سلیقے اور محنت سے مرتب فرمایا ہے۔خدا کرے آپ اسے اسی ڈھنگ سے جاری رکھ سکیں۔

جمہوریت اور آزاد خیالی کی وکالت کرنے والے رسائل بھی ذاتی امور میں بعض اَن کہے یا غیر ارادی تعصّبات کے شکار ہو جاتے ہیں۔(بعض کانفرنسیں تو ہوتی ہی اس لئے ہیں کہ فلاں گروپ کے لوگوں کا بائیکاٹ کرنا ہے۔اسی طرح اکثر رسائل بھی ایک خاص پروگرام کے تحت نکالے جاتے ہیں اور مقصد ان کا بھی کسی مخصوص گروہ کے ادیبوں کو زک پہنچانا ہوتا ہے) آپ چونکہ صرف خدمت ادب کے طور پر اس میدان میں آئے ہیں اس لئے کسی بائیکاٹ یا ادبی مقاطع سے پرہیز فرمائیے۔کسی اختلافی تحریر کو اس وقت تک شائع نہ فرمائیے جب تک مخالف نقطۂ نظر کی معقول وضاحت نہ حاصل ہو جائے۔اس طرح آپ گروہ بندی کے الزام سے بچے رہیں گے۔

قیصر تمکین۔برمنگھم۔انگلینڈ

☆☆ آپ کا رسالہ جدیدادب شاہد ماہلی نے عنایت کیا۔خوبصورت گٹ اپ اور عمدہ طباعت سے سجا بنا رسالہ زاد راہ کے طور پر کام آیا۔آپ کی ''گفتگو'' سے اس کی درازئ عمر کا اندازہ تو ہوا ہی، نیز ادبی مباحث، تھیوریٹکل بحثوں کے تعلق سے آپ کا نقطۂ نظر بھی سامنے آیا۔اردو میں اکثر شعراء خالص شاعر قسم کی چیز ہوتے ہیں۔آپ کی تحریروں سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نرے شاعر یا فنکار نہیں ہیں بلکہ علم ودانش سے بھی گہرا رشتہ ہے۔یہ تو آپ کے چھوٹے سے اداریہ سے ہی ظاہر ہے۔**ڈاکٹر علی احمد فاطمی** مدیر ''نیا سفر'' الہ آباد

☆☆ جدید ادب کے دورِ ثالث کا پہلا شمارہ مل گیا ہے۔اس کی طباعت کا معیار بھی عمدہ ہے اور مشمولات بھی معیاری ہیں۔آپ نے اسے بیک وقت کتابی صورت میں شائع کر کے اور انٹرنیٹ پر جاری کر کے اچھا اقدام کیا ہے۔اس سے جدید ادب کے قارئین کا حلقہ وسیع ہوگا۔یہ اور بات ہے کہ ادبی پرچے یا کتاب کو پڑھنے کا لطف چھپی ہوئی صورت میں ہی ملتا ہے۔انٹرنیٹ سے بہت جلد اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔(شاید یہ میرے ساتھ ہی ہوتا ہو دوسروں کے ساتھ نہیں) جدید ادب کے سارے مندرجات اہم ہیں۔**ناصر عباس نیر** جھنگ

☆☆(**بنام نذر خلیق**) آپ کی طرف سے جدید ادب جرمنی موصول ہوا۔اس سلسلے میں میں کچھ کہنا چاہوں گا۔۔۔۔۔۔۔ فکر انگیز مضامین ومقالات،نایاب ونادر شعری تخلیقات،نظمیں،گیت اور غزلیں،نئے افسانے،خصوصی گوشے،ماہیے،کتاب میلہ اور تفصیلی مطالعے کی شمولیت نے ۶ ۷ ۱ صفحات کے جدید ادب کو کچھ اتنا وقیع بنایا ہے کہ حاصل مطالعہ کے طور پر کچھ لکھنا چاہوں تو بھی کئی صفحات درکار ہوں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور میں اختصار ہی بہتر ہے۔جدید ادب کا یہ شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء تک ہے اور اس کا اداریہ جو گفتگو کے عنوان سے لکھا گیا ہے حیدر قریشی کی ادب دوستی اور زبان وادب کے حوالے سے کچھ نظری وفکری مباحث کا احاطہ کرتا ہے۔ادب دوستی کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ ''ادب میری زندگی کی سب سے بامعنی سرگرمی ہے'' ظاہر ہے کہ جب وابستگی ایسی ہو تو نظریہ داری سے کہیں زیادہ نظر داری درکار ہوتی ہے۔سو حیدر قریشی کثیر المطالعہ اور کثیر الجہات ادبی شخصیت ہیں۔

جدید ادب کا اداریہ ہی پڑھ کر قاری کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا مدیر ساختیات،نو ساختیات،جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے مغربی شوشوں کی تہہ داریوں سے کتنا باخبر ہے۔یہ باخبری سطحی نہیں بلکہ ان کی شعوری پختگی اور معاملہ فہمی کا حصہ ہے۔انہوں نے کتنی معقول بات کی ہے کہ ''تھیوری کی دنیا میں رہنے کے ساتھ ساتھ اس کے عملی مظاہر کے تناظر میں بھی اس کا جائزہ لیا جائے۔'' کچھ فرصت نصیب ہوئی تو ایک جائزہ جدید ادب کی نذر کروں گا۔اس جریدے کو بہر طور جاری رہنا چاہیے۔

پروفیسر آفاق صدیقی
صدر نشین اردو سندھی ادبی فاؤنڈیشن کراچی

☆☆ بشرطِ زندگی کی بات ہم اپنی تمام زندگی سے سنتے چلے آرہے ہیں لیکن اسکا صحیح عملی مظاہرہ گزشتہ دنوں اس وقت ہوا جب میں اپنے دفتر میں اخبار اردو کا ایک سرسری سا مطالعہ کر رہا تھا کہ ماریشس میں ہونے والی اردو

کانفرنس کے بارے میں مضامین پڑھتے ہوئے ایک نام حیدر قریشی کا بھی نظر آیا ادھر نام نذرِ بصارت ہوا اور ادھر ۷۷،۷۸ کے حیدر قریشی کا چہرہ نظروں میں گھوم گیا جب آپ نے جدید ادب کا بالکل پہلا شمارہ نکالا تھا جس میں میرے علاوہ میرے دوست فہیم جوزی،شائستہ حبیب اور نسرین انجم بھٹی کی تخلیقات کے علاوہ میری غزلوں کے مجموعے 'کفن پہ تحریریں' پہ خود آپکا (حیدر قریشی) کا تبصرہ بھی شامل تھا.عجب بات یہ ہے یہ پہلا شمارہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے.میں نے اسی اخبار اردو میں جدید ادب کا اشتہار بھی دیکھا اور اس میں درج ای میل پر ایک خط یہ سوچ کر روانہ کیا کہ شاید حیدر قریشی کو یہ تہی دست اور گمنام سا شخص یاد بھی ہوگا یا نہیں لیکن اگلے ہی روز ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ آپکا بہت ہی پیارا خط موصول ہوا گویا میں نے اپنے تئیں حیدر کے ساتھ ساتھ جدید ادب کو بھی ایک بار پھر دریافت کر لیا.آپ نے جس محبت کا ثبوت دیا میں اس کے لیئے ذاتی طور ممنون ہوں.جدید ادب کو نیٹ پر دیکھا اور پھر از راہ کرم آپ نے اسکی تازہ دو کاپیاں بھی مجھے لندن ارسال کر دیں جنہیں دیکھ کر اور پڑھ کر جی خوش ہوا.حیدر قریشی ادب کا واسکوڈے گاما ہے مگر اس مرتبہ میں بھی کولمبس ثابت ہوا.میں اور میری اہلیہ ایک عرصے سے ادب میں گروہ بندیوں اور مافیا ذہنیت کے باعث ادبی جریدوں میں لکھنے کا سلسلہ منقطع کر چکے ہوئے تھے لیکن اب ایک مرتبہ پھر آپ کی تحریک پہ اس سلسلے کو جاری کر رہے ہیں میں جانتا ہوں کہ آپ دُھن کے کیسے پکے آدمی ہیں جس لگن اور محنت کے ساتھ جدید ادب کی ابتدا کی تھی وقتی تعطل کے باوجود وہ اسے جاری رکھنا قابل صد مبارکباد ہے.میں نے انٹرنیٹ پہ بے شمار اردو کے جریدے دیکھے ہیں تاہم اگر میں غلط نہیں تو شاید جدید ادب واحد ادبی جریدہ ہے جو نیٹ اور کتابی صورت میں ہو بہو ایک جیسا ہے.میں اس مختصر سے اظہار قلبی کو طوالت نہیں دینا چاہتا ہاں اتنا ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ سائینس کی اس ترقی نے دو عشروں سے زائد عرصے سے بچھڑا ہوا بے غرض دوست تو ملوا ہی دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بچھڑا ہوا 'جدید ادب' بھی مل گیا جو آج بھی جدید ہی ہے اور اس میں ادب ہی شامل ہے.میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے عزمِ صمیم کو استقامتِ کامل کی صورت میں برقرار رکھے (آمین)

صفدر ہمدانی۔لندن

☆☆ جدید ادب میں آپ نے شعری تخلیقات تو تھوک کے بھاؤ سے دی ہیں اور ماشاءاللہ سب اچھی ہیں۔ڈاکٹر فراز حامدی کے گیت بہت اچھے ہیں سوائے پہلے گیت کے۔یہ تو سرکاری گیت ہے۔سنجئے گوڑ بولے اور کرشن مہیشوری کا مشترکہ مضمون اردو کا مستقبل خوب ہے۔پروفیسر شفیق احمد کا مضمون ادبی تحقیق کے مسائل بھی اچھا مضمون ہے۔آپ کا ''ابتدائی ادبی زمانہ'' دلچسپ ہے۔ **رؤف خیر** (حیدر آباد۔دکن)

☆☆ کھٹی میٹھی یادیں پڑھیں۔اللہ نے آپ کے قلم میں بڑی روانی رکھی ہے۔ایسا بے ساختہ پن کم ہی پڑھنے

میں آیا ہے۔جدید ادب کا افسانوی حصہ جاندار ہے۔مضامین کا حصہ اور توجہ چاہتا ہے۔

سلطان جمیل نسیم۔(ٹورونٹو،کینیڈا)

☆☆ رسالہ بہت معیاری ہے۔پرانے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔آپ کی محنت اور قابلیت کا معترف ہوں۔

ڈاکٹر سعادت سعید(ترکی)

☆☆ ’’جدید ادب‘‘ دورِ سوم کے شمارہ اول کی اشاعت پر جناب حیدر قریشی اور مجلس ادارت کے تمام معزز ارکان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔’گفتگو‘ میں قریشی صاحب نے بے حد اہم مسئلہ کو موضوع بنایا ہے۔باضمیر فنکاروں کو اس پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔کرشن مہیشوری،سنجے گوڈ بولے،ناصر عباس نیر کے مضامین بھی عمدہ ہیں لیکن ڈاکٹر شفیق احمد کا ادبی تحقیق کے مسائل حاصل مطالعہ ہے۔جوگندر پال کا مضمون بھی گہری افسانوی فضا کے ساتھ دکھی انسانیت کا نوحہ سناتا ہے۔ان کا افسانہ ’سکونت‘ بھی اس کا تسلسل ہے۔منشا یاد کا افسانہ ’نظر آ لباسِ مجاز میں‘ بے حد خوبصورت اور متاثر کن افسانہ ہے۔رشید امجد اور رحیم انجان کے افسانے بھی پسند آئے۔منظومات میں صلاح الدین پرویز،شاہد ماہلی،حیدر قریشی،مظہر امام،خورشید اقبال متاثر کرتے ہیں۔ماہیئے کچھ کچّے پکّے آموں کی طرح ہیں۔کتاب میلہ میں کتابوں کا مختصر تعارف کہیں کہیں نامکمل محسوس ہوا۔چراغ آفریدم کا تفصیلی مطالعہ خوبصورت ہے۔حیدر قریشی نے تبصروں میں اصابت رائے کا اظہار کیا ہے۔

حامد اکمل (حیدرآباد۔دکن)

☆☆ ’’جدید ادب‘‘ کا تازہ شمارہ انٹرنیٹ پر پڑھا۔حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ اسقدر معیاری پرچہ اس سے پہلے کیوں نظر نواز نہ ہوا۔پرچے میں مواد کا انتخاب اور معیار ’’جدید ادب‘‘ کی مجلس ادارت کی مساعی جمیلہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔میری دعا ہے کہ آپکا یہ سلسلہ مزید ترقیوں سے ہمکنار رہو۔**مرتضیٰ اشعر** (ملتان)

☆☆ جدید ادب کا یہ شمارہ ایک دلکش ادبی جریدہ ہے۔اس میں شامل تمام تخلیقات دلچسپ اور معیاری ہیں،جس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔امید ہے آپ کی یہ کوشش اب عرصہ دراز تک جاری رہے گی۔

گلشن کھنہ (لندن)

☆☆ جدید ادب کا تازہ شمارہ دیکھا خوبصورت اور خوب سیرت ہے۔سبھی مشمولات قابلِ توجہ ہیں۔آزاد

شاماتوف صاحب کا خط آیا تھا۔ماریشس کی رپورٹ میں شاید ان کا نام غلط ہوگیا ہے۔تصحیح کر لیجئے گا۔’’منصف‘‘ حیدرآباد میں آپ کی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔

ابنِ کنول (دہلی یونیورسٹی)

جوابی نوٹ: جناب آزاد شاماتوف کا نام واقعی مجھ سے غلط طور پر صمد درج ہو گیا تھا۔اس کے لئے ان سے معذرت خواہ ہوں۔میرا خیال ہے کہ اس رپورتاژ میں مزید کچھ اضافے کروں اور اسے دوبارہ اردوستان ڈاٹ کام پر اپ لوڈ کرادوں۔اس سلسلہ میں کاشف الہدیٰ صاحب سے بات طے ہوچکی ہے۔جیسے ہی موقعہ بنا کم از کم ویب سائٹ پر تو تصحیح ہو جائے گی اور یہ رپورتاژ میری کسی کتاب میں جب بھی شامل ہوا،آزاد شاماتوف صاحب کے اصل نام کے ساتھ ہی شائع ہوگا۔(**حیدر قریشی**)

صلاح الدین پرویز (دہلی)

1 Aug 2003 12:10:22 -0000 isteara001@rediffmail.com

My dearest Haider Qureishi.

You are really a great man. You have done a very respectable job as an Editor of ‘‘Jadeed Adab”. It is really a joy and beauty forever. What can I say more, as I love you, respect you and above all you are my brother. Good Luck and congratulation from me and Isteara group.

Love & Regards. Your’s

Salahuddin Pervez

پروفیسر شریف حسین قاسمی (دہلی)

03.09.2003 06:00:13 syedasimhusain@hotmail.com

Dear Mr. Haider Qureshi

I have seen your journal Jadid Adab. It is a good venture and I hope you would be able to continue it in the same grand and proper pattern. I congratulate you for your litenary efforts.

Prop. Sharif Husain Qasemi

Department of Persian Delhi University

ناصر عباس نیر (جھنگ)

06.09.2003 16:48:20 nanayyar@yahoo.com

dear haider qureshi ! a o a,

thank u very much for sending me new issue of jadeed adab.present issue is good one.thanks also for publishing my article and on chiragh aafreedam.i hope u will contiue it.u have raised important issues in editorial which r debatable. regards. nasir abbas nayyar

---

ڈاکٹر فہیم اعظمی (کراچی)

15.09.2003 13:14:22 cnkair@yahoo.com

Dear Mr.Haider Qureshi

This is the first E-MAIL i have received from you. I do not know about the previos one referred to by you. I have received JADID ADAB NO1 and have read most of it . Well done Masha Allah.Due to my constant engagement in producing SAREER , writing other Articles and getting my book published, I will not be able to offer any thing exept good wishes , later per haps.Hope you are in good health . Best Wishes FAHIM AZMI

ڈاکٹر کرسٹینا (ہائیڈل برگ)

30.09.2003 09:00:05 n40@ix.urz.uni-heidelberg.de

Dear Qureshi Ji,

Thank you for the latest issue of "Jadeed Adab" - and apologies for the belated acknowledgment! I had been out of station for the last two weeks and am now busy winding up some urgent matters before teaching starts day after tomorrow. So far I have had only a cursory look at the journal, but the contents look variegated and interesting. You might remember that a couple of years ago you had expressed the wish to publish Urdu translations of German poetry in your journal. Somehow this, however, never materialised. So far I have always shied away from doing translations into Urdu, but now I think I may

attempt short literal translations which might then be revised by an Urdu speaker. This is something I could do from time to time in between other work . Are you still interested in publishing anything of this kind? Hoping that you are fine, and with best regards,

Christina

ڈاکٹر تبسم کاشمیری (جاپان)

04.10.2003 21:14:38 tabassumkashmiri@hotmail.com

Dear Haider, On October 1, I came back from Pakistan after enjoying my vacations. While I was checking my mail I found a copy of JADEED ADAB, it was my pleasure to see the magazine and your message, a lot of time has passed I have listened something from you after two decades. I hope you will keep on publishing this magazine. During the last years I have been reading your contributions in KITAB NUMA, DELHI, it looks you are still active in literary field. Although in these days I am very busy in my research project but I will find out some poems in my records and will mail you with in this month. God bless you in your creativity. I hope we will the contact in the future. Tabassum

---

منشا یاد (اسلام آباد)

11.10.2003 08:32:17 afsana@isb.comsats.net.pk

Sending you a new short story(swanhi kahani)for jadeed adab. I will also send you an article soon. An anthology containing my 50 selected short stories(366 pages) and titled "Shehare Fasana" has been published by Dost Publishers Islamabad. I have received Jadeed Adab also. Thank you. Mansha Yad.

سرور ادبی اکادمی جرمنی کے زیر اہتمام جدید ادب کی یہ کتاب (جنوری تا جون ۲۰۰۴ء) پریس سے شائع کرائی گئی۔

جدید ادب

حیدر قریشی کی کتب

☆**سلگتے خواب**(غزلیں) ☆**عمرِ گریزاں**(غزلیں،نظمیں اور ماہیے)☆**محبت کے پھول**(ماہیے)☆**دعائے دل**(غزلیں،نظمیں) ☆**درد سمندر**(غزلیں،نظمیں اور ماہیے)

☆☆**غزلیں،نظمیں،ماہیے** (ایڈیشن اول۔۔پہلے چار شعری مجموعوں کا مجموعہ)

☆☆**غزلیں،نظمیں،ماہیے** (ایڈیشن دوم۔۔پانچوں شعری مجموعوں کا مجموعہ۔۔زیر اشاعت)

☆**روشنی کی بشارت**(افسانے) ☆**قصے کہانیاں**(افسانے)

☆**ایٹمی جنگ**(تین افسانے اردو،ہندی میں ایک ساتھ)☆**افسانے** (دو مجموعے ایک جلد میں)

☆**میں انتظار کرتا ہوں**(افسانوں کا ہندی ترجمہ)☆**میری محبتیں**(خاکے)

☆**کھٹی میٹھی یادیں**(یادیں)☆**فاصلے، قربتیں**(انشائیے)

☆☆**افسانے،خاکے،یادیں،انشائیے** (پانچ نثری مجموعے ایک جلد میں۔۔زیر اشاعت)

☆**سوئے حجاز** (سفرنامہ عمرہ) دوسرا ایڈیشن سفرِ حج کی روداد کے اضافہ کے ساتھ جلد شائع ہو رہا ہے۔

تحقیق و تنقید:

☆**اردو میں ماھیا نگاری** ☆ **اردو ماھیے کی تحریک**(مضامین)

☆**اردو ماھیے کے بانی....... ھمت رائے شرما**

☆**اردو ماھیا**(ماہیے کے مجموعوں کے پیش لفظ)☆**ماھیے کے مباحث**(مضامین)

☆☆**اردو ماہیا تحقیق و تنقید**(پانچوں کتابیں ایک جلد میں۔۔۔زیرِ اشاعت)

☆**وزیر آغا ...عھد ساز شخصیت** (مضامین)

تحقیق اور تنقید کی کتب کو چھوڑ کر باقی تمام کتب کا میٹر اس ویب سائٹ پر آن لائن ہے۔

www.haiderqureshi.com

تحقیق و تنقید کی کتب اور دیگر میٹر بھی جلد ھی اپ لوڈ کیا جا رھا ھے